المرتضیٰ
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
مجلس نشریاتِ اسلام
۱-کے-۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۵، کراچی

المرتضیٰ (کرّم اللہ وجہہ)

(تیسرا ایڈیشن اہم ترمیمات و تصحیحات و اضافات کے بعد)

یعنی امیر المومنین سیدنا علی ابنِ ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی مفصل سوانح حیات، خاندانی خصوصیات، وہبی کمالات، خلفاء کی ترتیبِ زمانی میں حکمتِ الٰہی و مصلحتِ اسلامی، اسلام کے مفاد میں خلفائے ثلاثہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کا بے نظیر اخلاص و تعاون، خلافتِ مرتضوی کا عہد اور اس کی عظیم مشکلات، بے نظیر زاہدانہ سیرت و مصلحانہ و مربیانہ کردار، فرزندانِ والا مرتبت (حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ) کی عطر بیز سیرت و اخلاق اور ان کے اپنے اپنے وقت میں صحیح فیصلے اور اقدامات، آلِ رسول (سادات کرام) کے اعلےٰ اخلاق و شمائل، امت کی اصلاح و تربیت کی دائمی فکر، اسلام کی تبلیغ و اشاعت، جہاد فی سبیل اللہ اور ممالک اسلامیہ کی حفاظت و دفاع میں ہر عہد میں ان کا قائدانہ و اولو العزمانہ کردار، مستند کتب تاریخ، ناقابلِ انکار واقعات و حقائق اور تجزیاتی و تقابلی مطالعے کی روشنی میں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

مجلس نشریات اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رح

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ——— المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ
تصنیف ——— مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح
طباعت ——— احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ——— ۴۸۰ صفحات
ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر۱ کراچی ۷۴۶۰۰

عربی ——— تیسرا ایڈیشن ——— دمشق
اردو ——— تیسرا ایڈیشن ——— کراچی، لکھنؤ
انگریزی ——— پہلا ایڈیشن ——— لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

(سورۃ الفتح ۲۹)

(محمد اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں (صحابۂ رسولؐ) وہ کافروں کے مقابلے میں تیز و سرگرم ہیں اور ان کا برتاؤ اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ شفقت و محبت اور ہمدردی کا رہتا ہے)

فہرست عناوین

المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

بابِ سوم

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں

٩٣ — ١٥٦

بابِ چہارم

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ خلافتِ فاروقی کے عہد میں ١٥٧ — ١٨٦

باب پنجم ۵

باب ششم ۶

باب نہم ۹

بابِ دہم

حضرات اہلِ بیت اور اولادِ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور اُن کی پاکیزہ سیرتیں

۳۸۳ - ۴۴۱

فرقۂ اثنا عشریہ (امامیہ) کا عقیدۂ امامت

(۴۱۵ - ۴۳۲)

خلفائے اربعہ (رضوان اللہ علیہم)

(۴۳۳ - ۴۴۱)

دیباچہ طبع سوم

الحمد للہ وحدہٗ والصّلاۃ والسّلام علی من لا نبیّ بعدہٗ

أمّا بعد! اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے محض اپنے لطف و عنایت سے اس کتاب "المرتضیٰ" کو مقبولیت عطا فرمائی اور بہت ہی مختصر مدّت میں اس کے عربی اور اُردو دونوں کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا، اور (اردو کے) طبع ثالث کے لئے مقدمہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، عربی، اردو دونوں کی اہلِ علم نے قدر کی، صاحبِ نظر مؤرخوں نے اعتراف کے ساتھ اس ناچیز خدمت کو سراہا جس کی مصنّف کو توقع نہ تھی، خاص طور پر اس لئے کہ موضوع انتہائی نازک اور اس کے بارے میں مختلف فرقوں کے جذبات میں ضرورت سے زیادہ حسّاسیت پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ اُس دور کی تاریخ ہے جو فتنوں کے سر اٹھانے کا زمانہ تھا، اِس وقت کی شخصیات اور اس عہد کے پُرفتن واقعات آپس کے اختلافات نے ہر فریق کو انتہائی مشتعل کرنے والی کیفیت سے بھر دیا ہے۔

اس کتاب کا اُردو ایڈیشن صرف تین ماہ کے اندر ختم ہو گیا دوسرا ایڈیشن نکلا وہ بھی اب ختم ہو رہا ہے، یہی حال عربی ایڈیشن کا ہوا، اردو میں تو اس کا ترجمہ ہے اصلاً کتاب عربی میں لکھی گئی تھی اب عربی کا بھی دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

اس عرصہ میں مصنّف نے اپنا تحقیقی کام جاری رکھا، تاریخ و سیر اور علم کلام کے

موضوع پر جو صدیوں کی کاوشوں سے علمی و تاریخی مواد جمع ہوا ہے، اس کے درمیان سے نئے عناصر کی تلاش جاری رکھی، جن کے ذریعہ تاریخ کی وہ کڑیاں دستیاب ہوئیں جو اس سلسلۃ الذہب کی تمام کڑیوں کو ایک دوسرے سے پیوست اور مربوط دکھاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ کڑیاں انصاف و توازن کے ساتھ صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے ضروری تھیں، اور ان پر تہ بہ تہ غبار پڑا ہوا تھا، واقعات کی کھتونی میں یہ اجزاء گم تھے، اور منتشر، پراگندہ، اور غیر متعلق موضوع کے ضمن میں کسی کونے میں دبے ہوئے تھے کہ اُن کی طرف نظر نہیں جاتی تھی، حالانکہ صحیح اور مُنصفانہ رائے اور اس دور کی قد آور شخصیات کی عظمتوں کا اندازہ کرنے کے لئے ان کا علم ضروری تھا، بغیر اس کے انصاف و عدل اور توازن و اعتدال کے ساتھ نہ رائے قائم کی جاسکتی ہے، اور نہ معاملہ کی تہ تک پہونچا جاسکتا ہے۔

مصنّف نے ان علمی ذخیروں سے فائدہ اُٹھا کر اس نئے ایڈیشن میں متعدد وسیع اضافے کئے ہیں، اُن اضافوں کا تعلق تاریخی، کلامی اور عقائدی مباحث سے ہے، جن کے مطالعہ سے سیرت سیّدنا علی رضی اللہ عنہ، کے چند تابناک پہلو اُجاگر ہوئے اور اس صدی کی تاریخ کے چند روشن پہلو سامنے آئے، جو اس وضاحت کے ساتھ شاید پہلے سامنے نہیں آئے تھے، ناسپاسی ہوگی اگر اس سلسلہ میں ان فاضل تبصرہ نگاروں اور ناقدین کی اس نشاندہی، مشوروں اور مُخلصانہ توجہ دہانی کا شکریہ نہ ادا کیا جائے، جن سے مصنّف کو بعض فروگزاشتوں اور خامیوں کی طرف توجہ ہوئی اور اس نے اصل مراجع و مآخذ کی طرف رجوع کر کے اُن کی اصلاح کی، یا بعض ایسے ضروری مواد و معلومات کا اضافہ کیا جن کی ایک مکمل سیرت و سوانح کو ضرورت ہوتی ہے۔

متعدد ذیلی ترمیمات اور مختصر اضافات کے علاوہ اس ایڈیشن میں جو معتد بہ اور

قدرے مفصل اضافے ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں :۔

۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت کے چند تابناک پہلو تاریخ و روایات کی روشنی میں۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جن امور کی ابتداء ہوتی ہے۔

۳۔ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے زمانۂ خلافت کے وہ پہلو جو تاریخ میں مناسب طریقہ سے اُجاگر نہیں کئے گئے۔

۴۔ حضرت معاویہؓ کے بارے میں بعض وضاحتیں، اور اُن کے سلسلہ میں کفِّ لسان اور تنقید و تبصرہ میں احتیاط کی ضرورت۔

۵۔ حالتِ اضطرار میں سیدنا علیؓ کا اُسوہ جس سے یہ اُمت کبھی گزر سکتی ہے۔

۶۔ اولاد و احفاد کا مزید تعارف اور خصوصیات اور ان کے بارے میں مُنصفانہ اور متوازن تاریخی تبصرہ۔

۷۔ صحابۂ کرام کے اختلافات کے سلسلہ میں ایک لمحۂ فکریہ۔

ان ناچیز کوششوں کے ساتھ ہم اپنے قارئین کی خدمت میں یہ تیسرا ایڈیشن پیش کر رہے ہیں، مصنّف کو اعتراف ہے کہ موضوع بہت ہی مہتم بالشّان نازک اور عظیم ہے، اور تحقیق و کاوش کا قلم اور سعی کوتاہ ہے، لوگوں کی ستائش اور خُردہ گیری دونوں سے قطع نظر کر کے محض اللہ تعالے سے اجر و قبولیت کے طلب اور امید میں یہ "بضاعت مزجاۃ" پیش کی جاتی ہے۔

وما توفیقی إلّا باللّٰہ علیہ توکّلت وإلیہ أُنیب

ابوالحسن علی حسنی ندوی

۲۹/۸/۱۴۱۰ھ

ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ طبع دوم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین
وخاتم النبیین، محمد وآلہ وصحبہ أجمعین، ومن
تبعھم باحسان الی یوم الدین

ناچیز مصنفِ کتاب "المرتضیٰ" کا قلم بارگاہِ الٰہی میں سربسجود و ترانۂ حمد و شکر سے زمزمہ سنج ہے کہ ڈھائی تین مہینے کی مختصر مدت میں کتاب کے طبع ثانی کی تیاری کی نوبت آرہی ہے، اور اس ضخیم کتاب کا (جو چار سو چونسٹھ ۴۶۴ صفحات پر مشتمل تھی) پہلا ایڈیشن اس قلیل مدت میں ختم ہوگیا، اور اہلِ علم و نظر کی (جن کا ذہن تعصبات سے پاک ہے، اور جو واقعات و حقائق اور ناقابلِ تردید دینی و تاریخی شواہد و واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے کے عادی ہیں) کی ایک بڑی تعداد نے اس پر اپنی پسندیدگی اور مسرت و تأثر کا اظہار کیا، کتاب میں جن پاک نفوس کا تذکرہ اور حالات ہیں، جس بلند مرکزی شخصیت کے محور کے گرد وہ گردش کرتی ہے، اور جن نیک مقاصد کی وہ وکالت، اور جن مفید نتائج کا وہ اثبات کرتی ہے، اس سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کتاب زبانِ حال سے کہتی ہے ؎

جمالِ ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

کتاب کا پہلا ایڈیشن حسنِ کتابت اور طباعت کے ساتھ طباعت کی غلطیوں اور

ماخذ و مراجع کے سلسلے میں بعض مسامحات سے خالی نہیں تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ۶ نومبر ۱۹۸۵ء کو لکھنؤ میں اس کی رسم اجراء کا اعلان ہوگیا تھا، اور کتاب ابھی کتابت کے مرحلہ سے گذر رہی تھی، رسم اجراء کی تاریخ سے چند دن پہلے مصنّف کو اس کی کاپیاں دیکھنے اور تصحیح کا اتنا محدود و مختصر وقفہ ملا کہ وہ کتابت شدہ حصہ کا مسودہ سے اور ترجمہ کا اصل عربی سے مقابلہ نہیں کرسکا، اور اس کو بہت قلیل وقت میں یہ کام ختم کرکے کتاب کو طباعت کے حوالہ کرنا پڑا، اہلِ قلم مصنّفین کو اس کا بھی تجربہ ہوگا کہ کسی مصنّف کا اپنی تصنیف شدہ کتاب کی کاپیوں پر نظر ڈالنا اور اس کی تصحیح کرنا کافی نہیں ہوتا، اس کے ذہن میں اپنی کتاب کا مضمون ہوتا ہے، اور وہ اسی کی رہنمائی اور روشنی میں کتاب پڑھتا چلا جاتا ہے، اور بہت سے اغلاط اور تسامحات اس کی گرفت میں نہیں آتے، کتاب کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ جو غلط نامہ لگایا گیا وہ بھی نہایت عجلت میں تیار ہوا تھا، اور ناکافی تھا، جب نئے ایڈیشن کی تیاری کا وقت آیا تو مصنّف نے اول سے آخر تک اطمینان اور غور کے ساتھ کتاب پڑھی، اور ترجمہ کا (جس کی سلاست اور خوبی کا انکار نہیں کیا جاسکتا) اصل عربی کتاب سے جو اس وقت تک چھپ کر بیروت سے آگئی تھی، اور بہت بڑی حد تک طباعتی غلطیوں سے پاک تھی، مقابلہ کیا، بعض جگہ اصل اور ترجمہ میں تھوڑی سی ترمیم اور برائے نام حذف و اضافہ اور ماخذ میں مزید نشاندہی اور تفصیل کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس کی تکمیل کی گئی، اس مرحلہ میں مصنّف کی مصروفیتوں اور مختلف گوشوں سے کتاب کی فرمائش اور طلب کی بناء پر اس کی مہلت نہیں تھی کہ کتاب میں کچھ جدید مواد و معلومات و شواہد کا اضافہ کیا جائے، جو ایک سنجیدہ اور بامقصد علمی سفر و تحقیق میں ایک حقیقت پسند اور جویائے حق مصنّف کے سامنے آتے رہتے ہیں، اگر خدا کو منظور ہے، اور زندگی اور مطالعہ

تصنیف کی مزید مہلت ملی تو انشاء اللہ عربی، اُردو کے اس کے بعد کے ایڈیشن میں ان کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالےٰ سے پھر ایک بار دعا ہے کہ اس کتاب سے قارئین کو حقیقی نفع پہونچے، اس کے مطالعہ سے صحبت و تربیتِ نبوی کی انقلاب انگیزی، آدم گری و مردم سازی اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی نسل کے خصائص و کمالات پر عقیدۂ و یقین میں مزید استحکام و اطمینان پیدا ہو، اور وہ مصنّف بے بضاعت کے لئے ذریعۂ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت بنے۔

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

ابوالحسن علی ندوی

مدن پورہ - بمبئی

۱۶ر جمادی الآخرۃ ۱۴۰۹ھ
۲۵ر جنوری ۱۹۸۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

الحمد للہ رب العٰلمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید
المرسلین وخاتم النبیین، محمد وآلہ وصحبہ أجمعین
ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین۔

یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ بہت سی تاریخ ساز، عہد آفریں اور نادرۂ روزگار شخصیات ایسی بھی ہیں، جن کی مکمل سیرت (جو اُن کی روشن ترین خصوصیات پر حاوی اور ان کے مرکزی اور اہم کمالات ومحاسن پر روشنی ڈالتی ہو) عرصۂ دراز تک مرتب نہیں ہوئی، اور یہ بات اُن کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں پر ایک اخلاقی ودینی وعلمی قرض کی نوعیت رکھتی ہے، جس کی ادائیگی بعض اوقات انھوں نے بھی نہیں کی جو ان کی تعظیم میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتے اور ان سے محبت ووابستگی کو سرمایۂ ایمان وآگہی سمجھتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ قرض ماہ وسال کی مختصر مدت میں ادا ہو جاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صدیاں بیت جاتی ہیں، نسلیں ختم ہو جاتی ہیں، اور اُن کے ادائے حقوق سے سبکدوشی کی نوبت نہیں آتی۔

یہ صورتِ حال کسی ایک فرد یا کسی ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، انسانیت کے کتنے ایسے رہنما، اصلاحی تحریکات کے علمبردار، ملکوں اور قوموں کے محسن ومعمار، اور علم وحکمت میں مجددانہ ومجتہدانہ شان رکھنے والے باکمال گذرے ہیں، جن کے کمالات وخصوصیات سے دنیا عرصہ تک بے خبر رہی

اور اُن کے نام تاریخ کے ملبہ کے نیچے صدیوں دبے رہے، چند مبالغہ آمیز داستانیں اُن کے بارہ میں علم و آگہی کا سرمایہ اور "سدرۃ المنتہیٰ" ہوتا ہے، اور اسی چوکھٹہ میں ان کی شخصیت کو محصور کر دیا جاتا ہے، بسا اوقات چند ضمنی طور پر پیش آنے والے حوادث اور کچھ سیاسی مصالح و اختلافات، حق و انصاف کے تقاضے پورا نہیں کرنے دیتے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مخصوص عقائد کے حاملین ان کی شخصیت پر اجارہ داری قائم کر لیتے اور اُن کے گرد اپنے جذبات و تصوّرات کا حصار قائم کر دیتے ہیں، ضرورت تھی کہ اُن کی سیرت اس طرح پیش کی جاتی جس سے اُن کے صحیح مقام سے دنیا آگاہ ہوتی، اُن کی سیرت نسلِ انسانی کے لئے یا کم از کم اس دین کے متّبعین کے لئے (جس کے وہ پیرو اور خادم تھے) ایک مثالی کردار کے طور پر سامنے آتی، اُن کو اللہ تعالےٰ کی ایک عظیم بخشش و نعمت سمجھا جاتا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تربیت کا ثمرہ، آپؐ کا ایک مستقل معجزہ، اسلام کی صداقت کی دلیل و حجّت تصوّر کیا جاتا، اور اس بات کا ناقابلِ انکار ثبوت کہ اسلام میں ایسے مردانِ کار اور نوادرِ روزگار پیدا کرنے کی لافانی صلاحیت ہے، اس کے برخلاف دیکھا یہ گیا ہے کہ ایک تنگ و سنگین حصار اُن کی زندگیوں کے گرد قائم کر دیا گیا، جو اس ماہ درخشاں کے لئے ایک ہالہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کو علم و تحقیق کا آخری درجہ دے دیا گیا، ان حدود سے نکل کر آزادانہ تحقیق اور حق و انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ایک مذموم بدعت و جدّت اور راسخ الاعتقادی کے خلاف بغاوت کے مرادف قرار دیا گیا۔

انہی مظلوم شخصیات میں جن کے حقوق نہ صرف یہ کہ ادا نہیں ہوئے، بلکہ اُن کے حق میں شدید بے انصافی روا رکھی گئی، حضرت سیّدنا علی بن ابی طالبؓ کی بلند و محبوب شخصیت بھی ہے، مخصوص حالات، خاص قسم کے عقائد اور چند نفسیاتی اسباب کی بنا پر اُن کی سیرت پر بہت گہرے اور دبیز پردے پڑ گئے ہیں، اربابِ بحث و تحقیق تو الگ رہے، خود وہ لوگ جو اُن کی

عظمت کے گُن گاتے ہیں، اور ان کے نام پر اپنے عقائد کی عمارت تعمیر کئے ہوئے ہیں، انھوں نے بھی اکثر اوقات اُن کی سیرت کا مطالعہ معروضی و تحقیقی انداز میں نہیں کیا، اور پورے ماحول اور اُن کے عہد کے تقاضوں اور دشواریوں کو سامنے رکھ کر امانت و غیر جانب داری کے ساتھ پیش نہیں کیا، وہ معاشرہ جس میں وہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اس کا تجزیہ نہیں کیا گیا ضرورت تھی کہ دیکھا جاتا کہ وہ کیا اصول تھے جن کے وہ سختی سے پابند رہے، وہ کیا اقدار تھے، جن کو وہ تازندگی حرزِ جان بنائے رہے، جو مشکلات سامنے آئیں ان کا کس اصول پسندی اور دینی و اخلاقی معیار بلند سے مقابلہ کیا اور ان سے عہدہ برآ ہوئے، انتظامی و سیاسی امور میں اُن کا بنیادی فکر کیا تھا جس میں کوئی لچک یا سمجھوتہ قبول کرنے کے لئے وہ تیار نہیں تھے، یہ وہ پہلو ہیں جن کو پیش نظر رکھے اور اُن کا تجزیہ کئے بغیر ان کی سیرت کا مطالعہ ناقص اور غلط فہمیوں اور کوتاہ اندیشیوں، بلکہ ناانصافی کا موجب ہوگا۔

اس بے انصافی اور حق تلفی کی اصل ذمہ داری فنِ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے اس مزاج و انداز پر ہے جس کو ہمارے مؤرخوں، سوانح نگاروں، اور منقبت خوانی کرنے والے مصنّفین نے اختیار کیا ہے، یہی نہیں بلکہ مختلف فرقوں اور گروہوں کی تاریخ قلم بند کرنے والے بھی اکثر و بیشتر اسی ڈگر پر چلا کرتے ہیں جو گذشتہ زمانہ میں کسی نے ڈال دی ہے، وسیع مطالعہ، غیر جانب دارانہ تحقیقی اسلوب سے وہ لوگ بھی بیگانہ رہتے ہیں، جو اپنے موضوع کے لئے صرف انھیں کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں جو عُرفی طور پر اس فن کے دائرہ میں آتی اور شمار ہوتی ہیں، پھر گذشتہ نقشہائے قدم پر آنکھ بند کر کے چلنے کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہتا ہے، حالانکہ بحث و نظر کا تقاضا یہ ہے کہ صرف ان گنی چنی کتابوں پر اکتفا نہ کیا جائے، جو اس نام اور عنوان سے لکھی گئی ہیں، بلکہ اُن کتابوں اور تاریخی دستاویزوں سے بھی فائدہ اٹھایا جائے، جو بظاہر اس موضوع پر

نہیں ہیں، مگر ان میں وہ قیمتی لعل و جواہر مل جاتے ہیں، جو براہ راست اس خاص موضوع پر لکھنے والوں کی کتابوں میں ملنے دشوار ہیں، بعد کے آنے والے مؤرخوں نے سہل انگاری یا عجلت پسندی کی بناء پر صرف چند مخصوص کتابوں کا سہارا لے کر اپنا کام مکمل کر لیا، حالانکہ خاص اس موضوع پر اور بھی مراجع و مآخذ تھے جن پر ان کو انتباہ نہیں ہوا۔

فن تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا اندازہ اس کا علمی تجربہ رکھنے والے مصنّف و محقق کو ہوگا کہ اس کی مثال ایک منہدم قصر کی ہے، جو کھنڈر کی شکل میں ہو، اس کے ملبہ کے نیچے وہ سب کچھ مل سکتا ہے، جس کی کسی طالبِ صادق اور جویائے حق کو ضرورت پڑ سکتی ہے، کہیں مٹّی کے برتن اور روزمرّہ کے استعمال کی چیزیں ہوں گی، کہیں پر ساز شکستہ اور کتابوں کے اوراق دریدہ ہوں گے، کسی جگہ پر زیورات و جواہرات بکھرے اور دبے ہوئے ملیں گے، کہیں وہ ستون نظر آئیں گے جن پر قصر کی پوری عمارت قائم تھی، کہیں محرابیں ہوں گی جو زبانِ حال سے ایوانِ شاہی کے دورِ رفتہ کی داستانِ شوکت و عظمت سنا رہی ہوں گی، وہ شخص جو خود اس ملبہ کے نیچے دبے ہوئے آثار کو تلاش نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے تلاش کردہ آثار پر اعتماد کرتا ہے اور اس زمانہ کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے، جب قصر آباد تھا، ہر شے اپنی جگہ پر تھی، قصر جمال و شکوہ کا آئینہ دار تھا، وہ تاریخ کا حق ادا نہیں کر سکتا، اور کھنڈر سے وہ جواہرات نہیں برآمد کر سکتا جن سے قصر کے نقش و نگار اور آرائش و جمال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر رہنما مؤرخ اپنا ایک مخصوص اندازِ بیان رکھتا ہے، اس کا اپنا ذوق و ذہن ہوتا ہے، اس کے اپنے عقائد اور سیاسی رجحانات ہوتے ہیں، جن کے حصار سے اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے، اس کے سامنے اگرچہ ایک وسیع کتب خانہ کے مختلف شعبے (ڈپارٹمنٹ) ہوتے ہیں، مگر وہ کسی ایک شعبہ کو اپنی نظر میں رکھ کر اپنی یادداشت یا مطالعہ کا حاصل جمع کر دیتا ہے،

آنے والے اس کے ذوق و ذہن کے ثمرہ کو اُسوہ یا نمونہ بنا کر تاریخ کے میدان میں خامہ فرسائی کرنے لگتے ہیں، اور اس گذرے ہوئے کارواں کے نقش قدم پر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں، لیکن جیسا کہ قُدماء نے کہا ہے "کم ترک الأول للآخر" گزرنے والوں نے آنے والوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ رکھا ہے" فنِ تاریخ کو آج بھی ایک آبلہ پا کی تلاش ہے جو اس خارزار میں داخل ہو کر گل چینی پھر گُل ریزی کرے، اور اس کے کان میں کوئی یہ کہہ کر ہمت بندھا رہا ہو ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سوانح حیات مُرتّب کرنے کا داعیہ کیسے پیدا ہوا، اس کے متعدد اسباب ہیں:۔

۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے کسی درمیانی سال کا ذکر ہے کہ برادرِ معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ نے (جو اس وقت سے میرے مُربّی و سرپرست تھے جبکہ میری عمر ۹ سال تھی، اور میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ[1] کا انتقال ہوا تھا) ایک روز بڑے درد کے ساتھ

---

[1] والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) ہندوستان کے ایک نامور مؤرخ، برصغیر کی تاریخ، ثقافت و علم و تمدن پر متعدد اہم کتابوں کے مصنف تھے، اس ملک کی مختلف التنوع اہم شخصیات اور علماء و صوفیاء کے حالات میں (جن کی تعداد ساڑھے چار ہزار (۴۵۰۰) سے زیادہ ہے) انھوں نے آٹھ جلدوں میں ایک مبسوط کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام "نزھۃ الخواطر و بھجۃ المسامع والنواظر" ہے (جس کے دو ایڈیشن دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں) اور وہ علمی حلقوں میں اس موضوع پر ایک مستند مفصل ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ "الھند فی العہد الاسلامی" (ہندوستان اسلامی عہد میں) اور "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" (ہندوستان میں اسلامی علوم) جو یہاں کے علماء و محققین کے علمی کارناموں و تصنیفات کی ڈائرکٹری ہے، دمشق کی شہرۂ آفاق و موقر سرکاری اکیڈمی (المجمع العلمی دمشق) کی طرف سے دو بار

(باقی ص ۲۲ پر)

گلوگیر آواز میں کہا: "علی! تم کو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت پر کتاب لکھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ یہ کام کر سکو" یہ اس وقت کی بات ہے، جب مشائخ و اولیاء اور اصحابِ دعوت و عزیمت کی سیرت و سوانح حیات پر متعدد کتابیں میرے قلم سے نکل چکیں اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں، جن میں سے بعض کے مجموعی صفحات ہزار سے زائد تھے، عمر کے لحاظ سے طبیعت میں جولانی اور عزم و ہمت میں نشاط و تابانی تھی، اور عربی کے ایک محاورہ کے مطابق "کمان چڑھی اور گھوڑے پر زین کسی تھی" مگر یہ موضوع میرے لئے خاص عظمت و جلال رکھتا تھا، کسی اور موضوع پر لکھنے میں وہ تردّد، احساسِ ذمہ داری اور کشمکش پیش نہیں آئی جو اس موضوع پر قلم اٹھانے میں محسوس ہوتی تھی، کیونکہ اس نازک علمی و تاریخی سفر میں ایسے نازک موڑ اور اس درجہ سخت اور ہمت شکن گھاٹیاں آتی ہیں، جن سے کامیابی سے گذرنا آسان نہیں، میرے لئے یہ ایک ایسا نازک اور آزمائشی موضوع تھا، جو "بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز" ہو، جب تک توفیقِ الٰہی کی خاص دستگیری نہ ہو اس مہم سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہ تھا، وسیع قلب، متوازن فکر اور وسیع و طویل و عمیق مطالعہ کی قوت و ہمت کا وافر حصہ بھی اس کے لئے درکار تھا، اس منجدھار میں کودنے کے لئے جس بلند ہمتی اور مشق شناوری کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ ساحل پر بیٹھ کر نہیں ہو سکتا، یہ وہ اسباب تھے، جن کی بنا پر بھائی صاحب کی زندگی میں اُن کی اِس عزیز خواہش کی تکمیل نہ کر سکا، یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے رخصت بھی ہو گئے[۱]۔

(باقی ص۲۱ کا) شائع ہو چکی ہے، تذکرہ شعرائے ہند کے موضوع پر "گلِ رعنا" (طبع دارالمصنفین اعظم گڑھ) اور تاریخ گجرات پر "یادِ ایام" کے بھی وہ مصنف ہیں، اور بھی متعدد دینی اور علمی کتابوں کے وہ مصنف تھے۔

۱۶ جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ (۳ فروری ۱۹۲۳ء) کو اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

[۱] مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب بی، ایس، سی، ایم، بی، بی، ایس اپنے عہد کی ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے، قدیم و جدید ثقافت کے جامع، ایک طرف وہ ایک پختہ استعداد، وسیع النظر، راسخ العقیدہ

(باقی ص۲۳ پر)

لیکن اس کے بعد مجھے اسلامیات کے کتابی ذخیروں میں ایک شدید کمی کا احساس پیدا ہوا، اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ کی مکمل سوانح حیات جو (بقدر امکان) اُن کے اہم و مرکزی خصائص و کمالات پر روشنی ڈالتی ہو، موجود نہیں ہے، ضرورت ایسی کتاب کی باقی ہے جس میں وسیع پیمانہ پر مختلف گوشوں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہو، اور لگے بندھے حدود سے نکل کر جدید تحقیقی اسلوب سے قلم اٹھایا گیا ہو، صرف اس ہی مواد و معلومات پر انحصار نہ رکھا گیا ہو، جو سوانح نگاروں نے اپنی کتابوں میں فراہم کر دیا ہے، مصنف کی ہمت بلند اور نگاہ وسیع ہو، ایک ایسی اولوالعزم نادرۂ روزگار "عبقری" شخصیت پر قلم اٹھانا آسان نہیں جس کی اصل شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہو اور جس کو ہر فریق نے اپنی خاص عینک سے اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے آئینہ میں دیکھا ہو، یہاں تک کہ پوری زندگی چند متضاد خیالات و تصورات کا مجموعہ بن گئی ہو، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نام تو ایک ہے مگر

(باقی صـ۲۲ کا) عالم دین تھے، دوسری طرف علوم جدیدہ کے ممتاز و مستند ماہر، جہاں تک اہلِ سنت وجماعت کے عقیدہ کا تعلق ہے، اس پر وہ بغیر کسی لچک کے سختی کے ساتھ قائم اور سلف کے عقیدہ و مسلک کے پورے طور پر پابند تھے، اس کے ساتھ اُن کا قلب اہلِ بیت کی محبت و عظمت اور سیدنا علی مرتضیٰؓ کی عقیدت سے لبریز تھا، ندوۃ العلماء کے تیس ۳۰ سال تک ناظم رہے، ان کے عہد میں ندوہ نے نمایاں ترقی کی، دعوت اسلامی کے سرگرم رکن اور عربی کے پُرجوش انشاء پرداز و صحافی محمد الحسنی (متوفی ۱۷ رجب ۱۳۹۹ھ - ۱۳ مئی ۱۹۷۹ء) "الاسلام الممتحن" اور "المنہج الاسلامی السلیم" کے مؤلف، اور ندوہ کے عربی مجلہ "البعث الاسلامی" کے بانی و ایڈیٹر ان کے فرزند رشید تھے، ڈاکٹر صاحب نے ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ مطابق ۷ مئی ۱۹۶۱ء کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

شخصیتیں متعدد بلکہ متضاد ہیں، اور اصل شخصیت اور اس کی "عبقریت" اب بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے[1]

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

راقم نے اس سخت آزمائش کے علمی سفر میں اس وقت قدم رکھا جب عمر کے انحطاط کا زمانہ ہے، صحت کمزور، مشاغل روزافزوں، اسفار کی کثرت مستزاد، بہرحال اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے اپنی سعادت سمجھ کر اور اس کے اجر کی امید میں اس مُہم کو سر کرنے کا ارادہ کیا، اور جب ارادہ کرلیا، تو دل و دماغ پر یہی فکر سوار ہوگئی، بلکہ اعصاب پر اس طرح مسلّط ہوئی کہ کچھ اور لکھنے یا کسی اور موضوع پر سوچنے کا یارا نہ رہا، راقم نے (اہم موضوعات پر لکھنے میں اپنے معمولِ قدیم کے مطابق) عربی زبان کو ترجیح دی اور یہ کتاب اولاً و اصلاً عربی میں مکمل ہوئی[2]، راقم نے سب سے پہلے تاریخی مراجع کی چھان بین شروع کی، کارآمد اقتباسات جمع کئے، اور جب اس مہم سے فارغ ہوا تو ۱۱ رجب ۱۴۰۸ھ (یکم مارچ ۱۹۸۸ء) کو اپنے عزیز رفیق کار مولوی قاضی

---

[1] انصاف کا تقاضہ ہے کہ یہ اعتراف کیا جائے کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ پر سب سے بہتر کتاب مصری ادیب و فاضل الاستاذ عبّاس محمود العقّاد کی ہے جس کا نام "عبقریة الامام" ہے، (اور جو ان کے مجموعۂ مضامین و رسائل "العبقریات الاسلامیة" میں بھی شامل ہے، لیکن وہ ایک تقابلی مطالعہ اور نفسیاتی تجزیہ ہے، سیدنا حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کی مفصّل سیرت نہیں ہے، مصنّف نے اِس کتاب میں اس سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے، اور جہاں ان کی کتاب کا کوئی اقتباس پیش کیا ہے، اس کا حوالہ بقید صفحہ و کتاب دے دیا ہے۔ [2] اصل عربی کتاب "المرتضیٰ" کے نام سے دار القلم دمشق نے بڑے اہتمام سے اعلیٰ پیمانہ پر شائع کی ہے۔

محمد معین اللہ صاحب ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) کے، وطن اندور میں اس کتاب کا املاء شروع کیا، مولوی معین اللہ صاحب نے وہ تمام سہولتیں فراہم کر دیں جن کی ایک مصنّف کو یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے، اس زمانہ میں قیام وہاں کے ایک متموّل مخلص دوست ملک شاہ نواز اور عزیزی مولوی ابو البرکات ندوی کے یہاں رہا، اس ابتدا کے بعد لکھنؤ اور اپنے وطن رائے بریلی واپسی ہوئی اور املاء و کتابت کا سلسلہ جاری رہا (جس میں رمضان المبارک کا مہینہ اور چند معمولی وقفے اور ناگزیر سفر بھی پیش آئے) بالآخر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے لطف و کرم سے یہ کام بمبئی میں اپنے قدیم میزبان اور مخلص دوست حاجی غلام محمد (مالک بامبے آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی) کے دولت کدہ پر ۱۴ شوال ۱۴۰۵ھ (۳۱ مئی ۱۹۸۵ء) کو مکمل ہوا۔

مصنّف نے جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت کو اس انداز میں مرتّب کر لیا کہ اُن کے عصر کی بھی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے اور ان تعلقات پر بھی روشنی پڑے جو ان کے حضراتِ خلفائے ثلاثہ رضؓ سے تھے، اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیّدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کس درجہ ان حضرات کے ساتھ اخلاص و تعاون کا ثبوت دیا، پھر اُن کے عہد خلافت پر بھی مورّخانہ روشنی پڑے اور وہ جن نازک مسائل و مشکلات سے معمور تھا، جو نازک ترین مرحلے ان کی زندگی میں پیش آئے، ان کے انتظامی و اصلاحی اصول (پالیسی) جن کے وہ سختی کے ساتھ پابند رہے، اور وہ اعلیٰ اسلامی قدریں جن کے بارے میں کبھی ان کے اندر لچک نہیں آئی، اُن کی پاک و بے داغ زندگی، اُن کی شخصی خصوصیات و اختصاص کا نمونہ بھی قارئین کے سامنے آئے۔

اس کے بعد بھی (جو کتاب کا مرکزی موضوع ہے) مصنّف نے اپنا علمی سفر جاری

رکھتے ہوئے، فرزندانِ گرامی مرتبت، جگر گوشہائے رسول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی مختصر سیرتیں بھی قلم بند کردی ہیں، جن سے اُن کے کمالات اور قربانیوں کی ایسی تصویر سامنے آتی ہے، جس سے اُن حضرات کے کارناموں کی عظمت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے، اور ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اُمّت کی قیادت اور واقعی صورتِ حال کا سامنا اپنے منصب اور وقت کے تقاضے کے مطابق کیا اور حق وانصاف، عزم واخلاص، جوشِ عمل اور دین کے لئے فدائیت وجاں سپاری کا محیّر العقول نمونہ قائم کیا۔

اُن کے بعد اُن کی نسل سے اٹھنے والے اُمت کے نادرۂ روزگار بزرگوں کی سیرتیں بھی سامنے آگئی ہیں، جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ خانوادۂ نبوّت کو اللہ تعالےٰ نے کس درجہ بلند اخلاق کا حامل بنایا تھا، اور یہ حضرات کتنے عظیم کردار اور مثالی شخصیت کے حامل تھے، اس کے بعد اس خاندان کے ان اصحابِ رُشد وہدایت، ودعوت وعزیمت کا ذکر بھی آگیا ہے، جنھوں نے بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح اور مختلف زمانوں میں خالص اسلامی اور صالح نظامِ حکومت کے قیام کے لئے جدّ وجہد کی اور اُس راہ میں قربانیاں دیں، اور جب وہ سیاسی ابتری اور مقابل طاقت کے غلبہ کی وجہ سے اپنی اس مہم میں کامیاب نہ ہوسکے تو انھوں نے اپنی توجہ اسلامی معاشرہ کی دینی واخلاقی تربیت، نفوس کے تزکیہ، اور دعوت الی اللہ کے کام پر مرکوز کردی کہ خالق ومخلوق کے درمیان عبودیّت واخلاص کا وہ ربط وتعلق مستحکم ہو جو بعثتِ انبیاء کا مقصدِ اوّلین تھا، اور نبوّتِ محمدی نے اس کی تجدید وتکمیل کی، اور مسلمان مادّی اغراض سے بلند ہوکر رضائے الٰہی اور ثوابِ اُخروی کو اپنی کاوشوں اور کوششوں کا ہدف بنائیں، ان کی مساعی سے اسلام دُور دراز علاقوں میں پھیلا، اور دعوتِ الی اللہ کا کام اس طرح جاری رہا کہ دنیا نے شہادت دی کہ۔ ع

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشاں است

اسلام کا ابرِ کرم آج بھی رحمت کا مینہ برسا رہا ہے، اور خانوادۂ نبوّت کا شجرِ پُرثمر سدا بہار ہے، یہ وہ ضمنی موضوعات ہیں، جن پر سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ کے سیرت نگاروں نے عام طور پر توجہ نہیں کی ہے۔

کتاب کے آخر میں انتہائی اضطرار اور مجبوری کی وجہ سے ــــ اور اللہ تعالےٰ کے حضور جوابدہی کے خوف اور اس کے اجر کی اُمید میں ــــ ان بعض عقائد اور نظریات پر تنقید کی ہے جو سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ اور اہلِ بیت کی حمایت و نصرت کے نام سے پیش کئے جاتے رہے ہیں، جن کا سیّدنا علی مرتضیٰ کی ذاتِ گرامی اور اُن کے خاندانِ والا شان بلکہ اسلام سے بھی کوئی تعلق نہیں، وہ غیر اسلامی و بیرونی عقائد و روایات کی میراث اور ان کا عکسِ کامل ہیں۔

بہر حال ان خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب عہدِ اسلامی کے طویل زمانوں اور وسیع گوشوں کے جائزہ پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز، اور نسلِ انسانی کے ایک عظیم فرد اور تربیت گاہ رسولِ اکرمؐ کے ایک منتخب ترین تربیت یافتہ کی سیرت کو پیش کرنے کی ایک عاجزانہ لیکن مُخلصانہ کوشش ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اس تالیف میں دو بنیادی اصولوں پر کاربند رہنے کا التزام کیا گیا ہے، اول یہ کہ صرف ان ہی کتابوں کے حوالوں پر اعتماد کیا گیا ہے جو محقّقین کے نزدیک عام طور پر مستند ہیں، دوم یہ کہ جہاں سے کوئی بات نقل کی گئی ہے، اس کا پورا حوالہ مع ایڈیشن اور مطبع اور جلد اور صفحہ کے نمبروں کے ساتھ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ محبّی مولوی عتیق احمد صاحب بستوی (مدرّس دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے دورانِ تصنیف بعض مطلوبہ معلومات اور حوالوں کی تلاش میں مدد کی، مصنّف ان کا شکر گذار ہے، برادرِ عزیز مولوی نثار الحق ندوی کا شکریہ بھی ضروری ہے جنھوں نے

دل چسپی اور دل جمعی کے ساتھ اس مسودہ کو لکھا اور صاف کیا، عزیزی مولوی محمد ہارون ندوی نے ضخیم عربی مسودہ کو ٹائپ کرنے کی زحمت گوارہ کی، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

آخر میں یہ بات بھی مصنف کے لئے بڑی باعثِ مسرّت وطمانینت ہے کہ اس کو صحیح و فصیح اردو میں منتقل کرنے کے لئے عزیز گرامی قدر مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پھلواروی (سابق استاد جامعۂ اُمّ القریٰ مکہ مکرمہ وحال معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی خدمات حاصل ہوگئیں، جو ذہنی، جذباتی اور خاندانی طور پر اس موضوع اور اس کی مرکزی شخصیت اور اس کے خاندان سے عقیدت واحترام کا تعلق رکھتے ہیں، اور جنھوں نے بڑی توجہ وشغف سے اپنا قیمتی وقت، اپنی سعادت وذریعۂ تقرب الی اللہ سمجھ کر ترجمہ کی اس خدمت میں صرف کیا، مصنف کے حلقۂ احباب و رفقائے کار میں اس خدمت کی انجام دہی کے لئے عزیز ارجمند محمد میاں (فرزند برادر معظم ڈاکٹر مولوی حکیم سید عبدالعلی صاحب مرحوم) کے بعد جو اس کی اکثر عربی تصنیفات کے کامیاب ومقبول مترجم رہے ہیں، ان سے زیادہ موزوں ولائق مترجم ملنا مشکل تھا، اللہ تعالیٰ اس اصل تصنیف کے ساتھ اس کے اردو ترجمہ اور پھر اس کے ذریعہ دوسری زبانوں میں جو ترجمے ہوں ان سب کو مقبول وکامیاب بنائے۔

آخر میں —— نہ کہ آخری بار —— اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی حمد وثنا کرتا ہوں جس نے اس کام کو انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائی، دعا ہے کہ وہ اس سے مصنف اور اس کے پڑھنے والوں کو نفع پہونچائے، اس کی ذات پاک ہر شئے پر قادر ہے، اور اس سے قبولیت کی اُمید ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

بمبئی - ۲۱ رشوال ۱۴۰۶ھ
۷ رجون ۱۹۸۶ء

باب اوّل

حضرت علی بن ابی طالبؓ مکّہ میں

خاندان، پیدائش، ہجرت

خاندان اور آنے والی نسلوں پر اس کے اثرات اور اسلامی نقطۂ نظر

علم التشریح (ANATOMY) نفسیات، اخلاقیات اور علم الاجتماع میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر خون اور خاندان کے اثرات بڑی حد تک موجود رہتے ہیں، اور اس کی سیرت کی تشکیل، فطری صلاحیتوں، رجحانات، اور ذہنیت کے بنانے میں موروثی اثرات کا خاصا دخل ہوتا ہے، یہ اثرات تین[۳] شکلوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔

اول: آباء و اجداد جن قدروں کے سختی سے پابند رہے ہیں، جو عقائد ان کے دل و دماغ پر حاوی رہے ہیں، اور جن کی تعظیم و توقیر اُن کا شعار رہا ہے، اور جس کے بارے میں اُن کو اس درجہ حمیّت، غیرت اور جوش رہا ہے کہ اگر خاندان کا کوئی فرد یا خود اُن کی اولاد میں سے کوئی اس سے روگرداں ہو تو اُس کو خاندانی روایات سے باغی سمجھیں، اُس کو گھرانہ کے لئے ایسا ننگ و عار قرار دیں جس کو خاندانی و روایاتی قانون و آئین میں کبھی معاف نہ کیا جا سکتا ہو۔

دوم: ماں باپ اور گھر کے ماحول میں جن باتوں کو بار بار سُنا جاتا ہے، اور بزرگوں کے واقعات و حالات، اُن کی اولوالعزمی، مروّت، سخاوت، شجاعت، حق گوئی، حق پرستی انسان دوستی، غریبوں کی مدد اور مظلوموں کی حمایت کے قصے جو بار بار کانوں میں پڑتے رہتے، اور بچپن سے جوانی اور کبرسنی تک جن کا چرچا رہتا ہے، یہ باتیں ذہنیت کا رُخ متعین کرتی ہیں، احساسات و رجحانات کو ایک خاص قالب میں ڈھال دیتی ہیں، اور اخلاق و شرافت اور انسانیت و غیرتِ نفس کا ایک معیّن معیار قائم کرتی ہیں۔

سوم: موروثی خصوصی اثرات اعضاء و جوارح (قد و قامت اور طرز گفتار) میں بھی پائے جاتے ہیں، خاص طور پر ان خاندانوں میں جہاں نسب کی اہمیت ہے، اور کوشش ہوتی ہے کہ خاندان کی "اصلیت" محفوظ رہے۔

عرب شعراء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، ربیعہ بن مقروم جو قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتا تھا، اور جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے ہیں، اور عربی کے مستند ترین مجموعۂ اشعار "حماسہ" کے شاعروں میں سے ہے، کہتا ہے ؎

هِجان الحيّ كالذّهب المصفّى ۔۔۔ صَبيحة ديمةٍ يجْنيه جان

(قبیلہ کے شریف زادے ایسے ہیں جیسے صبح کی رم جھم بارش میں خالص سونا چمکے اور جس کو اٹھانے والا بے تکلف اٹھالے۔)

ایک مشہور عرب شاعر حُطیئہ نے کہا تھا ؎

مطاعينُ في الهيجا مكاشيف للدجى ۔۔۔ بنى لهمُ آباؤهم وبنى الجدُّ

(یہ وہ قبیلہ ہے جس کے افراد جنگوں میں بڑھ بڑھ کر حملے کرتے ہیں، تاریکیوں کے پردے چاک کرتے ہیں، یہ خو اُن کے اندر ان کے آباء و اجداد کے راستے سے آئی ہے۔)

لیکن یہ تمام باتیں ایک متعیّنہ حد تک اور عمومی حالات میں صحیح ہیں، ان میں کوئی بات کُلّیہ اور اصول کا درجہ نہیں رکھتی کہ کہا جائے کہ ان میں کوئی استثناء نہیں ہوتا اللہ تعالےٰ کی یہ وہ سنّتِ عادیہ نہیں ہے جس کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے :-

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔۔۔ سو تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدّل

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۔۔۔ نہ پاؤ گے، اور خدا کے طریقہ میں کبھی

(سورۃ فاطر - ۴۳) ۔۔۔ تغیّر نہ دیکھو گے۔

اس حقیقت کو زبانِ رسالت میں اس انداز سے بیان کیا گیا ہے، جو عربی بلاغت اور نبوی حکمت کا نمونہ ہے، اور جس کو سُن کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک پیغمبر ہی کا کلام ہو سکتا ہے، انبیائے کرام جس طرح حقائق کا اظہار فرمایا کرتے تھے، اور جو ان کی حقیقت بیانی کی امتیازی شان ہے، وہ سب اس حدیثِ نبوی میں موجود ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :۔

النَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ	لوگ کانیں ہیں جیسے چاندی اور سونے
الفِضَّةِ وَالذَّهَبِ، خِيَارُهُم	کی کانیں ہوں، ان میں جو لوگ جاہلیت
فِي الجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُم	کے زمانہ میں ممتاز تھے، وہ اسلام میں
فِي الإِسْلَامِ۔[1]	داخل ہونے کے بعد بھی ممتاز رہے۔

اور فرمایا :۔

من بطأبه عمله لم يسرع	جس کو عمل نے پیچھے ڈال دیا ہو اُس کا
به نسبه۔[2]	نسب اُسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی خاندان یا کوئی نسل تعظیم و احترام کی صرف اپنے نسب کی وجہ سے مستحق ہے، اور نہ یہ کہ دینی قیادت، روحانی سیادت یا علمی وجاہت کسی خاندان کی جاگیر سمجھی جائے، اور نہ دائمی طور پر کسی ایک ہی خاندان کے حصّہ میں ہمیشہ کے لئے علمی و دینی سیادت باقی رہنے کی ضمانت ہے، اسلام سے پہلے دنیا کو بدترین سماجی اور اخلاقی انارکی کا نسب پرستی کی بنا پر سامنا کرنا پڑا، انتہائی سخت قسم کی آمریت (DICTATORSHIP)

---

[1] مسند الامام احمد بن حنبل (المسند ابی ہریرہ) ج ۲ ص۵۳۵

[2] صحیح مسلم باب الذکر والدعاء والتوبۃ۔

اور انتہائی بھیانک انداز کا مادی استحصال ہوتا رہا ہے، اور ایسے بے شمار واقعات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، رومی اور ساسانی شہنشاہوں اور ہندی و رومی تہذیبوں کے بارے میں اس کی واضح شہادتیں موجود ہیں، جس کا آئندہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آئے گا۔

لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ مؤرخانہ امانت اور علمی غیر جانبداری کے ساتھ اس نسل و خاندان کی اجتماعی و رواجی حیثیت کا جائزہ لیں جس میں امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ پیدا ہوئے، اور پروان چڑھے اور یہ دیکھیں کہ اس قبیلہ و خاندان کی کیا امتیازی خصوصیات تھیں، اُن کے یہاں کیا روایات تھیں اور اخلاقی و نفسیاتی وراثت میں کیا باتیں تھیں، اور یہ کہ اُن کو دوسرے عرب قبائل کس نظر سے دیکھتے تھے، اور کس درجہ اُن کی خوبیوں کے قائل تھے؟ اس سلسلہ میں ہم قبیلۂ قریش کا پھر بنو ہاشم کے خاندان کا ذکر کریں گے۔[1]

قبیلۂ قُریش:

تمام اہلِ عرب قریش کی عالی نسبی کے مُعترف تھے، اور اس بات میں اُن کے درمیان دو رائیں نہیں تھیں کہ قریش کو قبائلِ عرب پر خاندانی تفوّق حاصل ہے، اُن کی زبان و لہجہ دوسروں کے لئے معیار تھا، مہمان نوازی، شجاعت اور جوانمردی کے جوہر اُن میں امتیازی

---

[1] راقم نے اپنی کتاب "السیرۃ النبویہ" میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت جزیرۂ عرب میں کیوں ہوئی "لماذا بعث النبی فی جزیرۃ العرب؟" دار الشروق۔ جدہ ص ۴۲ تا ۵۵ ط، (ملاحظہ ہو کتاب کا اردو ایڈیشن "نبی رحمت" باب "محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟" ص ۴۶-۵۹)

طور پر پائے جاتے ہیں، یہ بات اس درجہ تسلیم شدہ تھی کہ مثال دی جاتی تھی کہ فلاں شخص قریش کی طرح فصاحت سے بولتا ہے یا سخی و مہمان نواز ہے۔

اس قبیلہ کی شاخیں آپس میں ایک دوسرے کی حلیف تھیں، وہ قبائلی خصوصیات کو عزیز رکھتی تھیں، اور شریعت ابراہیمی پر بہت حد تک کاربند تھیں، یہ لوگ اُن بدوی قبائل کی طرح نہیں تھے، جن کا نہ کوئی مذہب تھا اور نہ وہ آداب معیشت کے لحاظ سے کوئی امتیازی شان رکھتے تھے۔

قریش کی امتیازی خصوصیات میں یہ بات بھی تھی کہ وہ اپنی اولاد سے محبت رکھتے تھے (بدویانہ معاشرت میں یہ بات نہ تھی) خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، مناسکِ حج ادا کرتے تھے، میت کو کفن پہناتے، غسل جنابت کرتے، ہندوستان یا ایران کی طرح ان میں برہمنوں یا آتش کدہ کے خاندانی منتظموں کی طرح پروہتوں (PRIESTS) کا کوئی طبقہ نہیں پایا جاتا تھا، اور وہ اس سے دور تھے، شادی بیاہ ذرا دور کی قرابت میں کرتے اور نکاح میں گواہوں اور مہر کا التزام رکھتے، طلاق دیتے تو تین بار دیتے[1]، بیٹی، نواسی، بہن اور بھانجی سے اس وقت کے ایرانی مجوسیوں کی طرح مناکحت نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کو عار اور شرم و بے حیائی کی بات سمجھتے تھے، قرآن نے اُن کے اس طرز معاشرت کو بہ نظر استحسان دیکھا، اور اس کی کئی چیزوں کو قائم رکھا۔

قریش کی امتیازی شان میں اضافہ کرنے والی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ لوگ جس قبیلہ میں چاہتے شادی کر سکتے تھے، مگر ایک شرط ضرور کر لیتے کہ جس سے شادی کی جا رہی ہے، مذہب کے معاملہ میں اس کے اندر پختگی اور گہرائی ہو[2] ان کا عقیدہ تھا، یہ جائز ہی نہیں ہے اور نہ اُن کے

---

[1] بلوغ الأرب فی معرفۃ أحوال العرب۔ ج ۱ ص ۲۴۳۔ مصنفہ علامہ محمود شکری الآلوسی البغدادی۔ مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی۔ مصر۔ [2] ایضاً

خاندانی روایات کے شایان شان ہے کہ ایسے شخص سے مُناکحت کا تعلق پیدا کریں جو عقیدہ میں ان کا ہم مشرب نہ ہو اور یہی نہیں، بلکہ اس کے اندر مذہبی حمیّت اور جوش بھی ہو۔

بَنو ہاشم

قُریش کے قبیلہ میں بنو ہاشم کی حیثیت ایک گُلِ سر سبد کی تھی، تاریخ کی کتابوں میں ان کے بارے میں اگرچہ مختصر اور ناکافی مواد ملتا ہے، لیکن جو کچھ ملتا ہے، اسی کو سامنے رکھا جائے تو اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ قریش کی یہ شاخ اپنے انسانی شعور اور اعتدال پسندی میں امتیاز رکھتی تھی، دینی و دماغی طور پر بھی اس کو کسی قدر فوقیت حاصل تھی، بیت اللہ (خانہ کعبہ) کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مقام و مرتبہ تھا، اس پر پختہ ایمان رکھتی تھی، ظلم و زیادتی کو گناہ سمجھنے کا شعور ختم نہیں ہوا تھا "ہٹ دھرمی" اور ضد اس کا شعار نہیں تھا، ہمت بلند تھی، کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم و شفقت کا برتاؤ کرتی، سخاوت و شجاعت اس کا مزاج تھا، غرض اخلاق و شرافت، بیر چشمی، حمیّت اور جوشِ عمل کی وہ خصوصیات جن کے لئے عربی میں ایک جامع لفظ "فروسیّت" (CHIVALRY) کا ہے، بنی ہاشم میں بدرجۂ اَتم موجود تھی، ان کے اخلاق و سیرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد کے شایانِ شان تھے، اور اسلام نے جن اخلاقِ عالیہ کی دعوت دی ہے، اُن سے اُن کے اخلاق مناسبت رکھتے تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ تک وہ اپنی قوم و ہم وطن قبائل کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں اُن کے شریک ہو گئے تھے[۱]۔

عبد المُطّلِب بن ہاشم، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے جَدِّ بزرگوار

عبد المُطّلِب بن ہاشم اپنے چچا "المُطّلب" کے بعد حُجّاج کے لئے پینے کا پانی فراہم کرنے

---

[۱] "السیرۃ النبویۃ" از مصنّف ص۵۰ ط ۷ دار الشروق جدہ۔

اوران کی مہمان نوازی (السقایۃ والرفادۃ[1]) کے منصب پر سرفراز ہوئے انھوں نے اپنے عہد میں اپنے آباء واجداد کے نقشِ قدم پر لوگوں کی یہ خدمتیں بڑی خوبی اور وُسعت سے انجام دیں، جس سے لوگوں کے درمیان ان کا رُتبہ بلند ہوا، اوران کو وہ عزت وتوقیر، عوام کی عقیدت اورخواص کا احترام حاصل ہوا جو اُن کے پیش رَو بزرگوں کو بھی حاصل نہیں ہوا تھا[2]۔

عبد المُطّلِب اپنے دادا قُصَیّ کی طرح بڑے مالدار اور قریش کے تنہا مخدوم و مُطاع نہیں تھے، اس وقت مکّہ میں ان سے زیادہ مالدار، صاحبِ حیثیت ووجاہت لوگ موجود تھے، البتہ اعیان مکّہ میں ان کا شمار تھا، کیونکہ سقایہ و رِفادہ کا منصب انھیں حاصل تھا، اور وہ اپنے مفوّضہ کام کو دلچسپی وسرگرمی اور اخلاص سے انجام دیتے تھے، اپنے منصب کے لحاظ سے بئرِ زمزم کے وہ متولّی تھے اور زمزم کا بیت اللہ سے جو تعلق ہے، اس کی بنا پر ان کی وجاہت میں اضافہ ہوا۔

عبدالمُطّلِب کو بیت اللہ کی عظمت اور اس کے خانۂ خدا ہونے کا یقین، اور یہ یقین کہ یہ اللہ کا گھر ہے، اور وہی اس کا نگہبان و پاسبان ہے، جس درجہ تھا، اس کا اندازہ اس گفتگو[3] سے ہوسکتا ہے، جو حبشہ کے بادشاہ ابرہہ سے انھوں نے کی، اُس سے سردارِ قریش کی بلند قامت اور پُرجلال شخصیت نمایاں طور پر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، جب ابرہہ نے مکّہ پر حملہ کیا اور بیت اللہ کی اہانت اور اس کی عظمت کو پامال کرنے کا ارادہ کیا، ابرہہ کے سپاہی عبدالمُطّلِب کے دو سَو اونٹ بھگا کر لے گئے، عبدالمُطّلِب اس سے گفت وشنید کے لئے گئے، اس کے دربار میں جانے کی اجازت لی، ابرہہ نے اُن کی تعظیم کی، اپنے تخت سے اتر کر فرش پر اپنے ساتھ بٹھایا اور

---

[1] رِفادہ کے معنی ہیں، حُجاج کے لئے رہائش اور خوراک کی فراہمی (پورے موسم حج تک)

[2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۲ مطبع مصطفےٰ البابی الحلبی. مصر.

[3] موجودہ صحافتی اصطلاح میں اس کو سیاسی مذاکرات کہہ سکتے ہیں۔ (مترجم)

پوچھا: کیا حاجت ہے، جس کے لئے تکلیف کی؟ عبد المطلب نے فرمایا: میری حاجت یہ ہے کہ تمہارے آدمی میرے دو سو[2] اونٹ بھگا کر لے آئے ہیں، وہ واپس کر دو۔

عبد المُطَّلِب کی زبان سے یہ بات سُن کر ابرہہ نے حقارت آمیز نگاہ سے اُن کو دیکھا اور بولا: تم دو سو[2] اونٹوں کے بارے میں بات چیت کرنے آئے ہو اور اس "گھر" کو فراموش کر رہے ہو جس سے تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا دین وابستہ ہے، اور جس کو میں منہدم کرنے آیا ہوں، عبد المطلب نے کہا:

أنا ربّ الإبل وإنّ للبيت	میں اونٹوں کا مالک ہوں اور "البیت"
ربّاً سيمنعه۔	کا ایک مالک موجود ہے جو اس کی مدافعت کریگا۔

ابرہہ نے کہا وہ مجھے اس ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتا، عبد المُطَّلِب نے جواب دیا: "أنت وذاك" تم جانو اور تمہارا کام۔[1]

جناب عبد المطلب اپنی اولاد کو ظلم و زیادتی سے باز رکھنے، اخلاق و شرافت کے اصول پر قائم رہنے اور پستی و بد اخلاقی سے دور رہنے کی نصیحت کیا کرتے تھے[2]، اسّی سال سے زیادہ عمر پانے کے بعد عبد المطلب نے وفات پائی اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ سال کی تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی وفات تقریباً ۵۷۸ء میں ہوئی[3]، مورخین نے لکھا ہے کہ ان کی وفات پر بہت دنوں تک بازار بند رہے[4]۔

---

[1] "السیرۃ النبویہ" از مؤلف بحوالۂ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۹–۵۰ بالآخر وہی ہوا جو عبد المطلب نے کہا تھا، ربّ البیت نے اپنے بیت کی حفاظت و مدافعت کرلی اور ابرہہ کی سازش اور اس کی فوجی کاوش رائیگاں گئی، اس نے اس پر ابابیل کو مسلّط کیا، جنھوں نے کنکریوں کی بارش کر کے ان سب کو جگالی کیا ہوا بھوسا بنا دیا۔ (قرآن کریم سورۃ الفیل)

[2] بلوغ الأرب فی معرفۃ احوال العرب، ج ۱ ص ۳۲۴

[3] المفصّل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۴ ص ۳۲۴

[4] الأنساب للبلاذری، ج ۱ ص ۸۸ (مطبوعہ۔ دار المعارف۔ مصر ۱۹۵۹ء)

سیدنا حضرت علی بن ابی طالبؓ کے والد ماجد ابو طالب

ابو طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبدِ مناف کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پینتیس ۳۵ سال پہلے ہوئی، مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا نام عبدِ مناف تھا مگر وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوئے، ایک روایت یہ ہے کہ ان کا نام عمران تھا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا نام شَیبہ تھا، وہ قریش کے ان ممتاز لوگوں میں تھے، جو حَکَم اور تنازعات میں فیصلہ کرنے والوں کا درجہ رکھتے تھے، اور سرداروں میں سے تھے، اہم مسائل میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔[1]

عبد المطلب نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے صاحبزادہ ابو طالب کو وصیت کی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رکھیں، چنانچہ انھوں نے آنحضورؐ کو اپنی کفالت میں لیا، اور فکر و اہتمام کے ساتھ آپ کی تربیت کی اور جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کم سِن تھے،[2] ابو طالب آپؐ کو ملک شام کے سفر پر اپنے ساتھ لے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد اور ابو طالب دونوں حقیقی بھائی ایک ماں باپ کی اولاد تھے، ان کی والدہ فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم تھیں۔[3]

ابو طالب کوئی صاحبِ ثروت و دولت آدمی نہ تھے، لیکن وہ اپنے بھتیجے کو اپنے فرزند سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے، اپنے ساتھ سلاتے، کہیں جاتے تو اپنے ساتھ لے جاتے، اُن کو اس سے پہلے کسی سے وہ تعلقِ خاطر نہیں ہوا جو برادر زادۂ عزیز سے ہوا، کھانے میں بھی

---

[1] بلوغ الأرب فی معرفة احوال العرب۔ ج ۱ ص ۳۲۴ طبقات کبریٰ لابن سعد۔

[2] یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تمام کتب سیرت میں موجود ہے، ملاحظہ ہو "السیرة النبویہ" از مؤلف ص ۱۰۳ (مشہور قول کے مطابق عمر مبارک نو ۹ سال تھی بلاحظہ ہو طبری و کتب سیرت) [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۹

اُن کے ساتھ خصوصیت برتتے تھے۔[1]

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ ابوطالب ہی تھے، جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آپ کے دادا کے بعد پرورش وخبر گیری کی ذمّہ داری قبول کی، اور ہمیشہ اُن کی حمایت کی اور ساتھ دیا۔[2]

جیسا کہ اوپر گزرا جب ابوطالب ایک تجارتی سفر پر ملک شام جانے کے لئے تیار ہوئے سامانِ سفر مکمل ہوا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُن کی جُدائی کے احساس سے غمگین ہو گئے، ابوطالب سے یہ دیکھا نہ گیا، اُن کا دل جذباتِ شفقت سے بھر آیا اور وہ کہنے لگے: "بخدا نہ میں اس بچہ کو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ یہ میری جُدائی گوارا کر سکتا ہے، میں اس کو اپنے ساتھ سفر میں ضرور لے جاؤں گا۔"[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی چچی "فاطمہ بنت اسد" اہلیہ ابوطالب کے متعلق فرمایا کرتے تھے: "میری والدہ کے انتقال کے بعد جن کے بطن سے میں پیدا ہوا، یہی میری ماں تھیں، ابوطالب جب دعوت کرتے، اور گھر کے سب لوگوں کے ساتھ مجھے بھی شریک کرتے، تو یہ خاتون (اہلیۂ ابوطالب) کھانے میں سے کچھ بچا کر رکھ لیتیں اور میں کسی اور وقت اس کو کھاتا۔"[4] موصوفہ (حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا) کے بارے میں ابوعمرو کا بیان ہے کہ وہ ہاشمی خاندان کی پہلی خاتون ہیں جن کے بطن سے ایک ہاشمی پیدا ہوا۔[5]

فاطمہ بنت اسد اسلام سے مُشرّف ہوئیں، اور مدینہ منورہ ہجرت کی جب اُن کی وفات ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اپنا کرتا (کفن کے طور پر) پہنایا، اُن کی قبر میں پہلے خود اندر جا کر لیٹے، یہ سب اُن کی خدمات و شفقت کا اعتراف اور اُن کی عزت و تعظیم کا اظہار تھا۔[6]

---

[1] حیاۃ ابی طالب از مولانا خالد انصاری (مطبعہ علوی بھوپال ۱۹۵۱ء) [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۹
[3] ایضاً ص ۱۸۰ [4] مستدرک حاکم ص ۱۵۱ [5] الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب لابن عبد البر۔ ج ۲ ص ۲۶ علی ہامش "الإصابہ" لابن حجر دار صادر بیروت۔
[6] سیر اعلام النبلاء للذہبی ج ۲ ص ۸۷ مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ۔ بیروت۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے اور اعلانِ حق برملا فرمانے لگے، بُت اور بُت پرستی کی تحقیر کی اور اس کو باطل قرار دیا تو لوگوں کو یہ بات بہت کھلی، انھوں نے آپؐ کی مخالفت شروع کر دی، اور آپؐ کی دشمنی پر سب متفق ہو گئے، لیکن ابوطالب یکساں طور پر آپؐ کی حمایت اور مدافعت کرتے رہے۔

جب یہ معاملہ (اسلام کی دعوت اور کفّار کی عداوت کا) اور آگے بڑھا تو قریش کے سربرآوردہ اصحاب ابوطالب کے پاس گئے اور کہا: جناب والا! آپ ہمارے بزرگ اور قبیلہ کے ممتاز سردار ہیں، ہم آپ کی عزّت و توقیر کرتے ہیں، ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے بھتیجے کو (دعوتِ اسلام سے) روکیں مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، ہم اپنے آباء و اجداد کی بُرائی سننے، اپنی عقل و دانش کی توہین اور اپنے معبودوں کی تحقیر پر جس درجہ صبر کر سکتے تھے صبر کر چکے، لہٰذا اب یا تو آپ اُن کو اس کام سے روکیں یا پھر ہم آپ مقابلہ پر آ جائیں، اور ہم میں سے کوئی ایک گروہ ہلاک ہو جائے۔ ابوطالب نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں سنائیں جو اُن کے اور قریش کے درمیان ہوئی تھیں، اور آپؐ سے خواہش کی کہ وہ ان پر اور خود اپنے اوپر رحم کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا:

"عمّ محترم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب رکھ دیں اور کہیں کہ اس کام (کارِ نبوّت) سے باز آؤ تو کبھی نہ چھوڑوں گا، اور اس وقت تک اس کو جاری رکھوں گا کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس کو غالب کر دے یا میں اس راہ میں کام آ جاؤں" ابوطالب نے کہا: میرے عزیز! تم اپنا کام جاری رکھو اور جو کہنا چاہتے ہو کہو میں بخدا تم کو ان لوگوں کے حوالہ نہیں کروں گا۔[1]

جب اسلام قبائلِ عرب میں پھیلنے لگا، قریش نے آپس میں مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ ایک ساتھ

---

[1] مختصراً ماخوذ از سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۶۵-۲۶۶

تیار کریں، جس میں بنو ہاشم اور بنو المطّلب کے بارے میں معاہدہ کرلیں کہ اُن کے خاندان سے شادی بیاہ کے تعلقات منقطع کرلیے جائیں، اُن کے ہاتھ کوئی کوئی چیز فروخت نہ کرے اور نہ اُن سے کچھ خریدے، اس معاہدہ کو ایک کاغذ پر لکھ کر کعبہ کے اندرونی حصّہ پر لٹکا دیا جائے، چنانچہ سبھوں نے اس کی پابندی کی، خاندانِ بنو ہاشم اور بنو المطّلب کے افراد نے ابوطالب کا ساتھ دیا، اور اُن کے ساتھ وہ بھی "شعب" میں داخل ہو گئے۔[1]

یہ واقعہ نبوّت کے ساتویں سال ماہ محرم کا ہے، تین سال تک بنو ہاشم اس شعب میں محبوس رہے، چھپ چھپا کر لوگ کچھ پہنچا آتے تھے، علانیہ مقاطعہ تھا، بہرحال جو پیش آنا تھا پیش آیا اور بالآخر دیمک نے اس عہد نامہ کو چاٹ لیا اور اس پر عمل درآمد خود ہی منسوخ ہو گیا۔[2]

نبوّت کے دسویں سال وسط شوال میں ابوطالب کی وفات ہوئی، اس وقت اُن کی عمر کچھ سال اوپر اسّی سال تھی،[3] اسی سال حضرت خدیجہ زوجہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، ابوطالب نے اسلام نہیں قبول کیا،[4] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پے در پے

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ۱ صفحہ ۳۵۱-۳۵۰ یہی وہ شعب (پہاڑوں کے درمیان ایک کھلی جگہ جہاں بڑا خیمہ یا مکان بنایا جاسکے۔ مترجم) ہے جو شعب ابی طالب کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

[2] تفصیلات کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام، ج ۱ صفحہ ۳۷۳-۳۷۷ یا مؤلف کی "السیرۃ النبویۃ" صفحہ ۱۳۸-۱۳۹

[3] بلوغ الارب ج ۱ صفحہ ۳۲۴

[4] یہ بات کتب حدیث، سیرت قدیم وجدید سے ثابت اور مشہور ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا، لیکن یہ بات اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ دین اصول وعقیدہ کا مذہب ہے، نہ کسی فرد کی طرف داری کرتا ہے اور نہ کسی خاندان کی، بنیاد صرف وہ ہے جس کی دعوت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، شخصی محبت اور تنہا مدافعت وحمایت بھی کام نہیں آتی اگر اس کے ساتھ صحیح عقیدہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان نہ ہو۔

مصائب پیش آئے، اس سال کو آپؐ نے عام الحزن (غم کا سال) فرمایا۔[1]

برادرانِ سیدنا علی بن ابی طالب

ابو طالب کے چار[1] صاحبزادے تھے: طالب (جن کے نام سے آپ کنیّت کرتے تھے) دوسرے عقیل، تیسرے جعفر اور چوتھے علی اور دو[2] صاحبزادیاں تھیں، اُمّ ہانی اور جمانہ اور یہ سب فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، اور ان تمام بھائی بہنوں میں دس[1] دس[1] سال کا فرق تھا، چنانچہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ حضرت جعفرؓ سے دس[1] سال چھوٹے تھے۔[2]

طالب کی غزوۂ بدر کے بعد حالتِ شرک میں موت واقع ہوئی، ایک روایت ہے کہ وہ کہیں باہر گئے تھے واپس نہیں آئے اور اُن کی کوئی خبر نہیں ملی، وہ ان لوگوں میں تھے جو کسی سفر میں راستہ بھٹک گئے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دِلی محبت رکھتے تھے اور آپؐ کی شان میں نعتیہ اشعار بھی کہے تھے، جنگ بدر کے موقع پر بادل ناخواستہ کفّار کے ساتھ چلے گئے تھے، جب کفّار قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرنے کے لئے نکلے تھے، انھوں نے طالب کو طعنہ دیا تھا کہ اے ہاشمیو! ہمیں خوب معلوم ہے کہ اگرچہ ہمارے ساتھ مجبوراً چل رہے ہو مگر تمھاری ہمدردیاں محمدؐ کے ساتھ ہیں، چنانچہ وہ بدر کی جنگ میں کفّار کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے نہیں لڑے اور مکّہ واپس آگئے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت میں چند شعر اور ایک قصیدہ کہا اور اصحابِ قلیب بدر کا مرثیہ کہا۔[3]

---

[1] سیرۃ ابنِ ہشام، ج ۱ صـ ۴۱۵-۴۱۶ [2] البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۷ صـ ۲۲۳ مکتبۃ المعارف بیروت، ومکتبۃ النصر، ریاض [3] الجوہرۃ فی نسب النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ العشرۃ، تالیف محمد بن ابی بکر بن عبد اللہ ابن موسی الانصاری التلمسانی المعروف بالبرّی متوفی ۶۸۱ھ مطبوعہ دار الرفاعی الریاض، طبع اول ۱۹۸۳ء

دوسرے حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، جن کی کنیّت ابویزید تھی، فتح مکہ کے وقت ایمان لائے، بعض روایتوں میں ہے صلح حُدیبیہ کے بعد اسلام لے آئے تھے، ۸ھ کی ابتداء میں ہجرت کی، بدر کے موقع پر گرفتار ہو کر آئے تھے، اور اُن کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اُن کا فدیہ ادا کیا تھا، صحیح احادیث میں ان کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، غزوۂ موتہ میں شریک تھے، فتح مکہ اور حُنین کے سلسلہ میں اُن کا نام نہیں لیا گیا غالبًا وہ ان دنوں بیمار تھے، ابن سعد نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن زبیر بن بکّار نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ وہ غزوہ حُنین میں اصحابِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

ابوطالب اپنی اولاد میں حضرت عقیل سے زیادہ مانوس تھے، اس لئے قحط وناداری کے زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت عباس ؓ ابوطالب کے پاس گئے کہ اُن کی اولاد کی کفالت کی ذمہ داری آپس میں تقسیم کر لیں تاکہ اُن پر سے بوجھ کم ہو، تو ابوطالب نے کہا: بہتر ہوتا کہ تم لوگ عُقیل کو میرے پاس چھوڑ دیتے، اُن کے علاوہ جو اُن کے بھائی ہیں، اُن کو جس طرح چاہو تقسیم کر لو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ؓ کو اپنی کفالت میں لے لیا، اور حضرت عبّاس ؓ نے حضرت جعفر ؓ کی کفالت اپنے ذمّہ لے لی۔[1]

حضرت عقیل بن ابی طالب انساب قریش سے بڑے واقف تھے، اُن کی خوبیاں اور بُرائیاں سب جانتے تھے، مسجد نبوی (مدینہ منوّرہ) میں لوگ آکر ان سے انساب کے سلسلہ میں رجوع کیا کرتے تھے، وہ بڑے حاضر جواب تھے، اور جلد خاموش ومطمئن کر دیتے تھے، ہشام الکلبی نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت کی ہے کہ قریش میں چار[2] بزرگ ایسے تھے،

---

[1] الجوہرۃ فی نسب النبی وأصحابہ العشرۃ، ج ۲ ص ۱۹۲-۱۹۳

جن کو لوگ اپنے معاملات میں ثالث اور قاضی بنایا کرتے تھے، وہ چار[۴] یہ تھے: عقیل، مخرمہ حویطب اور ابو جہم۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت عقیلؓ کی وفات حضرت معاویہؓ کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی، "تاریخ البخاری الاصغر" میں صحیح سند سے مذکور ہے کہ حضرت عقیلؓ کی وفات حادثہ حرّہ سے پہلے یزید کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی[۱]، اُن کی عمر اُس وقت ۹۶ سال کی تھی[۲]، اُن کا مکان افراد خاندان سے بھرا ہوا تھا، انتقال سے پہلے اُن کی بینائی جاتی رہی تھی، اُن کی اولاد میں بارہ[۱۲] فرزند تھے، جن میں سے نو[۹] صاحبزادے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، اور ان کے ساتھ شہید ہوئے ان میں مسلم ابن عقیلؓ سب سے زیادہ بہادر تھے، اور یہ وہی حضرت مسلم ہیں، جن کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پہلے کوفہ بھیجا تھا، اُن کو ابن زیاد نے ظالمانہ طور پر قتل کرایا[۳]۔

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اُن خوش نصیب لوگوں میں ہیں، جو اسلام ابتداء ہی میں لے آئے تھے، سابقین اوّلین میں اُن کا شمار تھا[۴]، مؤرخین کا بیان ہے کہ مؤاخاۃ کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی مؤاخاۃ حضرت معاذ بن جبلؓ سے کرائی تھی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جعفر بن ابی طالب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل انسان تھے، بخاری میں اُن کے بارے میں

---

[۱] الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ تالیف شہاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی ج ۲ ص ۴۹۴ طبع دار صادر، بیروت [۲] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید ج ۱۱ ص ۲۵۰ دار الفکر طبع سوم ۱۹۷۹ء

[۳] الجوہرہ ج ۲ ص ۱۴۰-۱۴۱ [۴] ابن سعد الطبقات الکبریٰ میں لکھتے ہیں: "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دار الارقم میں داخل ہونے اور عمومی دعوت اسلام دینے سے پہلے جعفر اسلام لے آئے تھے"۔ (ج ۴ ص ۳۴ دار صادر۔ بیروت)

ہے کہ جعفرؓ مسکینوں کے حق میں بہترین انسان تھے، خالد الحذّاء، عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابوہریرہ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد زمین پر چلنے والوں اور گھوڑے پر سوار ہونے والوں میں بہترین شخص جعفر بن ابی طالب تھے[1] یہ روایت صحیح اسناد سے ترمذی اور نسائی میں مذکور ہے، بغوی نے مقبری کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جعفرؓ مسکینوں سے محبّت کرتے، ان کے پاس بیٹھا کرتے، ان کی خدمت کیا کرتے اور وہ لوگ اُن کی خدمت کرتے، ان سے وہ گفتگو کرتے وہ لوگ ان سے باتچیت کرتے (یعنی اُن سے گھُلے مِلے رہتے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو ابوالمساکین کی کُنیّت سے یاد فرمایا کرتے تھے، نیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن سے فرماتے" اشبہت خَلقی وخُلقی" تمھاری مجھ سے شکل وصورت اور عادات وخصائل دونوں میں شباہت ہے۔[2]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، نجاشی (شاہ حبشہ) اور اس کے پیرو کاروں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، غزوۂ خیبر کے بعد جب حضرت جعفرؓ واپس آئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کیا اور اُن کی پیشانی کو چوما اور فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس وقت کس بات کی زیادہ خوشی ہے، جعفرؓ کے آنے کی یا فتح خیبر کی۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے جب کوئی سوال کیا اور انھوں نے نہیں دیا، تو میں نے جعفرؓ کا واسطہ دیا، انھوں نے فوراً دے دیا،

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں

---

[1] یہ عربی طرزِ بیان ہے، مطلب یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جعفر بن ابی طالب سے بہتر آدمی نہ تھا (مترجم) [2] بخاری ومسلم روایت براء بن عازب۔

جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ میں غزوۂ مونہ کے موقع پر بہادرانہ طور پر جنگ کرتے ہوئے اور آگے بڑھ کر مقابلہ کرتے ہوئے شہادت پائی، وہ اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار کفّار کی فوج میں گھس کر کفّار سے مقابلہ کر رہے تھے کہ اس سے اُتر پڑے اور گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں، آگے بڑھے اور جنگ کرتے رہے، اور شہادت سے سُرخ رُو ہوئے، ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں مَیں ان مجاہدین کے ساتھ تھا، جب شہداء کی لاشوں میں تلاش کیا تو جعفرؓ کو اس حال میں پایا کہ سامنے کے جسم (پیشانی، سینہ، پیٹ) پر نوّے سے زیادہ نیزوں اور تیروں کے نشان تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جعفر کو فرشتوں کے ساتھ جنّت میں اُڑتے ہوئے دیکھا ہے، یہ روایت طبرانی میں حضرت ابنِ عباسؓ کی حدیث میں ہے، اور اسی میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کو اس طرح دیکھا کہ وہ ایک فرشتہ ہیں جن کے دونوں بازو خون آلود ہیں، کیونکہ جنگ میں اُن کے دونوں بازو کٹ گئے تھے۔

جیش مونہ جب واپسی میں مدینہ منورہ سے قریب آیا تو باہر نکل کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اُس کا استقبال کیا، بچّے بھی دوڑ کر اُن کے پاس پہونچے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر تھے، آپؐ نے فرمایا بچوں کو اپنی گودوں میں اٹھالو اور جعفرؓ کے بچہ کو مجھے دیدو، چنانچہ عبد اللہ بن جعفرؓ کو لایا گیا آپؐ نے اُن کو اپنی گود میں لے لیا[1]، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت جعفرؓ کی شہادت کی خبر ملی تو چہرۂ مبارک پر غم کے نمایاں اثرات دیکھے گئے[2]، جعفرؓ کے گھر والوں سے فرمایا کہ میرے بھائی کے بچوں کو لاؤ، وہ لائے گئے تو ایسا لگا جیسے چوزے ہوں، آپؐ نے

---

[1] روایت امام احمد بن حنبلؒ [2] الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ا صفحہ ۲۳۷-۲۳۸

حجّام کو بلوایا اور ان بچوں کے سر کے بال اتروائے اور اُن کی ماں سے کہا: کفالت و پرورش کے خوف سے ڈرتی ہو؟ مَیں اِن کا ولی ہوں دنیا اور آخرت دونوں میں[۱]!

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی اہلیہ سے فرمایا: جعفرؓ کے بچوں کو لاؤ، جب وہ سب آگئے، آپؐ نے اُن کو پیار سے سونگھا آپؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، جب حادثۂ وفات کی خبر آپؐ کو ملی تو آپؐ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو[۲]، ان کو ایسی خبر ملی ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ اور کام نہیں کر سکتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر غم کے آثار دیکھے گئے[۳]۔

عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما وہ پہلے شخص ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے ان کی پیدائش سرزمین حبشہ میں ہوئی، آپ کا عرب کے خاص فیّاض و سخی اشخاص میں شمار تھا، اُن کے بھائی محمد بن جعفر اور عون بن جعفر تھے[۴]۔

ہجرت کر کے حبشہ جانے والے مسلمانوں سے جب نجاشی نے پوچھا کہ یہ کون سا مذہب ہے جس کی وجہ سے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور کسی دوسرے مذہب کو بھی قبول نہیں کیا؟ اس موقع پر حضرت جعفرؓ جواب دینے کے لئے اٹھے اور انھوں نے بجائے اپنی طرف سے کچھ کہنے کے جاہلیت کا نقشہ الفاظ میں اس طرح کھینچ دیا کہ ہو بہو اس معاشرہ کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی[۵]، پھر اسلام نے ان لوگوں کی زندگیوں میں جو ایمان لائے،

۱؎ الطبقات الکبریٰ ج ۴ ص ۳۷ ۲؎ اس واقعہ کے بعد سے یہ قاعدہ بن گیا (یعنی جس کے گھر میّت ہو جائے اس کا قریبی عزیز کھانا پہنچائے) ۳؎ سیرت ابن ہشام (مختصراً) روایت سنن الترمذی کی ہے۔ ۴؎ الجوہرہ ج ۲ ص ۴۱-۴۲ ۵؎ حضرت جعفرؓ کا یہ بلیغ و حکیمانہ جواب، سیرت ابن ہشام (ق ا ص ۳۳۴-۳۳۸) میں لفظ بہ لفظ دیکھا جا سکتا ہے۔

کیا انقلاب پیدا کر دیا، اس کو تفصیل سے بتایا اور کسی ایسے پہلو کو نہیں چھیڑا جس سے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلے، اور جس سے اُن لوگوں کے دلوں میں جو مسلمان نہیں تھے، جاہلیت کا تعصّب اور اس کی حمایت کا جذبہ اُبھرے، خاص طور پر اس وقت جب کہ فرماں روائے ملک (جس کے ایوان میں یہ مجلس ہو رہی تھی، اور وہ اُس کے ملک میں پناہ گزیں تھے) نصرانیت کا پیرو اور اس کا پُرجوش داعی تھا، یہ جواب موقع و محل کے نہایت مناسب اور مزاج و نفسیاتِ انسانی کی گہری واقفیت اور ان کی رعایت پر مبنی ہے، اور حضرت جعفرؓ کی ذہانت و بلاغت پر شاہد اور فطرتِ سلیم، عقل و فہم اور حسن کلام کی ان روایات کے مطابق ہے، جس میں قریش قبائل عرب میں اور بنی ہاشم قبیلۂ قریش میں امتیاز خاص اور شہرت عام رکھتے تھے۔

اُمِّ ہانی: ابو طالب کی صاحبزادی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں، ان کا نام فاختہ بتایا گیا ہے بعض لوگوں نے اُن کا نام فاطمہ اور کچھ لوگوں نے ہند بتایا ہے لیکن پہلا نام زیادہ مشہور ہے، ان کی شادی ہُبَیرہ بن عائذ المخزومی سے ہوئی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارے میں فرمایا: تمام عورتوں میں جو اونٹ پر سوار ہوتی ہیں قریش کی عورتیں بہتر ہیں، اور وہ اپنی اولاد کے حق میں سب سے زیادہ شفیق ہیں[1]۔

ابو عمر نے کہا کہ جب مکّہ مکرمہ فتح ہو گیا تو ہُبَیرہ مکّہ سے بھاگ کر نجران چلے گئے اور اس موقع پر چند اشعار کہے جس میں اپنے فرار کا عذر بیان کیا ہے، جب اُن کو خبر ملی کہ اُمّ ہانی ایمان لے آئیں تو اس پر چند شعر کہے، حضرت اُمّ ہانی کے بطن سے ہُبَیرہ کے لڑکے عَمرو تھے، اور اسی نام سے وہ کُنیّت (ابو عَمرو) کرتے تھے۔

فتح مکہ کے دن جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اس دن حضرت

---

[1] اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے بہتر کا مطلب ہے، شریف زادیاں اور آزاد خواتین (مترجم)

اُمّ ہانی نے بنی مخزوم کے دو آدمیوں کو پناہ دے رکھی تھی، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُن کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی، جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا: "مرحبًا وأهلاً بأمّ هانی"، کیا بات ہے؟ اُمّ ہانی نے اُن دو آدمیوں کے متعلق بتایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جن کو تم نے پناہ دی اُن کو میں نے پناہ دی، جن کو تم نے امن دیا ہم نے بھی اُن کو امن دیا ہم اُن دونوں کو قتل نہیں کریں گے" اُمّ ہانی نے بتایا کہ اس روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے مکان پر غسل کیا پھر آٹھ رکعتیں نماز پڑھیں[1]، اُمِّ ہانی سے احادیث مروی ہیں جو صحاح ستّہ اور دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، ترمذی نے کہا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے بعد تک زندہ رہیں[2]۔

جُمانہ: بنت ابی طالب کے بارے میں ابو احمد العسکری نے لکھا ہے کہ یہ ابو سفیان بن الحارث بن عبد المطلب کے لڑکے عبد اللہ کی والدہ تھیں، دارقطنی کی کتاب "الأخوة" میں ہے کہ اُن سے ابو سفیان بن الحارث نے نکاح کیا تھا جن سے عبد اللہ پیدا ہوئے اور کچھ اُن کے متعلق نہیں لکھا ہے، زُبیر بن بکّار نے کہا کہ جُمانہ اُمِّ ہانی کی ہمشیرہ تھیں، ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ فتح خیبر کے بعد غنیمت میں جن کو حصہ دیا گیا تھا اُن میں جُمانہ بھی تھیں، جن کو تیس[3] وسق[3] دیئے گئے، الفاکہی نے "کتاب مکہ" میں عبد اللہ بن عثمان بن خثیم کے واسطہ سے روایت کی ہے میں نے رمضان کی ستائیسویں رات کو عطاء مجاہد اور ابن کثیر اور بہت لوگوں کو دیکھا کہ وہ تنعیم جا کر جُمانہ کے خیمہ سے عمرہ کا احرام باندھتے تھے، یہ ابو طالب کی بیٹی تھیں اُن کے بطن سے ابو سفیان بن الحارث کے بیٹے جعفر بن ابی سفیان پیدا ہوئے اور رسول اللہ

---

[1] "صحیح البخاری باب منزل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح" [2] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ج ۸ ص ۳۱۷-۳۱۸

[3] وسق ساٹھ[6] صاع کا ہوتا ہے اور صاع موجودہ پیمانہ کے مطابق تقریبًا تین کیلو دو سو پچپن گرام کا ہوتا ہے۔

صلے اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے غنیمت میں سے اُن کو تیس[۳] وسق دیئے تھے[۱]۔

ولادت

صحیح روایتوں[۲] کے بموجب سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بعثتِ نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے' ابن سعد کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش رجب کے مہینہ' عام الفیل کے ۳۰ سنہ میں (چھٹی صدی عیسوی) رجب کی بارہ[۱۲] راتوں کے گزرنے کے بعد ہوئی[۳]، حاکم نے حکیم ابنِ حزام کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ تواتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے اور حکیم بن حزام بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے[۴]۔

ابن ابی الحدید نے "شرحِ نہج البلاغہ" میں لکھا ہے :۔

"سیدنا علی علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے کہ کہاں ہوئی تھی شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ اُن کی پیدائش اندرونِ کعبہ ہوئی، محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے' اُن کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے تھے' وہ حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبد العزّیٰ بن قصی ہیں[۵]"۔

---

[۱] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ج ۴ ص ۲۵۹-۲۶۰ [۲] البدایۃ ج ۲ ص ۵۰۔ بعض قرائن اور خود حضرت علیؓ کے ارشاد سے کہ میں نے جب جنگ (بدر) میں شرکت کی ہے تو میری عمر بیس[۲۰] سال سے کم تھی، نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی ولادت بعثت سے چار[۴] یا پانچ[۵] سال پیشتر ہوئی۔ [۳] الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۳ "البدریین" ص ۱۱ اور "مروج الذہب و معادن الجوہر" للمسعودی ج ۲ ص ۳۵۸ [۴] مروج الذہب للمسعودی ج ۲ ص ۲ والنسان العیون فی سیرۃ الامین المامون مشہور "سیرۃ حلبیہ" ج ۳ ص ۴۹۵ مطبعۃ مصطفیٰ البابی مصر طبع اول ۱۹۶۴ء اسی کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "ازالۃ الخفا" میں ترجیح دی ہے (ملاحظہ ہو مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور طبع اول ۱۹۷۶ء) [۵] شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۴

علیؓ مرتضیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کفالت میں

طبری نے اپنی تاریخ میں اپنی سند سے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ اللہ عزوجل کے خصوصی انعامات میں سے، اور جو خیر و برکت ان کے لئے مقدر کر رکھی تھی، اس کا ظاہری سبب یا بہانا یہ ہوا کہ قریش سخت تنگ حالی کی مصیبت سے دوچار ہوئے ابو طالب کثیر العیال تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے جو قریش کے خوشحال لوگوں میں سے تھے کہا: چچا! آپ کے بھائی ابو طالب کثیر العیال ہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ لوگ کن مصائب سے دوچار ہیں، چلئے اُن کا کچھ بوجھ ہلکا کریں، اور اُن کے بال بچوں میں سے کچھ کی پرورش اپنے ذمہ لیں، حضرت عباسؓ نے کہا بہتر ہے، چنانچہ دونوں ابو طالب کی خدمت میں پہنچے اور کہا ہم دونوں اس لئے آئے ہیں کہ جب تک یہ تنگی اور سختی کا زمانہ ہے جس میں سب ہی گرفتار ہیں، اس وقت تک ہم آپ کے بال بچوں کا کچھ بوجھ اپنے ذمہ لے کر آپ کو ہلکا کریں، ابو طالب نے ان دونوں سے کہا: عقیل کو تم لوگ میرے پاس چھوڑ دیجئے باقی کے بارے میں چاہے جو فیصلہ کر لو، چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی ذمہ داری خود لے لی اور حضرت جعفرؓ کی کفالت حضرت عباسؓ نے قبول فرمائی، حضرت علیؓ اس وقت سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہے یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب آپؐ کو اللہ تعالےٰ نے نبی بنا کر مبعوث کیا اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپؐ کا اتباع کیا، آپؐ کی صداقت پر ایمان لائے، اور تصدیق کی، دوسری طرف حضرت جعفرؓ حضرت عباسؓ کی کفالت میں رہے، یہاں تک کہ کفالت کی ضرورت نہیں رہی۔[1]

---

[1] تاریخ الطبری، ج ۲ ص ۳۱۳ (مطبوعہ دار المعارف) ایضاً ابن اسحاق۔

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ

ابن اسحاق کا بیان ہے :۔

”علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایسے وقت آئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں نماز میں تھے، حضرت علیؓ نے کہا: یہ کیا معاملہ ہے؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا، یہ اللہ کا دین ہے جس کو اللہ نے اپنے لئے پسند کیا، اور اسی کے لئے انبیاء کو معبوث کیا ہے میں تم کو بھی خدائے واحد کی طرف بلاتا ہوں جو تنہا معبود ہے، اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، حضرت علی نے کہا: یہ وہ بات ہے جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا' اور میں جب تک ابوطالب سے ذکر نہ کرلوں، کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں کیا کہ جب تک علانیہ دعوتِ اسلام شروع نہ کردیں یہ راز فاش ہو چنانچہ آپؐ نے فرمایا: اگر تم ایمان نہیں لاتے ہو تو اس کو ابھی پوشیدہ رکھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس رات خاموش رہے' اور اللہ تعالےٰ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا، صبح سویرے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: آپؐ نے مجھے کل کیا دعوت دی تھی؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا معبود ہے' اور لات وعُزّیٰ کا انکار کرو اور اللہ کا کسی کو شریک ٹھہرانے سے بَری ہوجاؤ' حضرت علیؓ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام لے آئے' وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ابوطالب سے پوشیدہ آیا کرتے اور اپنے اسلام کو (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حسبِ ہدایت) ظاہر نہیں کیا۔[1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۳ ص ۲۴

ان روایات میں ثابت شدہ اور راجح روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت علیؓ پہلے ایمان لانے والے ہیں، اور (مردوں میں) پہلے شخص ہیں، جس نے نماز پڑھی، زید بن ارقم سے روایت ہے کہ سب سے پہلے ایمان لانے والے علیؓ تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد پہلا شخص جو ایمان لایا وہ حضرت علیؓ تھے، محمد بن عبدالرحمٰن زرارہ کہتے ہیں کہ علیؓ نو ۹ سال کی عمر میں ایمان لائے، مجاہد کہتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی وہ علیؓ تھے، اور اُس وقت اُن کی عمر دس ۱۰ سال تھی، حسن بن زیدؓ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے کبھی بھی بتوں کی پرستش نہیں کی، کیونکہ اُن کی عمر کم تھی[۱]، تمام قرائن یہی بتاتے ہیں، اور یہی بات فطرتِ انسانی اور تجربہ و مشاہدہ کے مطابق ہے، اس لئے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوشِ تربیت میں آنکھ کھولی، اور آپؐ ہی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے، وہ آغوشِ تربیت جس کو منبعِ رسالت بننا تھا، وہ سایۂ عاطفت جس کا سایۂ رحمت ہونا مقدّر تھا، وہ پیغامِ حق جس کو ساری دنیا میں عام ہونا تھا، اُس کی موجودگی میں (اگر کوئی قوی مانع اور فسادِ طبیعت نہ ہو جس سے حضرت علیؓ ہر طرح محفوظ تھے) یہ ایک قدرتی بات تھی کہ وہ سب سے پہلے ایمان لائیں، بعض محققین نے اور مختلف روایات کو یکجا کرنے والے علماء نے اس طرح جمع کیا ہے کہ اہلِ بیت و خواتین میں سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہؓ تھیں، پختہ کار اور پختہ عمر لوگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، اور کم عمر والوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے، اور یہ بات قرینِ قیاس

---

[۱] الطبقات الکبریٰ، ج ۳ ص ۲۱ و اُسد الغابہ لابن اثیر الجزری، ج ۷، ص ۲۱-۴۳

ہے خود حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے انتقال پر انکی اوّلیت کا اظہار و اعتراف کیا ہے جیسا کہ آگے آئیگا۔[1]

حضرت علی اور ابوطالب کے درمیان کیا پیش آیا؟

ابن اسحاق نے بیان کیا: بعض اہلِ علم بیان کرتے ہیں کہ جب نماز کا وقت آتا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی کسی گھاٹی میں جا کر عبادت کرتے، اور آپؐ کے ساتھ علی بن ابی طالبؓ بھی اپنے والد، چچا صاحبان اور تمام افراد خاندان سے چھپ کر جاتے اور تمام نمازیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ادا کرتے، اور شام ہو جاتی گھر واپس آتے، یہ سلسلہ جب تک اللہ کو منظور تھا، جاری رہا، ایک دن جب کہ یہ دونوں نماز پڑھ رہے تھے، ابوطالب نے دیکھ لیا، ابوطالب نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: عزیزمن! یہ کون سا دین ہے جس کی تم پیروی کر رہے ہو؟ آپؐ نے جواب دیا "عمِ محترم! یہ اللہ کا، اللہ کے فرشتوں کا، اس کے پیغمبروں کا، اور ہمارے جدّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے" دوسری روایت کے بموجب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اللہ نے مجھے اپنے بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، اور چچا جان! آپ سب سے زیادہ اس بات کے مستحق ہیں، جن کو مخلصانہ دعوت پیش کی جائے"

---

[1] وہ واقعہ جس میں ذکر ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ" (اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو دین کی دعوت دیجئے) تو آنحضرتؐ نے اولاد عبدالمطلب کو کھانے پر بلایا اور ان کو اسلام کی دعوت دی اس موقع پر صرف سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ نے کھڑے ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا، ابولہب نے انتہائی دریدہ دہنی سے جواب دیا، یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ ابنِ کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ ج۳" میں نقل کی ہیں اور بعض دوسری سیرت کی کتابوں میں بھی مذکور ہیں، اس واقعہ کے بعض الفاظ پر محدثین نے کلام کیا ہے، اور اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں، جن کی صحت یا نقل میں شک کی گنجائش ہے، اس لئے اس روایت کو نظر انداز کیا گیا۔

متعدد مؤرخین کا رجحان یہی ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ جب ایمان لائے ہیں اس وقت آپ کی عمر گیارہ[11] سال کی تھی اور جب ہجرت کی ہے اس وقت آپ چوبیس[24] سال کے تھے۔

(امتاع الاسماع ج ۱ ص۱۷ بحوالہ الواقدی، الطبری، ابن الأثیر اور المقریزی)

ابو طالب نے جواب دیا: اے عزیز! میں اپنے آباء کا مذہب اور اُن کے طور طریق نہیں چھوڑ سکتا، لیکن بخدا جب تک میں زندہ ہوں تم کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ ابو طالب نے اپنے صاحبزادہ علی مرتضیٰ رضؓ سے کہا: اے بیٹے یہ کیا مذہب ہے جس پر تم چل رہے ہو؟ انھوں نے کہا، والد صاحب! میں اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لا چکا ہوں، اور رسول اللہؐ کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہوں، اور اُن کی پیروی کرتا ہوں، راویوں کا خیال ہے کہ اس کے جواب میں ابو طالب نے کہا وہ تم کو اچھی بات ہی کی طرف بلاتے ہیں لہٰذا اس پر قائم رہو۔[1]

اسلام کے متعلق تحقیق و جستجو کے لئے مکّہ آنے والوں کی مدد

جو لوگ حق و صداقت کی جستجو اور اسلام کی طلب میں مکّہ آیا کرتے تھے، اُن کی سیدنا علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہٗ مدد اور رہنمائی فرمایا کرتے تھے، اور انھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہونچایا کرتے تھے، اس کام کے لئے اللہ تعالےٰ نے اُن کو خاص صلاحیت اور ذہانت بخشی تھی، جس میں بنو ہاشم ممتاز تھے، حضرت ابو ذر غفاریؓ کے ایمان لانے کے واقعہ کی امام بخاری نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں:

"ابو ذرؓ کو جب بعثتِ نبوی کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ اس وادی کی طرف سوار ہو کر جاؤ اور اس شخص کے بارے میں پتہ لگاؤ، جو اپنے آپ کو اللہ کا نبی کہتا ہے، اور اس کو یقین ہے کہ اُس کے پاس آسمان سے اطلاع آتی ہے، اُن کی باتیں سنو اور مجھے آکر بتاؤ، یہ صاحب (ابو ذرؓ کے بھائی) چلے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۶۴

خدمت میں پہونچے، اور آپؐ کی باتیں سنیں، اور واپس آکر ابوذرؓ سے بتایا کہ میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ شریفانہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، اور ایسی بات کرتے ہیں جو شاعری نہیں ہے، ابوذر نے کہا: میں جو معلوم کرنا چاہتا تھا، وہ تم نہ بتا سکے، پھر انھوں نے خود زادِ راہ تیار کیا، اور پانی کا ایک مختصر سا مشکیزہ لیا اور مکہ پہنچ گئے، حرم شریف آئے، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانتے نہیں تھے، (اندازہ وقیافہ سے) آپؐ کو تلاش کرتے رہے، یہاں تک کہ رات ہوگئی، اور وہ لیٹ گئے، حضرت علیؓ نے اُن کو دیکھ کر اندازہ کرلیا کہ یہ کوئی باہر سے آنے والے شخص ہیں، وہ اُن کے پیچھے پیچھے چلے مگر کوئی دوسرے سے بات نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، ابوذر اپنا زادِ راہ اور پانی کا مشکیزہ مسجدِ حرام میں لے آئے اور پورا دن گزار دیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کی ملاقات نہیں ہوئی، پھر شام آئی، رات ہوگئی، ابوذر پھر لیٹ گئے، حضرت علیؓ اُن کے پاس سے گزرے اور فرمایا: کیا ابھی تک اس شخص کو اپنے ٹھکانہ کا پتہ نہیں چلا کہ وہاں جا کے ٹھہرے، پھر اُن کو اپنے ساتھ لے کر چلے مگر اب تک ایک دوسرے سے کچھ پوچھتا نہیں تھا، تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، اور حضرت علیؓ اُن کے ساتھ ٹھہرے رہے، بالآخر حضرت علیؓ نے کہا: کیا آپ بتائیں گے کہ یہاں کیسے آنا ہوا؟ کہا اگر تم عہد کرو اور مجھے قول دو کہ تم میری رہبری کروگے تو بتاؤں، حضرت علیؓ نے یہ شرط قبول کی اور فرمایا کہ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ ابوذر نے بتا دیا، حضرت علیؓ نے کہا یقیناً وہ حق بات ہے، اور بلاشبہ وہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں، جب صبح کو نیند سے بیدار ہونا تو میرے ساتھ چلنا، راستہ میں اگر میں نے کوئی خطرہ کی بات دیکھی تو رک جاؤں گا، جیسے استنجے کے لئے ٹھہر گیا ہوں، اور اگر چلتا رہوں تو میرے ساتھ ساتھ چلے آنا، اور جہاں میں جاؤں تم بھی جانا، ابوذر نے ایسا ہی کیا، حضرت علیؓ کے پیچھے پیچھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہوئے، آپؐ کی بات سنی اور اسی وقت اور اسی جگہ ایمان لے آئے۔"[1]

انتہائی اعزاز

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ایک دن ہم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے نکلے اور کعبہ کے در پر آئے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور میرے کاندھوں پر پیر رکھ کر اونچے ہوئے اور کہا کہ کھڑے ہو جاؤ، میں کھڑا ہوا مگر میری کمزوری کو آپؐ نے محسوس فرمالیا، فرمایا بیٹھ جاؤ، پھر خود آپؐ بیٹھ گئے اور مجھ سے کہا کہ میرے کاندھوں پر سوار ہو جاؤ، جب ایسا کیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے لئے ہوئے کھڑے ہوئے تو مجھے ایسا لگا کہ اتنا اونچا ہو رہا ہوں کہ آسمان کی بلندی تک پہنچ جاؤں گا، میں اس طرح کعبہ کی چھت پر پہونچ گیا، اور وہاں جو پیتل یا تانبے کا بنا ہوا بُت رکھا ہوا تھا، اس کو میں داہنے بائیں موڑنے لگا اور آگے پیچھے جھکانے لگا یہاں تک کہ اس کو اپنے قابو میں لے آیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو گرا دو میں نے گرایا تو وہ ایسا چور چور ہو گیا جیسے شیشے کے بنے ہوئے برتن، پھر وہاں سے اُترا اور ہم دونوں (میں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تیز قدم چلتے ہوئے گھروں کے پیچھے آگئے کہ کہیں کوئی ہمیں دیکھ نہ لے"۔

جیسا کہ مستدرک للحاکم میں ہے یہ بات واضح ہے کہ یہ قصہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔[2]

---

[1] الجامع الصحیح للامام البخاریؒ باب اسلام أبی ذرؓ کتاب مناقب الأنصار (مطبعہ مصطفےٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۳ء)

[2] امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یہ حدیث نقل کی ہے (ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۶۴۴-۶۴۵ تحقیق احمد محمد شاکر مطبوعہ دار المعارف مصر) امام بخاری فی التاریخ، وابن ماجہ، والحاکم والنسائی فی الخصائص۔

(باقی ص ۵۸ پر)

ہجرت

قریش اور قبائل عرب کو اسلام کی دعوت دینے کا سلسلہ جاری رہا، دوسری طرف قریش کی دشمنی اور مخالفت بھی پورے شباب پر تھی، اور واقعات کا تسلسل قائم رہا، بنوہاشم کا مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) اور ان کا شعب ابی طالب میں پناہ گزیں ہونا حضرت جعفر بن ابی طالب اور بہت سے مسلمانوں کا حبشہ کی طرف ہجرت کر کے جانا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طائف جاکر دعوتِ حق دینا، اور وہاں کے لوگوں کی بدزبانی اور بدسلوکی کا واقعہ، اسراء و معراج کا واقعہ، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت عمر بن الخطاب کا اسلام میں داخل ہونا، اور اہلِ مکہ اور باہر سے آنے والوں میں جن لوگوں کے قلوب اللہ تعالےٰ نے ایمان کے لئے کھول دیئے اُن کا ایمان لانا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدافعت کرنے والے اور اُن کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہنے والے ابوطالب کی وفات ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات اور قریش کی روز افزوں سختیاں اور ایذا رسانی اور دشمنی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنا جن کی کوئی حد نہیں اور اس دوران قبیلہ قحطان یثرب کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج کا ایمان لانا، پھر بیعت عقبہ اولی اور ثانیہ کے واقعات، مدینہ میں اسلام پھیلنا

(باقی ص۵۷ کا) بعض متاخر سیرت نگاروں کو وہم ہوا ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے، علامہ برہان الدین الحلبی (ولادت ۹۷۵ وفات ۱۰۴۴) اپنی مشہور کتاب "السیرۃ الحلبیۃ" میں لکھتے ہیں کہ "حضرت علیؓ کا یہ کہنا" ہم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دوڑتے ہوئے واپس آئے اس ڈر سے کہ کوئی قریش کا آدمی دیکھ نہ لے" بتاتا ہے کہ یہ فتح مکہ کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔" (ج ۳ ص۳۰)

بہت سے مسلمانوں کا یثرب کی طرف ہجرت کرنا، یہاں تک کہ مکہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؓ حضرت ابوبکر ابن ابی قحافہ کے علاوہ صرف وہی مسلمان رہ گئے جو یا تو محبوس تھے، یا کسی مصیبت میں گرفتار تھے، اور قریش کو کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ نہ چلے جائیں، ان تمام واقعات کی تفصیل آسان بھی نہیں ہے، اور حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سوانح میں مکمل طور پر ذکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ ان تفصیلات کی جگہ سیرت کی کتاب ہے، جو اپنی جگہ پر ایک دریائے بے کنار ہے۔[1]

بہر حال یہی حالات تھے کہ بالآخر قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور اس تجویز پر سب متفق ہو گئے کہ ہر قبیلہ سے ایک مضبوط اور باہمت آدمی لیا جائے اور یہ سب مل کر اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وار کریں کہ سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں، اس طور پر خون کی ذمہ داری تمام قبائل پر ہوگی، اور عبد مناف تمام قبائل سے خون کا بدلہ لینے کے لئے جنگ کرنے کی ہمت نہیں کریں گے، اس تجویز کو سب نے منظور کیا اور مجلس برخاست ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سازش سے آگاہ کر دیا اور آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور فرمایا: "تم کو کوئی بھی گزند نہیں پہونچا سکیگا" یہ بات آسان نہ تھی، اور کوئی بھی اُن کی جگہ ہوتا اس کی پلک سے پلک نہ لگتی اِلّا یہ کہ اس درجہ کا ایمان اللہ پر مضبوط ہوتا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس درجہ اُلفت وجاں سپاری کا تعلق رکھتا ہوتا، اور آپؐ کی بات پر اس کو کامل یقین اور مکمل اعتماد ہوتا، اور وہ خود اپنے آپ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان کرنے کا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مؤلف کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" عربی ص ۱۳۰-۱۵۹ یا "نبی رحمت" (اردو)

جذبہ رکھتا ہوتا جس درجہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تھا، کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کو جب پتہ لگے گا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اُن کے ہاتھ سے نکل گئے تو وہ اپنی تسکینِ نفس کی خاطر اُن کی جگہ پر لیٹے ہوئے شخص کی بوٹی بوٹی کر دیں گے۔

لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان باتوں کو خاطر میں نہیں لائے اور بسترِ رسول (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) پر لیٹ گئے اور گہری نیند سو گئے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مکان کے دروازے پر دشمن اکٹھا ہو گئے، یکبارگی حملہ کرنے کا منصوبہ تھا جس کے لئے سب تیار تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک مٹھی بھر خاک اپنے ہاتھ میں لی، اور گھر سے باہر آگئے، اللہ تعالےٰ نے کفّارِ قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، آپؐ اس خاک کو اُن کے سروں پر پھینکتے ہوئے نکل گئے، اس وقت آپؐ سورۂ یٰسین اس آیت تک پڑھ رہے تھے "فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ"[2]۔

آپؐ جب جا چکے تو کسی آنے والے نے کفّار کے مجمع کو مخاطب کر کے کہا تمھیں کس کا انتظار ہے؟ بولے محمدؐ کا، اُس نے کہا، اے نامُرادو! وہ تو نکل چکے اور اپنے کام پر روانہ ہو گئے، لوگوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو حضرت علیؓ بستر پر نظر آئے، اُن کو یقین ہو گیا کہ یہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں، مگر جب صبح ہوئی تو حضرت علیؓ اس پر سے اُٹھے اور لوگ ناکام و بے نیل مرام واپس گئے۔[3]

---

[1] اس موقع کا ایک مناسب شعر اس لائق ہے کہ نقل کر دیا جائے (مترجم)

بسترِ احمدؐ، شبِ ہجرت یہ دیتا ہے صدا　　اے علیؓ! مَردوں کو یوں ہی بند آنا چاہئے

[2] سورۂ یٰسین آیت ۹ ترجمہ "ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو ان کو کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔"　[3] سیرت ابن ہشام، ج ۱ صفحہ ۴۸۰-۴۸۳

ابن سعد، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کی نیت سے مدینہ تشریف لے گئے تو مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کے بعد یہاں ٹھہرا رہوں تاکہ وہ امانتیں جو لوگوں کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھیں وہ سب اُن کے مالکوں کو پہنچا دوں (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لوگ اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے، اور آپؐ کو امین کہتے تھے) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد تین روز رہا، میں لوگوں کے سامنے آتا جاتا، میں ایک دن بھی غائب نہیں رہا، ان تین دنوں کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جس راستہ سے گئے تھے، اس پر چلتا ہوا میں بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں پہونچا، وہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے تھے، میں بھی کلثوم بن الہدم کے مکان پر پہنچا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام فرمانے کی جگہ تھی[1]۔

حضرت علیؓ راتوں کو چلا کرتے، اور دن کو کہیں چھپ رہتے، اس طرح مدینہ پہنچے، آپؐ کے پاؤں پھٹ گئے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علیؓ کو بلاؤ، لوگوں نے عرض کیا وہ چل نہیں سکتے، آپؐ خود اُن کے پاس تشریف لے گئے، گلے سے لگایا، اور اُن کے پیر کے ورم کو دیکھ کر رو پڑے، پھر اُن پر لعابِ دہن لگایا، اور دست مبارک اُن کے پیروں پر پھیرا، جس کا اثر یہ تھا کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے دن تک پھر کوئی پیروں کی تکلیف نہیں ہوئی[2]۔

---

[1] کنز العمال ج ۸ ص ۳۳۵ مطبعہ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد طبع اول ۱۳۱۲ھ۔

[2] الکامل لابن الاثیر ج ۲ ص ۷۵ دار صادر بیروت ۱۳۹۹ھ۔

حضرت علیؓ کی مدینہ میں آمد ربیع الاول کے وسط میں ہوئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تک قباء سے نہیں نکلے تھے۔[1]

---

[1] الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۲۲

باب دوم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینہ میں

ہجرت سے وفات تک

شادی، معیشت، غزوات میں کارنامے، جنگی مہارت اور خداداد حربی کمالات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وشفقت اور مکمل اعتماد

مؤاخاۃ

ابن سعد کی "الطبقات الکبریٰ" میں مذکور ہے :۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالبؓ اور سہل بن حُنیفؓ کے درمیان بھائی چارگی (مؤاخاۃ) کا تعلق قائم کیا۔[1]

ابن کثیر نے بیان کیا :۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اور سہل بن حُنیفؓ کے درمیان مؤاخاۃ کرائی، ابن اسحاق نیز متعدد سیرت ومغازی کے مؤلفین نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کی مؤاخاۃ خود اپنی ذات سے قائم کی، اس سلسلہ میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں، جن میں چند احادیث کی اسناد ضعیف ہیں، اور بعض احادیث کے متن میں بھی کمزوری ہے۔[2]

سُنن الترمذی میں جو روایت ہے اُس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مؤاخاۃ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے قائم کی، اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن کا درجہ دیا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "ازالۃ الخفاء" اور "تنویر العینین" دونوں میں اس روایت کو ترجیح دی ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کا عقد

ہجرت کے دوسرے سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کر دیا، اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا، "میں نے تمھارا نکاح اپنے اہلِ بیت کے بہترین فرد سے کر دیا ہے" پھر اُن کو دعائیں دیں، اور اُن دونوں پر پانی چھڑکا۔[3]

---

[1] الطبقات الکبریٰ، ج ۳ ص ۲۳ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۲۲۶-۲۲۷ [3] ازالۃ الخفاء ص ۲۵۴

ابو عمر عبید اللہ بن محمد بن سماک بن جعفر الہاشمی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رض کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے غزوۂ اُحد کے بعد کیا، حضرت فاطمہ رض کی عمر اس وقت ۱۵ سال اور ساڑھے پانچ ماہ تھی، اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی عمر اکیس ۲۱ سال اور پانچ ماہ تھی[1]۔

اس سلسلہ کی مفصل حدیث مسندِ علی میں ہے کہ حضرت علی رض نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں خطبہ کیوں کر پیش کیا، فرماتے ہیں:۔

"میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اُن کی صاحبزادی سے نکاح کا پیغام دینا چاہا تو دل میں کہا کہ کس طرح پیغام دوں جب کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، پھر میں نے آپ کے اس تعلق کو سوچا جو مجھ سے رہا ہے، اور آپ کی شفقت و محبت کا خیال آیا تو ہمت بندھی اور میں نے یہ پیغام دے دیا، فرمایا (آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) تمہارے پاس کچھ ہے؟ عرض کیا نہیں، فرمایا: میں نے فلاں موقع پر تم کو جو حطمیہ نام کی زرہ دی تھی وہ کہاں ہے؟ عرض کیا، وہ میرے پاس ہے، فرمایا یہی اس (یعنی فاطمہ رض) کو دے دو چنانچہ

---

[1] محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس روایت کے قبول کرنے میں تردد ہے کیونکہ غزوۂ اُحد ۳ھ کے شوال میں ہوا اور غزوۂ اُحد ہی کے موقع پر حضرت علی رض نے حضرت فاطمہ رض سے فرمایا تھا: "اغسلی عنی الدم" "میرے جسم سے خون کے داغ صاف کردو، جب تک نکاح نہ ہو چکا ہو یہ کیونکر ممکن ہے؟" (ازالۃ الخفاء ص ۲۵۴)

صحیح بات بھی یہی ہے کہ اس غزوہ سے پہلے ان کا نکاح ہو چکا تھا، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ بات تاریخی طور پر مسلّم ہے کہ حضرت حسن رض کی ولادت وسط شعبان (اور ایک قول کے مطابق رمضان) ۳ھ ہجری میں ہوئی (تاریخ دمشق لابن عساکر اور دوسری مستند کتب تاریخ) اس لئے غزوۂ اُحد کے بعد جو شوال ۳ھ ہجری میں پیش آیا، نکاح کی روایت کسی طرح صحیح اور قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

میں نے وہ درع اُن کو دے دی (یعنی مہر کے طور پر[1])۔

عطاء بن السائب اپنے والد سے اور وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو ایک دبیز چادر میں رخصت کیا اور جہیز میں ایک مشکیزہ، ایک چمڑہ کا تکیہ جس میں اذخر کی چھال بھری تھی[2] عطا فرمایا۔

سیدنا علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی معاشی حالت

علیؓ و فاطمہؓ (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھے) اور رسولؐ (جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب تھے) کی معیشت انتہائی سادہ، سخت کوشی صبر و مشقت کی معیشت تھی، ہنّاد عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے بہتیرے دن گزر گئے کہ ہمارے گھر میں کوئی چیز کھانے کی نہ تھی، اور نہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ تھا، اسی زمانہ میں ایک بار باہر نکلا تو راستہ میں ایک دینار پڑا ہوا دیکھا میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا، اور پھر دل میں سوچتا رہا کہ اس کو اٹھاؤں یا چھوڑ دوں لیکن افلاس کی یہ شدّت تھی کہ یہی طے کیا کہ اس کو اٹھا لوں، چنانچہ اس کو لے لیا اور ان شتربانوں کو دیا جو باہر سے غلّہ لے کر آئے تھے، اور اس سے

---

[1] مسند الامام احمد بن حنبل، مسند علی بن ابی طالب۔

قابلِ وثوق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہؓ سے شادی کے موقع پر سامان خریدنے اور جہیز تیار کرنے کے سلسلہ میں مدد کی جس کا اعتراف خود علماء و مؤرخین شیعہ نے کیا ہے (ملاحظہ ہو "الامالی" شیخ ابی جعفر الطوسی صفحہ ۳۹، ج ۱ مطبوعہ جدید نجف اشرف عراق وغیرہ) [2] مسند الامام احمد بن حنبل، مسند علی بن ابی طالب (اذخر ایک خوشبودار گھاس کو کہتے ہیں جو عرب میں پائی جاتی تھی۔)

آٹا خرید لیا، فاطمہؓ کو دیا کہ اس کو گوندھ کر روٹیاں پکالو، وہ گوندھنے لگیں مگر فاقہ کی وجہ سے اتنی کمزور تھیں کہ آٹا گوندھنے میں ہاتھ بار بار برتن پر گرجاتا اور چوٹ لگتی، بہرحال کسی طرح انھوں نے آٹا گوندھ کر روٹی پکائی، اور میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ واقعہ بتایا، فرمایا: "اس کو کھالو، اللہ نے تمھیں یہ رزق بہم پہونچایا ہے"[1]۔

اور ہناد الدینوری الشعبی نے ایک حدیث نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا: "میں نے فاطمہ بنت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کیا تو میرے یا اُن کے پاس ایک مینڈھے کی کھال کے سوا کوئی بستر نہ تھا، اسی پر رات کو سوتے اور اسی میں دن کو اپنی بکری کو چارہ دیتے، اس کے علاوہ ہمارے یہاں کوئی خادم نہ تھا"[2]۔

طبرانی نے معتبر اسناد (اسناد حسن) سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس آئے اور فرمایا میرے بچے کہاں ہیں؟ (یعنی حسن اور حسین رضی اللہ عنہما) حضرت فاطمہؓ نے کہا، آج ہم لوگ صبح اٹھے تو گھر میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جس کو کوئی چکھ سکے، اُن کے والد نے کہا میں ان دونوں کو لے کر باہر جاتا ہوں، اگر گھر پر رہیں گے تو تمھارے سامنے روئیں گے اور تمھارے پاس کچھ ہے نہیں کہ کھلا کر خاموش کرو، چنانچہ وہ فلاں یہودی کی طرف گئے ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں تشریف لے گئے، دیکھا یہ دونوں بچے ایک صراحی سے کھیل رہے ہیں، اور اُن کے سامنے بچا کھچا ادھ کٹا قسم کا کچھ کھجور ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا علی! اب بچوں کو گھر لے چلو، دھوپ بڑھ رہی ہے، انھوں نے کہا یا رسول اللہ آج صبح سے ہمارے گھر میں

---

[1] کنز العمال للعلامہ علی المتقی برہانپوری، ج ۷، ص ۳۲۸، یہ روایت ابوداؤد نے سہل بن سعد سے ایک طویل حدیث میں نقل کی ہے۔ ج ۱ ص ۲۴۰

[2] کنز العمال ج ۷، ص ۱۳۳

ایک دانہ نہیں ہے تو اگر آپؐ یا رسول اللہ تھوڑی دیر تشریف رکھیں تو میں فاطمہؓ کے لئے کچھ بچے کھچے کھجور جمع کر لوں، یہ سُن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم بیٹھ گئے، یہاں تک کہ فاطمہؓ کے لئے کچھ بچے ہوئے کھجور جمع ہو گئے، حضرت علیؓ نے کھجور ایک کپڑے میں باندھ لئے، اور بڑھ کر دونوں کو گود لیا اور اُٹھا کر لے آئے[1]۔

امام بخاری حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں کہ "حضرت فاطمہؓ چکی پیستے پیستے پریشان ہو گئی تھیں، ان کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس کچھ قیدی غلام آئے ہیں، حضرت فاطمہؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں مگر آپؐ تشریف نہیں رکھتے تھے، انھوں نے حضرت عائشہؓ سے یہ بات کہہ دی، حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کیا، آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے، اور ہم لوگوں کے سونے کی جگہ تک آگئے ہم لوگ اُٹھنے لگے تو فرمایا اپنی جگہ پر رہو، اس وقت میں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قدم مبارک کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر محسوس کی پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں نے جس چیز کی خواہش کی ہے کیا اس سے بہتر چیز تم کو بتا دوں؟ جب تم سونے کو جانے لگو تو ۳۴ بار اَللّٰہُ اَکْبَر ۳۳ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور ۳۳ بار سُبْحَانَ اللّٰہ پڑھ لیا کرو، یہ چیز تم دونوں کے لئے اس سے زیادہ کار آمد ہو گی جس کا تم نے سوال کیا ہے"[2]۔

اور ایک روایت میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: میں اہلِ صُفّہ کو چھوڑ کر جن کے بھوک سے پیٹ میں بل پڑ رہے ہیں،

---

[1] الترغیب و الترہیب للمنذری ج ۵ ص ۱۷۱ مصطفےٰ البابی الحلبی مصر۔ طبع دوم ۱۹۵۴ء۔

[2] بخاری کتاب الجہاد، باب الدلیل علی ان الخمس لنوائب رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم۔

تمھیں نہیں دوں گا، میرے پاس اُن کے اخراجات کے لئے کچھ نہیں ہے، لیکن ان غلاموں کو فروخت کر کے اُن کی قیمت ان اہلِ صُفّہ پر خرچ کروں گا۔"[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راحت رسانی کے لئے مشقّت

اس تنگی اور فقر و فاقہ کی زندگی کے باوجود حضرت علیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راحت رسانی اور آپؐ کو دعوت اِلی اللہ اور جہاد کے لئے یکسو رکھنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

ابن عساکر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، فرمایا:۔

"ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر فاقہ تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ معلوم ہوا تو وہ کسی مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے تاکہ اس سے اتنا مل جائے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت پوری ہو جائے، اس تلاش میں ایک یہودی کے باغ میں پہنچے اور اس کے باغ کی سینچائی کا کام اپنے ذمہ لیا، مزدوری یہ تھی کہ ایک ڈول پانی کھینچنے کی اُجرت ایک کھجور، حضرت علیؓ نے سترہ[۱] ڈول کھینچے، یہودی نے انھیں اختیار دیا کہ جس نوع کی کھجور چاہیں لے لیں، حضرت علیؓ نے سترہ[۱] عجوہ[۲] لے لئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا، فرمایا: جناب یہ کہاں سے لائے؟[۳] حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے

لہ روایت احمد (فتح الباری ج ۷، ص۲۳-۲۴) حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے، ملاحظہ ہو مسند علی فی مسند الامام احمد بن حنبل۔ ۲ عجوہ مدینہ کی اچھی اور لذیذ کھجور شمار ہوتی ہے اور اب بھی اس کو لوگ تبرّکاً اور بہتر سمجھ کر لاتے ہیں۔ ۳ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابوالحسن یہ کہاں سے لائے، مگر کنیّت سے مخاطب کرنے کا مطلب اعزاز و احترام ہوتا ہے جو کبھی چھوٹوں سے بھی بطور شفقت کہا جاتا ہے اس لئے اس کا ترجمہ "جناب سے" کیا گیا۔ (مترجم)

عرض کیا، یا نبی اللہ! مجھے پتہ لگا کہ آج فاقہ درپیش ہے، اس لئے کسی مزدوری کی تلاش میں نکل گیا تھا کہ کچھ کھانے کا سامان کرسکوں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبّت نے اس پر آمادہ کیا تھا؟ عرض کیا: ہاں، یا رسول اللہ!! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول سے محبّت کرنے والا ایسا کوئی نہیں ہے جس پر افلاس اس تیزی سے نہ آیا ہو جیسے سیلاب کا پانی اپنے رُخ پر تیزی سے بہتا ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبّت کرے اس کو چاہیئے کہ مصائب کے روک کے لئے ایک چھتری بنالے، یعنی حفاظت کا سامان کرے۔[1]"!

دُلار اور شفقت کا نام

غائت محبّت اور دُلار سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؓ کو ابو تراب کہا کرتے تھے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ "ایک بار حضرت علیؓ سیّدہ فاطمہؓ کے پاس گئے، پھر واپس آکر مسجد میں لیٹ گئے، ادھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرۂ فاطمہؓ کی طرف آگئے اور حضرت فاطمہؓ سے پوچھا تمھارے ابن عم کہاں ہیں؟ کہا مسجد میں، آپؐ مسجد تشریف لائے تو دیکھا کہ چادر اُن کی پشت سے اُتر گئی ہے، اور پیٹھ میں مٹّی لگ گئی ہے، آپؐ اپنے دست مبارک سے اُن کی پُشت پر لگی ہوئی مٹّی کو صاف کرنے لگے اور دو[2] مرتبہ فرمایا: "اجلس یا أبا تراب" بیٹھ جاؤ اے ابو تراب[2] (ابو تراب کا لفظی ترجمہ خاک آلود کیا جاسکتا ہے)

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۳۲۱ (آخری جملہ مصائب کی روک یا مصائب سے بچاؤ کے لئے ایک مضبوط چھتری بنالے، عربی لفظ ہے "فلیعد للبلاء تجفافا" تجفاف (ت کو کسرہ) جنگی پیراہن ہے جو گھوڑے کو پہنایا جاتا ہے، یا انسان پہن لیتا ہے کہ نیزوں یا تیر کا اثر جسم پر نہ پڑے، جیسے زرہ یا خود۔

[2] صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب علی بن ابی طالب القرشی الہاشمی۔

غزوۂ بدر الکبریٰ اور اس غزوہ میں حضرت علیؓ کے کارنامے

رمضان ۲ھ میں جنگ بدر ہوئی، یہ وہ فیصلہ کُن معرکہ تھا جس نے اُمّتِ اسلامیہ اور دعوتِ اسلامی کے لئے راستہ ہی صاف نہیں کیا بلکہ تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس معرکہ میں قدم رکھا، اور لوگوں کو سامنے آکر مقابلہ کرنے کی ترغیب دی تو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے عُتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ اور اس کا بیٹا ولید نکلا جب دونوں فریق آمنے سامنے آگئے تو کفّار نے پوچھا، تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے جواب دیا انصار کی ایک جماعت، کہنے لگے تم اچھے لوگ ہو اور ہمارے مقابل کے ہو مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بھائیوں (رشتہ داروں) کو سامنے لاؤ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کی بہ نسبت اس سے زیادہ واقف تھے کہ یہ قریشی شہسوار کیسے آزمودہ کار اور جنگ میں کس پایہ کے لڑنے والے اور سورما سمجھے جاتے ہیں، یہی وہ لوگ تھے، جن کی طرف جنگ کے موقع پر نگاہیں اُٹھا کرتی تھیں، فنونِ سپہ گری اور شہسواری کے ماہر تھے، آپؐ نے مقابلہ آزما قریشیوں کی فرمائش سن کر فرمایا: حمزہ اٹھو! علی اٹھو! عبیدہ[2] اٹھو! یہ تینوں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خونی رشتہ کے لحاظ سے قریب ترین افراد تھے، اور سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھے، آپؐ اُن کو عزیز رکھتے تھے، مگر خطرہ کا وقت اور نازک موقعہ آیا تو اپنے عزیزوں کو دوسروں کے مقابلہ میں

---

[1] اس جنگ کی تفصیلات سیرت کی تمام کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، مؤلف کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" ص۲۱۵-۲۲۸ ملاحظہ ہو۔

[2] ان کا پورا نام عبیدۃ بن الحارث بن المطلب بن عبد مناف ہے۔

پہلے بڑھایا، یہ لوگ میدان میں اترے تو کفار نے کہا: ہاں یہ لوگ ہمارے جوڑ کے ہیں، اور ہم نسب ہیں، حضرت عبیدہؓ نے جو عمر میں سب سے بڑے تھے، عتبہ کو، حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو اور حضرت علیؓ نے ولید بن عتبہ کو للکارا، حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے مقابل کے سورماؤں کا پہلے ہی وار میں کام تمام کر دیا، اور دوبارہ لوٹ کر ان دونوں نے عتبہ کو نمٹایا، اور حضرت عبیدہ جو گھائل ہو گئے تھے، اُن کو اُٹھا کر لے آئے، حضرت عبیدہؓ اُن زخموں سے جانبر نہ ہو سکے، اور شہید ہو گئے۔[1]

"الطبقات الکبریٰ" لابن سعد میں قتادہ سے روایت ہے کہ "حضرت علی بن ابی طالبؓ جنگِ بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے حامل تھے"[2] الحافظ ابن عساکر نے کہا: "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنی تلوار ذوالفقار حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دی اور اس جنگ کے بعد اُن کو ہمیشہ کے لئے بخش دی"[3]۔

غزوۂ اُحد

ہجرت کے تیسرے سال شوال میں غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا[4]، اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کی مدد کی، اور اس کا وعدۂ نصرت پورا ہوا، مشرکین کے پیر اکھڑ گئے، عورتیں اپنی جانوں کی خیر مناتی بھاگیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیر اندازوں کا امیر عبداللہ بن جبیر کو بنایا تھا، اُن تیر اندازوں کی تعداد پچاس[5] تھی، اُن کو ہدایت دی گئی تھی کہ اپنی جگہ سے

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۶۲۵ [2] الطبقات الکبریٰ، ج ۳ ص ۲۳

[3] تفصیلی حالات کتب سیرت میں دیکھے جائیں، مصنف کی کتاب "السیرۃ النبویہ" (ص ۲۲۹-۲۴۶) میں بھی ضروری تفصیل ملے گی۔ [4] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۴ ص ۴۷

کسی حال میں نہ ٹلیں، اور اس طرف سے آنے والے دشمنوں کا تیروں سے مقابلہ کریں، تاکہ وہ پیچھے سے حملہ آور نہ ہو سکیں، خواہ جیت رہے ہوں یا میدان دشمنوں کے ہاتھ جا رہا ہو، حکم یہ دیا کہ اپنی جگہ سے کسی حال میں نہ ٹلیں خواہ یہ دیکھیں کہ پرندوں نے فوج پر یلغار کی ہے۔

لیکن جب مشرکوں کو شکست ہو گئی اور وہ بھاگنے لگے یہ تیر انداز اپنی جگہ چھوڑ کر لشکرِ کفّار پر ٹوٹ پڑے کیونکہ اُن کو جنگ جیت لئے جانے کا یقین تھا، اور چلّانے لگے، لوگو آؤ غنیمت لے لو، لوگو آؤ مالِ غنیمت لے لو حضرت عبداللہ بن جُبیر جو اُن کے امیر تھے، انھوں نے ان تیر اندازوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت یاد دلائی، مگر انھوں نے نہیں سنا، اور سمجھے کہ اب مشرکوں کے واپس آنے کا کوئی سوال نہیں ہے، مگر دشمن گھات میں تھا، جیسے ہی مورچہ خالی دیکھا کفّار یکبارگی ٹوٹ پڑے اور پشت کی جانب سے حملے شروع کر دیئے یہی نہیں بلکہ بآوازِ بلند اعلان کرنے لگے کہ " أَلا إِنَّ محمداً قد قُتِل " یعنی محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہید ہو گئے، مسلمانوں کے پیر اکھڑ گئے، اور دشمن نے لَوٹ کر دوبارہ وار کرنا شروع کر دیا، اور ان کو موقع غنیمت مل گیا، مسلمانوں کی فتح مندی شکست کی صورت اختیار کر گئی، اسی دوران دشمنوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کا موقع مل گیا، اور ایک پتھر آپؐ پر بھرپور پڑا، جس سے نیچے کا ایک دندان مبارک شہید ہو گیا[1]، سر مبارک پر چوٹ آئی جس سے خون بہنے لگا، ہونٹ پر زخم لگے، مسلمانوں کو پتہ نہ چل سکا کہ آپؐ کس جگہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپؐ کے ہاتھ کو سہارا دیا اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے اٹھایا اور آپؐ اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے، حضرت مالک بن

---

[1] علامہ محمد طاہر پٹنی کی کتاب "مجمع بحار الانوار" میں ہے کہ دندان مبارک پورے طور پر شہید نہیں ہوا تھا، اس کے اوپر کا سرا جدا ہو گیا تھا۔

سنان نے آپؐ کے چہرۂ مبارک کے خون کو چاٹ کر صاف کیا۔[1]

امام بخاری سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں، اُن سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زخمی ہونے کی کیفیت دریافت کی گئی تھی، فرمایا کہ کون رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زخموں کو دھو رہا تھا، کون پانی ڈال رہا تھا، اور آپؐ کو کیا دوا دی گئی، مجھے یہ سب یاد ہے، فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم آپؐ کے زخموں کو دھو رہی تھیں، اور علیؓ اپنی ڈھال میں پانی لے کر دے رہے تھے، جب فاطمہؓ نے یہ دیکھا کہ پانی سے خون رکنے کے بجائے اور تیز ہو رہا ہے تو چٹائی کا ایک کنارہ نوچ کر اس کو جلا ڈالا اور اس کو سر مبارک کے مجروح حصّہ میں چپکا دیا، تو خون رُک گیا۔[2]

ابن کثیر کہتے ہیں: "حضرت علیؓ غزوۂ اُحد میں موجود تھے، لشکرِ اسلام کا میمنہ سنبھالے ہوئے تھے اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کی شہادت کے بعد علَم آپ ہی نے اپنے ہاتھ میں لیا، اور اُحد کے موقع میں سخت جنگ کی، لاتعداد مشرکوں کو ٹھکانے لگایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چہرۂ مبارک سے بہتے ہوئے خون کو دھویا، کیونکہ جب آپؐ پر دشمن نے وار کیا تو سر مبارک پر زخم آئے تھے، اور آگے کے دوؔ دندانِ مبارک شہید ہو گئے تھے۔[3]

حضرت علیؓ کی شجاعت اور خداداد جنگی کمال

شوال ۵ھ میں غزوۂ خندق جس کو غزوۃ الاحزاب بھی کہتے ہیں، پیش آیا، یہ معرکہ ان واقعات میں سے ہے، جن کے اثرات بہت دُور رس اور اسلام کے پھیلنے میں مُعاون

---

[1] تفصیلات کے لئے کوئی بھی سیرت کی کتاب یا مؤلف کی کتاب "السیرۃ النبویہ" صـ ۲۲۹-۲۴۶ دیکھئے۔

[2] الجامع الصحیح للبخاری. کتاب المغازی، باب غزوۂ اُحد۔ [3] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷ صـ ۲۲۴

ثابت ہوئے، نیز یہ جنگ فیصلہ کن تھی مسلمانوں کو وہ آزمائش پیش آئی جس کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی[1]، اس کی بولتی ہوئی نازک اور واضح تصویر ان آیات کریمہ میں دیکھی جا سکتی ہے:۔

اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ	جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی
اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ	طرف تم پر چڑھ آئے، اور جب
الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ	آنکھیں پھر گئیں، اور دل (مارے
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ	دہشت کے) گلوں تک پہونچ گئے اور
الظُّنُوْنَا ٥ ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ	تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان
الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا	کرنے لگے، وہاں مومن آزمائے گئے،
شَدِیْدًا ٥ (سورۂ احزاب ۱۰۔۱۱)	اور سخت طور پر ہلائے گئے۔

حضرت علیؓ کے جنگ کے امور میں خداداد امتیازی کمال (عبقریتِ حربیہ) کا پہلی بار شاندار اور مکمل اظہار اس جنگ کے موقع پر ہوا، حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے جو خندق کھودی گئی تھی، وہ مدینہ کے شمال و مغرب کے راستہ پر تھی، اور یہی دشمن کے مدینہ میں داخل ہونے کا کھلا راستہ تھا، یہ خندق مسلمانوں اور قریش کے درمیان حائل تھی، دشمن کی فوج دس ہزار تھی، قریش کے شہسوار تیز گام مدینہ منورہ کی طرف بڑھتے آئے اور خندق کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گئے اور کہنے لگے یہ تدبیر جنگ تو نئی چیز ہے عرب اس سے ناواقف تھے، اس کے بعد خندق کے ایک تنگ کنارے پر پہنچے، اور اپنے گھوڑے اتار دیئے وہ کود کر اُچھلے اور مدینہ منورہ کے اندر داخل ہو گئے، انہی فوجیوں میں عمرو بن عبد ودّ بھی تھا،

---

[1] اس غزدہ کی تفصیلات مؤلف کی کتاب "السیرۃ النبویہ" ص ۲۴۷۔۲۵۷ میں دیکھئے۔

جو تنہا ایک ہزار شہسواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا، وہ سامنے آکر کھڑا ہوا اور بولا :
من یُّبارز؟ (کون ہے جو میرے مقابلہ میں آنے کی ہمت رکھتا ہے۔)
اس کے مقابلہ کے لئے حضرت علیؓ نکلے اور فرمایا:۔
اے عَمرو تم نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر کسی قریش کے فرد نے تم کو دو چیزوں کی دعوت دی تو تم ایک ضرور قبول کروگے، اس نے کہا بیشک! حضرت علیؓ نے فرمایا: میں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔
عَمرو بولا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔
حضرت علیؓ نے فرمایا: پھر تم کو مقابلہ پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔
عَمرو بولا: کیوں؟ میرے بھتیجے (ابن أخی بھائی کے لڑکے) میں تم کو قتل نہیں کرنا چاہتا۔
حضرت علیؓ نے فرمایا: لیکن میں واللہ تم کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔
یہ سُن کر اس کو جوش سا آگیا، اپنے گھوڑے سے کود کر اس کی کوچیں کاٹ دیں اور اس کے چہرہ پر ایک ضرب لگائی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے تلوار سونت کر کھڑا ہوگیا، دونوں کی تلواریں چلنے لگیں، بڑھا، مڑا، پھر وار کیا، اتنے میں حضرت علیؓ کی تلوار نے اس کا کام تمام کر دیا۔[1]
دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عَمرو نے پکار کر کہا :
کون ہے جو میرے سامنے آتا ہے اور مسلمانوں کو حقارت آمیز انداز میں کہنے لگا، کہاں ہے وہ جنت جس کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ جو "شہید" ہوا وہ اس میں داخل ہو جائے گا؟

---
[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۴ ص ۱۰۵

کسی کو میرے سامنے کیوں نہیں لاتے؟ حضرت علیؓ دوبارہ اُٹھے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت چاہی اور کہا، میں یا رسول اللہ! آنحضرتؐ نے فرمایا: بیٹھے رہو، پھر عمرو نے تیسری بار للکارا اور غصّہ بھڑکانے کے انداز میں آواز دی، حضرت علیؓ پھر کھڑے ہوئے اور کہا، میں یا رسول اللہ! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا، جانتے ہو یہ عمرو ہے؟ حضرت علیؓ نے کہا ہوا کرے عمرو، آپؐ نے اجازت دے دی، حضرت علیؓ اس کی طرف بڑھے اور جب اپنا نام بتایا تو اس نے کہا، اے برادر زادے تمھارے چچا صاحبان میں بہت ایسے ہیں جو تم سے عمر میں بڑے ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تمھارا خون بہاؤں، حضرت علیؓ نے فرمایا: لیکن میں واللہ تمھارا خون بہانا چاہتا ہوں، پھر مقابلہ شروع ہوا، اور حضرت علیؓ نے اس کا کام تمام کر دیا۔[1]

پھر جنگ ختم ہوگئی کیونکہ قُریظہ (جو قریش کے حلیف تھے) اور قریش میں اختلاف ہو گیا تھا، نیز ان گروہوں (احزاب) کے پڑاؤ پر سرد ترین راتوں میں تیز آندھی آئی جس نے اُن کی پتیلیاں اُلٹ دیں اور خیمے گرا دیئے،[2] اس واقعہ کے بعد قریش نے مسلمانوں سے مقابلہ کی ہمّت نہیں کی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قریش اس سال کے بعد تم پر حملہ آور نہ ہوں گے، اب تم ہی ان پر حملہ آور ہوا کرو گے۔[3]

صلح حُدیبیہ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت علیؓ کی محبت اور ادب واحترام

ذیقعدہ ۶ھ میں صلح حُدیبیہ کا واقعہ[4] پیش آیا،[5] بڑے چوں وچرا اور معاندانہ رویہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۴ ص ۱۰۶ [2] ملاحظہ ہو سورۃ الاحزاب، نیز کتب سیرت۔
[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۴ ص ۱۱۵ [4] اس واقعہ کا پس منظر اور واقعہ کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں، نیز دیکھئے "نبی رحمتؐ" از مؤلف۔

کے بعد اور مسلمانوں کے حدودِ حرم میں داخلہ نامنظور کرنے کے بعد قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ان لوگوں کا ارادہ صلح کا ہے اسی لئے اس شخص کو بھیجا ہے، سُہیل نے کہا کہ ہمارے آپ کے درمیان ایک معاہدہ تحریری شکل میں آجائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا گیا، آنحضرتؐ نے فرمایا لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سہیل نے کہا: "رحمٰن" کیا ہے میں نہیں جانتا، (عربوں کے قدیم قاعدہ کے مطابق) "باسمک اللّٰھم" لکھا جائے، آپؐ نے فرمایا کوئی حرج نہیں یہی لکھ دو، آپؐ نے پھر اِملا فرمایا، یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہؐ نے فیصلہ کیا، سُہیل نے کہا: اگر آپؐ کو ہم "رسول اللہؐ" مانتے تو بیت اللہ آنے سے روکتے ہی نہیں، اور نہ آپؐ سے جنگ کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ تم جھٹلاتے رہو میں اللہ کا رسول ہوں، سُہیل نے کہا یہ لکھا جائے، محمد بن عبداللہ، آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ پہلا لکھا ہوا مٹا دیں، حضرت علیؓ نے کہا، بخدا میں قطعاً اس کو مٹا نہیں سکتا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جگہ بتاؤ جہاں پر "رسول اللہ" لکھا ہے، میں خود مٹائے دیتا ہوں[1]۔

غزوۂ خیبر[2]

ہجرت کے ساتویں سال محرم کے آخر میں خیبر کی جنگ ہوئی، یہ وہ جنگ ہے جس میں شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نادرۂ روزگار شجاعت اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے یہاں جو اُن کا مرتبہ تھا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب صلح الحدیبیہ (دار احیاء الکتب العربیہ، طبع اول ۱۹۵۵ء)

[2] غزوہ کی تفصیلات کے لئے کتبِ سیرت کا مطالعہ کیا جائے، یا مصنف کی السیرۃ النبویہ ص ۳۱۱-۳۱۹ سے رجوع کیا جائے (اردو ترجمہ "نبی رحمتؐ" کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے شائع ہو چکا ہے)۔

وہ دنیا کے سامنے کھل کر آ گیا، اور تقدیر الٰہی کا یہ فیصلہ کہ یہ یہودی کالونی جس کی جنگی اور فوجی نیز جغرافیائی لحاظ سے بڑی اہمیت تھی، وہ حضرت علیؓ کے ہاتھ فتح ہو۔

خیبر ایک یہودی کالونی تھی جس کے متعدد مضبوط قلعے تھے، اور یہ یہودیوں کا جنگی مورچہ تھا، یہی نہیں بلکہ جزیرۃ العرب میں جو ان کی چھاؤنیاں تھیں ان میں آخری چھاؤنی یہی تھی، یہودی مسلمانوں کے خلاف مدینہ کے یہودیوں اور دوسرے علاقوں کے دشمنوں سے مل کر سازش کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش تھی کہ ان یہودیوں کی آئے دن کی سازشوں اور حملہ کے خطرات سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائیں۔

خیبر مدینہ کے شمال مشرق میں ستر میل کی مسافت پر تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی فوج لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، مجاہدین کی کل تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) تھی، آپؐ نے خیبر کے قلعوں پر حملہ کی ٹھان لی اور ایک ایک قلعہ فتح ہوتا رہا، لیکن القموص کا قلعہ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ تسخیر معلوم ہو رہا تھا، اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کل جھنڈا اسی شخص کے ہاتھ میں ہو گا جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ پسند فرماتا ہے، اور اسی کے ہاتھ یہ قلعہ فتح ہو گا، اکابر صحابہ اس موقع پر اپنے لئے اس سرفرازی کے متمنّی و منتظر تھے، (رضی اللہ عنہم)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو بلایا اور جیسا کہ کہا گیا اُن کی آنکھوں میں تکلیف تھی، وہ حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ نے اُن کی دونوں آنکھوں میں لعابِ دہن لگا دیا، اور اُن کے لئے دعا کی جس سے اسی لمحہ اُن کی تکلیف دور ہو گئی، اور

ایسی دور ہوئی گویا کبھی تھی ہی نہیں، آپؐ نے اُن کے ہاتھ میں عَلم دیا، حضرت علی رضؓ نے دریافت کیا، کیا میں اس وقت تک اُن سے قتال کروں جب تک کہ وہ ہماری طرح مسلمان نہ ہوجائیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اپنی راہ پر گامزن ہوجاؤ اور اُن کے مقابلہ میں اتر کر انھیں اسلام کی دعوت دو اور انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالےٰ کا ان پر کیا حق ہے، بخدا اگر تمھارے ہاتھ پر ایک آدمی بھی ہدایت پاجائے تو تمھارے لئے بے شمار سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔[1]

شیرِ خدا اور یہود کے سورما کا مقابلہ

حضرت علی رضؓ القموص کے قلعہ میں داخل ہوئے، ادھر سے مشہور شہسوار مرحب رجزیہ اشعار پڑھتا ہوا سامنے آیا، دونوں نے دو[2] وار کئے، حضرت علی رضؓ نے جو وار کیا تو اس کے سر کا آہنی خود اور سر دونوں ایک ساتھ کٹ گئے، اس کے جبڑے بھی ٹوٹ گئے،[2] اور اسی پر جنگ کا فیصلہ ہوگیا اور مسلمانوں کی فتح مندی کا فیصلہ ہوگیا، مسند ابن شیبہ میں انھوں نے اپنی سند سے لیث سے روایت کی ہے کہ ہم ابوجعفر کے پاس گئے[3]، اُن پر خشیت و ندامت کی ایک کیفیت

---

[1] روایت صحیح بخاری و صحیح مسلم باب غزوۂ خیبر میں مفصل موجود ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ مرحب کو جس شخص نے قتل کیا وہ محمد بن مسلمہ تھے (ق،ص ۳۳۳-۳۳۴) لیکن صحیح یہ ہے کہ مرحب کو قتل کرنے والے علی بن ابی طالب تھے (طبری ص ۱۵۷۹) اور یہ بات تصریح کے ساتھ مسلم کی روایت میں ہے اور وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں جن کو رجزیہ طور پر حضرت علی نے پڑھا تھا، اور جو واقعہ مسلم نے اپنی سند سے روایت کیا ہے اسی پر اعتماد کیا جائے گا، اور وہی لائق ترجیح ہے، (ملاحظہ ہو صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۸۰۷ کتاب الجہاد والسیر) [3] یہاں ابوجعفر سے مراد حضرت محمد الباقر ابن سیدنا علی بن حسین زین العابدین رضؓ ہیں۔

طاری تھی، وہ روئے، اس کے بعد کہا مجھ سے جابر نے روایت کی کہ علیؓ نے خیبر کے دن قلعہ کا دروازہ اپنے ہاتھوں اٹھالیا تھا جس کی بنا پر مسلمان خیبر کے قلعہ پر چڑھ گئے اور اس کو فتح کرلیا، یہ پھاٹک اتنا بھاری تھا کہ کوشش کر کے دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ چالیس آدمیوں سے کم اس کو اٹھا نہیں سکتے۔[1]

---

[1] کنز العمال ۱۵/۱۲۰ (بہ رمز ش)

باب خیبر کو اٹھانے کے واقعہ کو ابن کثیر نے ضعیف قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ اس روایت میں ایک مجہول راوی ہے، اور انقطاع بھی ہے، حضرت جعفر کی روایت جو حضرت محمد باقر سے ہے، اس روایت کو بھی انھوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ ج ۴ ص ۱۸۹-۱۹۰)

لیکن یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے اور یہ مشہور واقعہ ہے اور اس کا واقع ہونا مستبعد نہیں ہے، اگر اس کی صحت ثابت ہوجائے اور اگر اس کی کوئی اصل ہے تو یہ عقائد اہل سنت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اہل سنت کے عقائد و علم کلام میں آتا ہے "إن كرامات الأولياء حق" (اولیاء اللہ سے کرامات کا صدور حق ہے) اور اس کی بنیاد قرآن مجید کی آیت ذیل ہے:۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ	زکریا جب کبھی عبادت گاہ میں مریم کے
وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ	پاس جاتے تو ان کے پاس کھانا پاتے (یہ کیفیت
أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ	دیکھ کر ایک دن مریم سے) پوچھنے لگے کہ مریم!
عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ	یہ کھانا تمھارے پاس کہاں سے آتا ہے؟ وہ
يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○	بولیں کہ خدا کے یہاں سے (آتا ہے) بے شک
(سورۃ آل عمران۔ ۳۷)	خدا جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔

اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اولیاء امت کے سرگروہ ہیں۔

محمد بن اسحاق نے عبداللہ بن حسن سے اور وہ اپنے بعض افراد خاندان سے اور وہ ابورافع سے روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے حضرت علیؓ کو ضرب لگائی جس سے ان کی ڈھال گر گئی حضرت علیؓ نے قلعہ کے پاس ایک دروازہ کو پکڑ لیا، اور اس کو اپنی ڈھال بنا لیا اور وہ اس وقت تک آپ کے ہاتھ میں رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے اس قلعہ کو آپ کے ہاتھ پر فتح نہیں کر دیا۔

ابورافع نے کہا میں نے خیبر کے روز اپنے آپ کو اور اپنے جیسے سات آدمیوں کو دیکھا کہ ہم لوگ کوشش کرتے رہے کہ اس دروازہ کو پلٹ دیں، مگر ایسا نہ کر سکے، اور لیث ابوجعفر سے اور وہ جابر سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دروازہ کو چالیس آدمی مل کر اٹھا سکے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی پر مکمل یقین اور کامل ایمان کا نمونہ

رمضان ۸ھ میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو لوگوں کو تیاری کا حکم دیا اور رازداری کے اصول پر عمل فرمایا، اور فرمایا کہ اے اللہ! دشمنوں کی آنکھوں سے یہ مہم پوشیدہ رکھ اور قریش کو اس کی خبر نہ لگے، یہاں تک کہ ہم اچانک ان کے دیار میں پہنچ جائیں۔[2]

حاطب بن ابی بلتعہ نے مکہ سے ہجرت کی تھی اور بدر میں بھی شریک تھے، وہ قریش سے متعلق بھی تھے لیکن قریشی نہیں تھے، اُن کی آل و اولاد اور اُن کے گھر والے وہیں تھے،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۲۵

[2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۱ (المطبعۃ المیمنیہ مصر) اور ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۷

مگر اُن کے کوئی ایسے رشتہ دار وہاں موجود نہیں تھے، جو اُن کے متعلقین کی حفاظت کرتے، انھوں نے چاہا کہ قریش پر ایک احسان کر دیں تاکہ وہ لوگ اُن کے رشتہ داروں کا لحاظ رکھیں، انھوں نے ایک خط لکھا جس میں یہ ذکر کر دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اُن کی طرف آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور ایک عورت کو دیا کہ وہ پہنچا دے اور کچھ اُجرت بھی اس کو دی، یہ عمل بلاشبہ غلطی پر مبنی تھا، اللہ اُن کو معاف کرے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اُن کے بارے میں کلمۂ خیر کہا اور فرمایا: "کیا عجب ہے کہ اللہ نے اہلِ بدر (کے اخلاص و قربانی) کو دیکھ کر فرما دیا ہو کہ جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا[1]" اس عورت نے جس کو یہ خط دیا گیا تھا کہ قریش کو پہونچا دے، اس خط کو اپنے بالوں کے جوڑے میں چھپا لیا اور روانہ ہو گئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس کی اطلاع وحی کے ذریعہ مل گئی، آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو بلایا اور فرمایا کہ ابھی فوراً چل پڑو خاخ[2] کے باغیچہ میں ایک ناقہ سوار عورت ملے گی جس کے پاس ایک خط ہے جو قریش کو پہونچانے لے جا رہی ہے، یہ دونوں حضرات اپنے گھوڑوں کو سرپٹ بھگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور اسی جگہ پر جہاں آنحضرتؐ نے بتایا تھا، اس عورت کو پا لیا، اس کو اتارا اور پوچھا کہ تیرے پاس کوئی خط ہے؟ بولی میرے پاس کوئی خط نہیں ہے! ان دونوں نے اس کے کجاوہ کو کھولا، اس میں کچھ نہیں ملا، حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ کبھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خلاف واقعہ بات کہی اور نہ ہم غلط کہتے ہیں، بخدا تم کو خط نکالنا پڑے گا ورنہ ہم تجھے برہنہ کر کے جامہ تلاشی لیں گے، جب اس عورت نے ان لوگوں کو سنجیدہ دیکھا تو اس نے کہا کہ

---

[1] زاد المعاد۔ ج ۱ صـ ۴۲۱ یہ قصہ صحاح میں بھی وارد ہے۔ [2] مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے ۱۲ میل پر واقع ہے۔ (مجمع بحار الانوار)۔

اچھا مُنھ پھیر لو! انھوں نے منھ پھیر لیا، اُس نے سر کے جُوڑے کو کھولا، اور خط نکال کر دے دیا، جس کو لے کر یہ دونوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے۔[۱]

حضرت علیؓ کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے تسکین و تسلّی کے بلند کلمات

رجب ۹ھ میں تبوک کا معرکہ پیش آیا، سیرت نبوی میں اس غزوہ کی بڑی اہمیت ہے، اس سے وہ مقاصد و نتائج حاصل ہوئے، جو مسلمانوں اور عربوں کی نفسیات و احساسات اور بعد کے پیش آنے والے واقعات اور حالات کا رُخ معیّن کرنے میں عمیق اور دیرپا اثرات کے حامل ہیں۔[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کا محافظ (گورنر) حضرت محمد بن مسلمۃ الانصاری اور اپنے اہلِ بیت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کے لئے اپنی جگہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مقرر کیا، حضرت علیؓ نے منافقوں کے افواہ پھیلانے اور اُن کی چہ میگوئیوں سے خطرہ کا اظہار فرمایا تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ میری نیابت و اعتماد کے معاملہ میں تمھاری حیثیت و مرکزیت وہ ہو جو حضرت ہارونؑ کی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی، ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔[۳]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لئے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ بنایا تو حضرت علیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ مجھے بچوں اور عورتوں

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۱، یہ واقعہ صحاح میں مذکور ہے۔ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مؤلف کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" ص ۳۶۱-۳۷۳ [۳] صحیح بخاری باب غزوۃ تبوک۔

کے ساتھ چھوڑ رہے ہیں[1] ..... الخ

یمن کی مُہم اور قبیلۂ ہمدان کا اجتماعی طور پر ایمان لانا

فتح مکہ کے بعد اور غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں پے در پے ہر طرف سے وفود آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں آنے لگے اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے،[2] انہی میں اشعریین اور اہلِ یمن کے وفود بھی تھے جو یہ رجزیہ شعر پڑھ رہے تھے۔

غداً نلقى الأحبة، محمداً وحزبه

کل ہم دوستوں سے ملیں گے، محمد اور اُن کے گروہ سے ملیں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: تمھارے پاس اہلِ یمن آئے ہیں، جو بڑے نرم دل اور نازک قلب کے لوگ ہیں، ایمان تو یمنیوں کا حصّہ ہے، اور حکمت یمنیوں ہی کی دولت ہے۔[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت خالدبن الولیدؓ کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے ایک جماعت کے ساتھ یمن بھیجا، یہ جماعت وہاں چھ[6] ماہ مقیم رہی اور حضرت خالدؓ اسلام کی دعوت دیتے رہے مگر ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، ان کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھیجا، انھوں نے وہاں جاکر لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مکتوب گرامی پڑھ کر سنایا اس پر پورا قبیلۂ ہمدان ایمان لے آیا۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۲۵ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مؤلف کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" بعنوان "عام الوفود" ص ۳۷۷-۳۸۳

[3] البخاری باب قدوم الأشعریین واہل الیمن ..... ملاحظہ ہو زاد المعاد - ج ۲ ص ۳۲

حضرت علیؓ نے جب اہلِ ہمدان کے قبول اسلام کی خبر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی تو حضرت علیؓ کے خط کو پڑھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالےٰ کے آگے سربسجود ہو گئے، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر فرمایا: "السلام علیٰ ہمدان، السلام علیٰ ہمدان" یعنی سلامتی ہو ہمدان کے لئے، سلامتی ہو ہمدان کے لئے (دو مرتبہ)[1]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت اور انکسار طبیعت

۹ھ میں حج فرض ہوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس سال امیر الحج بنا کر بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو اسلامی طریقہ پر حج کرائیں۔ اس وقت تک مشرکین اپنے طریقوں پر حج کیا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے، جن کا حج کا ارادہ تھا، ان کی تعداد تین سو ۳۰۰ تھی اور سب اہلِ مدینہ تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورۂ براءت نازل ہوئی، آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور اُن کو حکم دیا کہ سورۂ براءت کی ابتدائی آئتیں لے کر جاؤ اور قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) لوگوں کو سنا دینا، اور بتا دینا کہ جنت میں کوئی کافر نہیں جائے گا، اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا، خانہ کعبہ کا طواف کوئی ننگے جسم نہیں کرے گا[2]، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے تو آپؐ اپنی زندگی بھر اس کے پابند رہیں گے۔

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۳۳ ملاحظہ ہو بلاذری کی انساب الأشراف۔ ق ۸۲۶ مطبوعہ قاہرہ (اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ ادا کی)

[2] بعض مشرکین واہلِ جاہلیت کپڑے اتار کر اور برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں گناہ کئے، اور بے تکلف رہے، ان کے ساتھ کعبہ کا طواف ایک طرح کی بے ادبی ہے۔

حضرت علیؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی عضباء پر نکلے، راستہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہو گئی، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے؟ حضرت علیؓ نے کہا مامور کی حیثیت سے، دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا، حضرت ابوبکرؓ کی رہنمائی میں لوگوں نے مناسک حج ادا کئے، جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؓ نے لوگوں میں ان باتوں کا اعلان کر دیا جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہدایت دی تھی[1]۔

حجۃ الوداع اور غدیر خُم کا خطبہ

حجۃ الوداع میں حضرت علیؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر مل گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربانی کے دن اپنے دست مبارک سے ۶۳ جانور ذبح کئے (۶۳ کا عدد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے) ۶۳ اُونٹ ذبح کرنے کے بعد آپؐ رک گئے، اور سَو میں جو باقی رہ گئے تھے، وہ حضرت علیؓ کے سپرد کر دیئے کہ وہ آپؐ کی طرف سے ذبح کریں، چنانچہ حضرت علیؓ نے اس کی تکمیل کی اور عدد مکمل کر دیا۔

ایام تشریق منیٰ میں گزارنے کے بعد آپؐ نے مکہ مکرمہ کا رُخ کیا، طواف وداع کے بعد لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کا حکم دیا، اور خود آپؐ نے مدینہ منورہ کی طرف کوچ کیا، جب آپؐ غدیر خُم[2] پر پہنچے تو وہاں ایک خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؓ کی خصوصیت اور شان کا ذکر فرمایا آپؐ نے فرمایا کہ میں جس کا دوست اور حامی ہوں علی اس کے دوست اور حامی ہیں، پھر دعا دی " اَللّٰھم وَالِ مَن وَّالاہ وَعَادِ مَن عَادَاہ[3]" یعنی اے اللہ اس کی

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۴۳-۵۴۶ [2] غدیر خُم مکہ اور مدینہ کے درمیان جُحفہ سے دو میل پر واقع ہے۔ [3] السیرۃ النبویہ" لابن کثیر ج ۴ ص ۴۱۵-۴۱۶ نقل از امام احمد والنسائی۔

حمایت فرما جو اُن کی حمایت کرے اور اس کی دشمنی تو بھی کر جو اُن کی دشمنی کرے، یہ کہنے کا سبب یہ تھا کہ بعض لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیجا شکایت کی تھی، اور ان پر اعتراض و بےجا تنقید اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، قصہ یہ تھا کہ جن دنوں حضرت علی یمن میں تھے، بعض معاملات میں انھوں نے انصاف کی بات کہی تھی، اور صحیح طرزِ عمل اختیار کیا تھا، لیکن کچھ لوگوں نے اس کو زیادتی، تنگی اور بخل پر محمول کیا تھا، حالانکہ حضرت علیؓ اس معاملہ میں حق بجانب تھے[1]۔

ابن کثیر کا بیان ہے :-

"جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم مناسک حج بیان فرما چکے اور مدینہ منورہ کی طرف کوچ کیا، ۲۸ ذی الحجہ کو ایک اہم خطبہ دیا، یہ یکشنبہ کا روز تھا، اور مقام غدیر خم کا تھا، ایک درخت کے سایہ میں آپ کھڑے ہوئے اور مختلف باتیں ذکر فرمائیں اور حضرت علیؓ کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا، ان کی امانت اور عدل کو سراہا، اور آپ کی ذات سے جو ان کا تعلق تھا اس کو بیان فرمایا، آپ کی اس تقریر سے بعض لوگوں کے دلوں میں جو غبار تھا وہ دُھل گیا۔

ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ : اس سلسلہ کی اصل حدیثیں ہم یہاں نقل کریں گے اور ان احادیث کے صحیح وضعیف ہونے کے لحاظ سے جو درجہ ہے وہ بتائیں گے بحول اللہ وقوتہ وعونہ۔

اس کے بعد ابنِ کثیر نے وہ باتیں لکھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان احادیث میں رطب ویابس ہر قسم کی باتیں جمع ہیں، اور جیسا کہ بہت سے محدثین کا قاعدہ ہے کہ ایک سلسلہ کی جو بھی احادیث ان کو ملتی ہیں وہ سب بغیر چھان بین کے نقل کر دیتے ہیں[2]۔"

---

[1] ملاحظہ ہو ابن کثیر ج ۴ ص ۴۱۴ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۰۸

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات

سنّتِ الٰہی جو انبیائے کرام اور تمام مخلوقات کے لئے مقدّر ہے اس کا وقت آپہونچا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج	اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تو صرف (خدا
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ط	کے) پیغمبر ہیں، اُن سے پہلے بھی بہت سے
اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	پیغمبر ہو گزرے ہیں، بھلا اگر اُن کی وفات
عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ ط	ہو جائے یا شہادت پا جائیں تو تم اُلٹے پاؤں
(سورۃ آل عمران ۔ ۱۴۴)	پھر جاؤ۔

دعوت الی اللہ کی مہم مکمل ہو چکی تھی تشریع (قانون سازی) کا کام تکمیل پا چکا تھا، اللہ نے اپنے پیغمبر حق کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں، آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ لوگ پروانہ وار جوق درجوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، اور سارے عالم میں اس کے پھیلنے کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، آپؐ نے جن لوگوں کو اپنی آغوشِ تربیت میں پالا تھا، اُن کی وفاداری پر آپؐ کو مکمل اطمینان حاصل ہو چکا تھا، جنھوں نے آپؐ کے زیر سایہ اور آپؐ کی براہ راست صحبت بابرکت میں رہ کر تعلیمات دینی کو اخذ کیا تھا، وہ اس پر خود بھی عامل وکاربند تھے اور دوسروں کو بھی کاربند رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس سب کے کُھلے شواہد سامنے تھے، اس لئے اب لقائے حق تعالےٰ کا وقت قریب معلوم ہوتا تھا، اور آپ اس کے لئے تیار اور سراپا اشتیاق تھے، مسلمانوں کو نصیحتیں اور خطبات میں تمام امور سے بارہا آگاہ فرما چکے تھے، آپؐ کے پاس جو مال رہ گیا تھا، وہ بھی سب خرچ کر دیا گیا، لوگوں کا بیان ہے کہ پانچ۵ سے لے کر

تونک کے طلائی سکے تھے، آپؐ نے فرمایا اگر اپنے رب کے سامنے اس حال میں حاضری ہوئی کہ یہ مال گھر میں موجود ہے تو میں کل خدا کو کیا منھ دکھاؤں گا؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے فرمایا جاؤ ان سب کو راہِ خدا میں خیرات کردو۔[1]

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف بڑھی، آپؐ نے غسل فرمایا، اور اٹھنے کا ارادہ کیا تھا کہ بے ہوشی طاری ہوگئی، پھر سنبھالا لیا اور فرمایا، لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ عرض کیا گیا کہ نہیں! یا رسول اللہ! لوگ آپؐ کا انتظار کر رہے ہیں، لوگ مسجد میں منتظر تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائیں تو عشاء کی نماز کھڑی ہو، آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلوایا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں، حضرت ابوبکرؓ بہت رقیق القلب تھے، انھوں نے کہا عمرؓ تم نماز پڑھا دو! حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں، چنانچہ ان دِنوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے امامت کی، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکلیف میں کمی محسوس فرمائی تو دو آدمیوں کے سہارے اٹھے، یہ دو آدمی حضرت عباس اور حضرت علی تھے (رضی اللہ عنہما) اور ظہر کی نماز کے لئے مسجد میں تشریف فرما ہوئے، جب حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد نبوی میں بہ نفس نفیس موجود پایا تو ذرا جھجھکے کہ امامت کے لئے کیسے بڑھیں، مگر آپؐ نے اُن کو اشارہ سے فرمایا کہ تاخیر نہ کریں، جو لوگ آپؐ کو سہارا دیئے ہوئے تھے، اُن کو حکم دیا انھوں نے آپؐ کو بٹھا دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہوکر آنحضرت کی اقتدا میں اور لوگ ابوبکرؓ کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہوکر۔[2]

---

[1] مسند الامام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۴۹ [2] صحیح بخاری باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ نماز کی پابندی کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے اور غلاموں اور باندیوں کے حقوق ادا کئے جائیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں آپ کو دیکھتی گئی، آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "فی الرفیق الأعلیٰ، فی الرفیق الأعلیٰ" (سب سے بڑی رفاقت والے کے حضور میں) آپ کے سامنے ایک لگن اور ایک پانی کا پیالہ تھا، اپنے دست مبارک اس پانی میں ڈالتے اور اس سے چہرۂ مبارک کو تر کرتے پھر فرماتے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ موت کی ایک جاں کنی ہوتی ہے' پھر بائیں ہاتھ کی انگلی سیدھی کرلی اور فرمانے لگے" فی الرفیق الأعلیٰ، فی الرفیق الأعلیٰ" یہ کہتے ہوئے روح مبارک پرواز کر گئی اور ہاتھ پانی کی سمت جھک گیا۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی خبر صحابۂ کرام پر بجلی بن کر گری یہ حضرات آپ کے دامنِ رحمت سے وابستہ اور دل سے شیدا و فریفتہ تھے، وہ آپ کے آغوشِ تربیت میں اس طرح رہے جیسے شفیق باپ کی آغوش میں اس کے بچے ہوں، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اُن پر قیامت گزر گئی۔

قُدرتًا آپ کی جُدائی کا غم آپ کے اہلِ بیت، خاندان ہاشمی خصوصًا حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی بن ابی طالب رضی پر سب سے زیادہ تھا، یہ قانونِ قدرت اور فطرتِ سلیم کا تقاضا تھا، پھر رشتہ کا قرب، دل کی نرمی اور گداز، احساسات کی نزاکت اور محبت کا وفور ستزاد، لیکن انھوں نے اس جاں گداز حادثہ کو خداداد قوتِ ایمانی اور تسلیم ورضا کے اس جذبہ سے جو تربیت نبوی کا فیض اور اُن کا خاندانی شعار تھا برداشت کیا۔

---

[1] روایت امام احمد (ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۳)

اہلِ بیت رسول اللہؐ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل وتکفین کی خدمت انجام دی، لیکن ان تمام محبتوں کے اور اس تعلق کے باوجود جس کی مثال نہیں مل سکتی آپ پر کوئی نوحہ کناں نہ ہوا، کیونکہ آپؐ نے اپنی آخری زندگی میں نوحہ کرنے سے سختی سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

آپؐ کا ارشاد تھا یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا، اُن کے اس عمل سے پرہیز کیا جائے۔

یہ واقعہ دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الأول ۱۱ھ کو بعد زوال پیش آیا، آپؐ کی عمر شریف اس وقت ۶۳ سال تھی، آپؐ کی وفات کا دن مسلمانوں کے لئے سخت ترین اُداسی، صدمہ اور غم کا دن تھا، اور انسانیت کے لئے سانحۂ عظیم، جیسا کہ آپؐ کی ولادت کا دن اسی درجہ باعثِ سعادت تھا کہ اس سے زیادہ تابناک و مبارک دن تقویم انسانی میں طلوع نہیں ہوا[۱]۔

www.besturdubooks.wordpress.com

[۱] السیرۃ النبویہ از مصنف باختصار ص ۳۹۳-۴۰۷

باب سوم

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں

اولین شخصیت کی جو منصب خلافت پر فائز ہو مطلوبہ صفات و خصوصیات، ان صفات و خصوصیات کا حضرت ابوبکرؓ پر انطباق، شرط اوّلین دین کی تحریف و حذف و اضافہ سے حفاظت، فتنۂ ارتداد اور سلسلۂ مدعیان نبوت کا انسداد، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا کا مخلصانہ تعاون

ایک انتہائی نازک اور فیصلہ کن گھڑی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات اس اُمّت کی موت وحیات کا فیصلہ کرنے کے لئے نازک ترین گھڑی اور آزمائش تھی، اسلام اس وقت تک ایک چھوٹے سے جزیرہ کی حیثیت رکھتا تھا جس کے گرد جاہلیت، مُشرکانہ عقائد، حیوانی عادات وخصائل، وحشیانہ طرزِ زندگی، بگڑے ہوئے نظامِ حیات اور ظالم وجابر حکومتوں کا ایک سمندر موج زن تھا، عرب نئے نئے اسلام لائے تھے، اُن کو اپنی قدیم قبائلی زندگی میں اتحاد ویگانگت کے ساتھ کام کرنے کی اور کسی نظام کا پابند ہو کر زندگی گزارنے کی عادت نہیں تھی۔

دنیا کے وہ عظیم مذاہب جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دَور دَورہ تھا جن کے ماننے والے روئے زمین کے وسیع رقبوں میں پھیلے ہوئے تھے، بے شمار قومیں اور انسانی آبادیاں اُن کا کلمہ پڑھتی تھیں، وہ مذاہب آغاز تاریخ ہی میں بے راہ روی (انحراف) اور دین کے اصول میں تغیّر وتبدّل (تحریف) کا شکار، اور اندرونی سازشوں اور بیرونی مخالفتوں کے اثر سے نیم جان اور بے روح بن چکے تھے۔

اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ان مذاہب کے اوّلین پیشواؤں اور ذمہ داروں کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہی اُن کی قائم مقامی اور ترجمانی ان اشخاص کے حصّہ میں آئی جو ان مذاہب وادیان کے مقاصد وتعلیمات کے فہم میں وہ گہرائی نہیں رکھتے تھے، یا اُن کے بارہ میں وہ اخلاص وعزم ان میں نہیں پایا جاتا تھا، جو پیغمبروں اور داعیانِ ادیان کے نائبینِ اوّلین کے لئے ضروری ہے، اُن کے اندر اُن ادیان اور تعلیمات

کی اصلیت باقی رکھنے کے لئے اس درجہ کی غیرت وحمیّت اور فکرمندی بھی نہیں تھی جس کی اس مرحلہ پر ضرورت ہوتی ہے، وہ دنیا طلبی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، اور اُن میں سے اکثر جاہ ومنصب پر فریفتہ تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مذاہب ان فلسفوں اور رواجی طریقوں کے اندر جذب ہو گئے، جن کو یہ مذاہب نیست ونابود کرنے کے لئے وجود میں آئے تھے، اور ایسا بھی ہوا کہ ان مذاہب نے زمانہ کی رَو سے مصالحت کرلی اور اُن کا پیوند بن گئے، تاکہ مذہب ان حکمرانوں کی خواہشات کی تکمیل کرسکے، جنھوں نے اُس کو قبول کیا تھا، ان حکمرانوں اور ان حکومتوں نے مذاہب کا استحصال زیادہ کیا اور فائدہ کم پہونچایا، یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے برہمنیت، بدھ مت، زردشتی مذہب کو اپنے بانیوں کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سابقہ پڑا، یہودیت بھی بہت جلد اس دامِ تحریف وتزویر میں گرفتار ہو گئی، اور حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کی مفارقت کے بعد جلد ہی نصرانیت کو بھی اس سازش اور خطرہ سے دوچار ہونا پڑا۔

قدیم مذاہب کا انجام

ہم سب سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہیں کیونکہ یہ دونوں آسمانی مذہب ہیں، اور اُن کے ماننے والوں کو قرآن نے اہلِ کتاب کہا ہے۔

"جیوش انسائیکلوپیڈیا" میں جو کہا گیا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ بُت پرستوں سے انبیاءؑ کی ناراضگی اور اُن کا غم وغصّہ اس امر کی دلیل ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے اسرائیلیوں کے اندر بُت پرستی کا رواج پڑ چکا تھا، اور بابل میں جلاوطنی سے واپسی کے بعد بھی اس کی جڑیں اُن کے اندر سے ختم نہیں ہوئی تھیں، اور انھوں نے مُشرکانہ عقائد اور ایسی بدعتیں

قبول کرلی تھیں جن کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔[1]

نصرانیت تو اپنے پہلے ہی دور سے مسیحیت قبول کرنے والے اہلِ روم کی اصنام پرستی، جاہلوں کی تاویلات، اور غلو کرنے والوں کی تحریف سے دوچار ہو چکی تھی، اور ان تاویلات، تحریفات اور رسوم کے ملبہ کی تہہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی لائی ہوئی سادہ تعلیمات دب کر رہ گئی تھیں، توحید کی روشنی اور خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم سب ان گھرے بادلوں کے پیچھے پوشیدہ ہو چکی تھی، اس صورتِ حال کے پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری پادری پال (SAINT PAUL) (۱۰-۶۶۵) پر ہے، جس کو مسیحیت کی قیادت اور تعلیمات مسیح کو بیان کرنے کی ذمہ داری قریب ہی عرصہ میں حاصل ہو گئی تھی، متعدد اہلِ علم و تحقیق کی رائے یہ ہے کہ آج عیسائیت کی جو مسخ شدہ شکل موجود ہے، اور تجسیم و تمثیل کا عقیدہ اور قدیم خلفائے مسیح علیہ السلام سے زیادہ بودھ مذہب کے رسوم جو اس کے اندر سرایت کر گئے ہیں، یہ سب سینٹ پال ہی کی دین ہے، اور عیسائیت کی موجودہ ہیئت وہی ہے جس کو گذشتہ بارہ صدیوں سے عیسائی دنیا، مسیحیت کے قدامت پسند (ORTHODOX) مذہب کی حیثیت سے سینہ سے لگائے ہوئے ہے۔

قدیم ہندو مذہب برہمنیت کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو اپنے ابتدائی زمانہ ہی سے اپنی پہلی ڈگر چھوڑ چکا تھا، اپنی سادگی کھو چکا تھا، اور اس کا خالقِ کائنات سے براہ راست روحانی تعلق کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا، اصنام پرستی اپنے پورے شباب پر تھی، اُن کے اصنام و آلہہ (بتوں اور معبودوں) کی تعداد تینتیس کروڑ تک پہونچ چکی تھی۔[2]

بودھ مذہب کی بھی تقریباً یہی حالت تھی، اس کی بگڑی ہوئی شکل کو گوتم بودھ جی

---

[1] THE JEWISH ENCYCLOPEDIA Vol XII P. 565-569

[2] L. S. S. O'MALLEY: POPULAR HINDUISM, PP. 6-7

کی اوّلین تعلیمات سے کوئی نسبت نہیں رہ گئی تھی، بُت اور مجسّموں کی پرستش اور مذہبی رسوم و رواج اس پر اس درجہ غالب آگئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اصنام پرستی کا ایک مذہب بن گیا، جس کو برہمنیت سے (معبودوں اور بتوں کے ناموں کے اختلاف کو مستثنیٰ کرکے) کوئی جُدا مذہب تصوّر کرنا دشوار ہوگیا، یہاں تک کہ "بودھ" اور "بت" کا لفظ مرادف بن گئے، جو متقاربُ الصّوت اور متقارب الحروف لفظ ہیں، اور جیسا کہ بعض نکتہ شناس مصنّفین نے لکھا ہے، بُت کا لفظ فارسی میں (اور اس کے اثر سے اُردو میں) بودھ کے لفظ کی تقلید اور نقل میں آیا۔[1]

زرتشتیت کے سلسلہ میں بھی یہی بات کہی جائے گی، مذاہب عالم (RELIGIONS OF THE WORLD) کے مصنفین کہتے ہیں:—

"زرتشتیت کا ردّ عمل جو زردشت کے فوت ہوجانے کے بعد (PARALLEL) ایک متوازی اصلاحی تحریک کی شکل میں ہوا، اس نے قدیم مذاہب کے معبودوں (GODS) کو نئی زندگی دی، اور اس مذہب کے ماننے والوں نے بڑے جوش و مسرّت کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا، اس تحریک کی قیادت قدیم کاہنوں (مذہبی پیشواؤں) نے کی اور اس پر مسرّت و اطمینان کا اظہار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مذہب جس نے کبھی بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ توحید کی دعوت دی تھی معبودوں کے سیلاب میں ڈوب گیا۔"[2]

نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کے شرائط و مطالبات

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے جو مشکل صورتِ حال سامنے آگئی تھی

لہ C. V. VAIDYA : HISTORY OF MEDIAEVAL HINDU INDIA, Vol. I, P. 101.

لہ RELIGIONS OF THE WORLD, NEW YORK, P. 139

اور جس پیچیدہ مسئلہ سے یہ نوخیز و نوعمر اُمت دوچار تھی، اور جس سے مفر بھی نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن اس حادثہ کو پیش آنا ہی تھا کہ یہی سنّتِ الٰہی ہے، جس کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ	جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں اُن کے
قَبْلُ ج وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ	بارے میں بھی خدا کی یہی عادت رہی
تَبْدِيلًا ۝	ہے، اور تم خدا کی عادت میں تغیّر
(سورۃ الأحزاب ـ ٦٢)	و تبدّل نہ پاؤ گے۔

اس صورتِ حال پر قابو پانے کا ایک ہی راستہ تھا، اور وہ یہ کہ ایسا خلیفہ منتخب کر لیا جائے جس میں ایسی خصوصیات ہوں، جن کے ذریعہ (اللہ تعالےٰ کی توفیق ارزانی کی بدولت) وہ دین کو تحریف سے بچا لے جائے اور اُمّت کو اس جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دے جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کو چھوڑا ہے، وہ خصوصیات یہ ہیں :۔

۱۔ اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام لانے کے بعد سے زندگی بھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مکمّل اعتماد کا اس کو شرف حاصل رہا ہو، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود اس کی شہادت دی ہو، اور دین کے متعدد اہم ارکان اور اہم ترین ذمّہ داریوں کے ادا کرنے کے لئے اس کو اپنا قائم مقام بنایا ہو، اور ایسے خطرات سے پُر مواقع پر اس کو اپنے ساتھ لیا ہو جس کے لئے صرف اسی کو انتخاب کیا جاتا ہے، جس پر پورا اعتماد اور مکمل بھروسہ ہو۔

۲۔ اس کی یہ خصوصیت ہو کہ بلاخیز آندھیوں کے وقت، جبکہ دین کی روح اور اس کی اصلیت کا چراغ جھلملا رہا ہو اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ ہو، ایسے سخت طوفان کے عالم میں جب کہ بڑے بڑے دل گردہ والے، ایمان و یقین کے پیکر، رسول اللہ صلے اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی طویل صحبت ورفاقت کا شرف رکھنے والے بھی سہم رہے ہوں، یہ شخص پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہا ہو، اس نے اس موقع پر (ثبات واستقامت میں) انبیائے سابقین کے کردار کا مظاہرہ کیا ہو جس نے نگاہوں سے پردے اُٹھا دیئے ہوں' اور صحیح عقیدہ اور دین کی اصلیت پر غبار نہ آنے دیا ہو۔

۳۔ اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام کا صحیح ادراک اور اس کی حقیقت اور روح اس کے رگ وپے میں سرایت کی ہوئی ہو، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُسوہ، جنگ کی حالت میں، صُلح کی صورت میں، خوف ودہشت کی فضا میں' امن وسلامتی کی ساعتوں میں' اتحاد ویگانگت کی حالت میں' تنگی وتُرشی میں اور فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی میں' ہر ہر موقع اور ہر ساعت میں اس کے پیش نظر ہو۔

۴۔ اس کی یہ خصوصیت ہو کہ دین کی حقیقت واصلیت اور اس کو قائم ودائم رکھنے کی فکر اور اس کی غیرت اس کے اندر اس سے بدرجہا زیادہ ہو جس قدر کسی کو اپنے گھرانہ، ماؤں' بہنوں' بیویوں اور بیٹیوں کی عزّت وحُرمت کے بارہ میں غیرت ہوتی ہے' اور اس راہ میں محبوب سے محبوب شئے' اور عزیز سے عزیز ہستی کی پاسداری' کوئی تاویل وتوجیہ' کسی طرح کا خوف یا طمع حائل نہ ہو سکتا ہو۔

۵۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا اُس کے اندر بے پایاں جذبہ ہو' اور آپؐ کے راستہ سے سرِمُو انحراف بھی اس کو گوارا نہ ہو' اور اس سلسلہ میں کسی کی ملامت کا ڈر نہ ہو۔

۶۔ اس کی خصوصیت ہو کہ وہ دنیاوی جاہ وثروت کا طالب نہ ہو اور نہ اس کو اپنے عیش وآرام کی فکر ہو' دولتِ دنیا اور لذّتِ عیش کے معاملہ سے اس درجہ

بے نیاز و یکسو ہو کہ سوائے اس کے قائد و ہادی (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو، اپنے یا اپنے خاندان کے لئے کسی حکومت کے قیام اور اس کی توسیع و ترقی کا خواب بھی کبھی اس نے نہ دیکھا ہو، جیسا کہ قریب ترین ممالک (روم و فارس) کے حکمراں خاندانوں کا قدیم وتیرہ رہا ہے کہ اُن کی ساری مساعی خاندانی سلطنتوں اور بادشاہتوں کی تاسیس و توسیع کے لئے وقف رہی ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان خصوصیات کے جامع اور ان شرائط پر پورے اُترتے تھے

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان شرائط پر ہر طرح سے پورے اترے اور وہ ان تمام خصوصیات کے جامع تھے، اپنی خلافت سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اور آپؐ کی وفات کے بعد اپنے عہدِ خلافت میں آخری دم تک[1] اس طرح ثابت قدم رہے کہ کسی انکار کرنے والے یا شک کرنے والے کے لئے انکار یا شک کی گنجائش نہیں ہے، اور آپ کی یہ خصوصیات بدیہی صورت میں اور تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔

اب ہم بالترتیب بیان کرتے ہیں کہ کس طرح حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان شرائط پر پورے اُترے:۔

۱۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپؐ نے انتہائی خطرات سے پُر سفر میں اُن کو

---

[1] ملاحظہ ہو سیرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ "البدایۃ والنہایۃ" لابن کثیر ج ۶۔ اور "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" للحافظ ابن حجر اور دوسری سیر و تراجم کی کتابیں۔

ساتھ لیا، یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا، جب کہ دشمن گھات میں تھے، ایسے سفر میں کوئی صاحبِ عقل انسان ایسے شخص کو اپنا رازدار و دمساز نہیں بنا سکتا، جس پر اس کو مکمّل بھروسہ نہ ہو، جب کہ معلوم ہو کہ قدم قدم پر خطرہ تھا، تلاش کرنے اور تعاقب کرنے والوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس وقت سفر میں اسی کو ساتھ لیا جاتا ہے، جو اپنی جان اور زندگی سے زیادہ اپنے محبوب و آقا رفیق کو عزیز رکھتا ہو۔[۱]

اس کارنامہ (رفاقتِ سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کرکے دوام عطا کر دیا :۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (سورۂ توبہ ۔ ۴۰)	(اس وقت) دو ہی شخص تھے، جن میں (ایک ابوبکرؓ تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلّی دیتے تھے کہ غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

یہ وہ مدح ہے، جس میں حضرت ابوبکرؓ کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔

دین کے بعض اہم ارکان میں اپنا قائم مقام بنانے کا جہاں تک تعلق ہے تو

---

[۱] "منہاج الکرامہ" کے شیعہ مؤلف ابن المطہّر الحلّی نے لکھا ہے :۔

"اس میں ان کی (یعنی حضرت ابوبکرؓ کی) کوئی فضیلت نہیں ہے کہ غار میں وہ ساتھ رہے کیونکہ ممکن ہے کہ آپؐ نے اس لئے سفر میں ساتھ رکھا ہو کہ آپؐ کا راز فاش نہ ہو" روایت ہے کہ مصنّف نے اس بات کا اولیجا خدا بندہ خاں سے ذکر کیا (وہ امیر جس کے لئے یہ کتاب لکھی گئی تھی) اس نے جو کہا اس کا مفہوم یہ ہے کہ "ایسا کام کوئی صاحبِ عقل نہیں کر سکتا"۔

یہ معلوم ہے کہ روزہ اور زکوٰۃ میں قائم مقام نہیں بنایا جا سکتا کیوں کہ یہ وہ فرائض ہیں جن کو ہر شخص بطور خود انجام دیتا ہے، قائم مقامی نماز کی امامت میں یا فریضۂ حج کی قیادت و رہنمائی میں ہو سکتی ہے، اور یہ دونوں شرف تنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئے۔

چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نماز کی امامت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام بنایا اور اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ کے برابر کا درجہ کسی کو نہیں دیا، جیسا کہ حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عُتبہ کی روایت ہے، کہتے ہیں کہ "میں حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مرض وفات کی تفصیل سنائیں، فرمایا: ضرور، جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مرض نے شدّت اختیار کی تو آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہم لوگوں نے عرض کیا نہیں، وہ سب آپؐ کے منتظر ہیں، فرمایا: لگن میں میرے لئے پانی رکھو، حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ ایسا ہی کیا گیا، آپ بیٹھے اور غسل کیا، پھر اُٹھنے لگے تو بے ہوشی طاری ہو گئی، تھوڑے لمحہ کے بعد ہوش آیا تو فرمایا: کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہم لوگوں نے عرض کیا نہیں، وہ سب آپؐ کے منتظر ہیں، فرمایا: لگن میں ذرا پانی دو، حکم کی تعمیل کی گئی، آپؐ بیٹھے اور غسل کیا، پھر اُٹھنے لگے تو بے ہوشی طاری ہو گئی، تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو پہلا سوال یہی کیا، کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ عرض کیا نہیں، وہ لوگ آپؐ کے منتظر ہیں، فرمایا: میرے لئے لگن میں پانی رکھو، حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں کہ آپؐ کے حکم کے بموجب ایسا ہی کیا گیا، اور آپؐ نے اپنے آپ کو اٹھانے کی کوشش کی تو بے ہوشی طاری ہو گئی، چند لمحوں کے بعد افاقہ ہوا تو یہی سوال فرمایا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ جواب دیا گیا نہیں، لوگ آپؐ کے منتظر ہیں، ادھر یہ حال تھا، دوسری طرف لوگ مسجد میں بیٹھے آنحضرتؐ کی

تشریف آوری کے منتظر تھے، تاکہ عشاء کی نماز ادا کریں، آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو بُلوا بھیجا کہ وہ امامت فرمائیں، جب ابوبکرؓ کے پاس پیغام لے جانے والا پہونچا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو نماز کی امامت کا حکم دیا ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے جو بہت رقیق القلب تھے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم نماز پڑھا دو، حضرت عمرؓ نے فرمایا نہیں آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں، چنانچہ ان دنوں میں حضرت ابوبکرؓ نے نماز کی امامت فرمائی، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اندر کچھ قدرت محسوس کی اور مرض کا اثر ہلکا ہوا تو آپؐ دو آدمیوں کے سہارے نکلے جن میں ایک حضرت عباسؓ تھے، ظہر کی نماز کا وقت تھا، حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھانے کے لئے تیار تھے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ مسجد میں تشریف لا رہے ہیں تو ذرا جھجکے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ سے فرمایا: کہ آگے بڑھیں اور تاخیر نہ کریں، پھر کہا کہ مجھ کو اُن کے پہلو میں بٹھا دو، چنانچہ اُن دونوں نے آپؐ کو حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بٹھا دیا، حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہو کر آنحضرتؐ کی اقتدا میں، اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہو کر، حضرت عبید اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے یہ واقعہ سننے کے بعد میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے پاس گیا اور کہا کہ کیا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بارے میں جو میں نے حضرت عائشہؓ سے سنا ہے، آپ کو سناؤں؟ انھوں نے کہا کہو، میں نے پوری روایت سنائی، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اس کی تصدیق کی، اور صرف یہ پوچھا کہ کیا حضرت عائشہؓ نے ان صاحب کا نام بتایا تھا، جو حضرت عباسؓ کے ساتھ مل کر آنحضرتؐ کو لے گئے تھے، میں نے کہا نہیں، حضرت عبد اللہ نے کہا وہ علیؓ تھے۔"[1]

---

[1] صحیح بخاری" باب انما جعل الامام لیؤتم بہ" نیز مسلم "باب استخلاف الامام اذا عرض لہ عذر۔"

دوسری روایت حضرت ابوموسیٰ سے ہے کہتے ہیں کہ "جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم علیل ہوئے اور آپؐ کے مرض نے شدّت اختیار کی تو آپؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ابوبکرؓ بہت رقیق القلب ہیں؛ آپؐ کی جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کی امامت نہیں کرسکیں گے، آنحضرتؐ نے فرمایا: ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں، عورتوں کے طبقہ کا طرزِ گفتگو وہی ہے جو ان عورتوں کا تھا جن سے حضرت یوسف علیہ السلام کو سابقہ پڑا تھا"[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کی قیادت کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ پر بھیجا، یہ ایک بڑا منصب تھا، اور اہم ذمّہ داری، ۹ھ میں حج فرض ہوا ہے، اور اسی سال رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیرالحج بنا کر روانہ کیا، تاکہ وہ لوگوں کو اپنی رہبری میں حج کرائیں، مشرکین حج کے موقعہ پر اپنی جگہوں پر تھے، مسلمانوں میں جن لوگوں نے حج کرنا چاہا انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حج کیا، ان مسلمانوں کی تعداد تین سو کی تھی جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

۲۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قوتِ برداشت اور ثابت قدمی اور فیصلہ کن لمحات میں دل کی مضبوطی اس وقت ظاہر ہوئی جب کہ مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت کی گھڑی آئی جو مسلمانوں کے لئے بڑے امتحان کا وقت تھا یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا حادثہ، اس حادثہ کی خبر مسلمانوں پر بجلی بن کر گری، کچھ لوگ تو اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، جن میں پیش پیش خود حضرت عمرؓ تھے، جو باوجود اپنی عقل کی پختگی اور دل کی مضبوطی کے

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۶۴۳-۶۴۶ ، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ تم اس سے ڈر رہی ہو کہ اگر تمھارے والد کی امامت کے زمانہ میں میری وفات ہو گئی تو لوگ تمھارے والد کو مطعون کریں گے کہ ان کی نیابت نامبارک تھی، مگر اس کو اس انداز میں کہتی ہو کہ والد صاحب بہت رقیق القلب ہیں، امامت کا حق نہ ادا کرسکیں گے۔

اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، انھوں نے مسجد میں آکر لوگوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ جب تک سب منافق فنا نہ ہو جائیں گے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات نہیں ہو سکتی۔[1]

اس وقت بروقت کام آنے والے شخص کی ضرورت تھی، جس کے اندر پہاڑ جیسی عزیمت ہو جو نہ ٹلے نہ ہٹے، اس خبر کے ملتے ہی حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر سے آئے مسجد کے دروازہ پر گھوڑے سے اُترے، حضرت عمرؓ اس وقت لوگوں کو خطاب کر رہے تھے، وہ کسی طرف ملتفت نہیں ہوئے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تشریف لے گئے جہاں حضورؐ کا جسد مبارک تھا جس پر ایک چادر ڈال دی گئی تھی، آپ نے چادر ہٹا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا، اور کہا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، وہ موت جو اللہ نے مقرر کردی تھی، وہ آپؐ نے آزمائی، اب اس کے بعد کوئی بھی موت آپؐ پر طاری نہیں ہوگی، پھر چادر سے چہرۂ انور کو ڈھک دیا اور باہر نکل آئے اس وقت تک حضرت عمرؓ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، آپ نے فرمایا! ذرا ٹھہرو عمرؓ اور سنو! مگر وہ مُصر رہے کہ بولتے رہیں، جب حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ عمرؓ خاموش نہیں ہو رہے ہیں، تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، لوگوں نے جب آپ کی بات سُنی تو آپ کی طرف بڑھ گئے اور حضرت عمرؓ کو چھوڑ دیا، آپ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

"لوگو! تم میں سے جو بھی محمد کی پرستش کرتا ہو وہ سن لے کہ محمد گزر گئے (عربی میں لفظ "مات" ہے) اور جو شخص کہ اللہ کی پرستش کرتا ہے، اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔"

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:۔

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۹

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ	اور محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاِئِنْ مَّاتَ	(خدا کے) پیغمبر ہیں اُن سے پہلے بھی بہت سے
اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط	پیغمبر ہو گزرے ہیں، بھلا اگر یہ مر جائیں یا
وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ	مارے جائیں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ،
يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَسَيَجْزِي اللّٰهُ	اور جو اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا کا کچھ
الشّٰكِرِيْنَ.	نقصان نہیں کر سکے گا اور خدا شکر گزاروں
(سورۃ آل عمران - ۱۴۴)	کو بڑا ثواب دے گا۔

جنھوں نے یہ منظر دیکھا ان کا یہ کہنا ہے کہ بخدا لوگوں کی یہ حالت تھی کہ گویا لوگوں کو اس آیت کے نازل ہونے کا پتہ نہ تھا، جب ابوبکرؓ نے اس آیت کی تلاوت کی تب معلوم ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے اس آیت کی تلاوت کی تو میں حیرت زدہ رہ گیا[1] اور یقین کر لیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی[2]۔

۳-۴ حضرت ابوبکرؓ کو اسلام کا صحیح ادراک اور کس درجہ سچا اور حقیقی فہم حاصل تھا، اور دین کی اصلیت اور اس کی بقا کے لئے اُن کے اندر کتنی غیرت تھی کہ دین اسی نہج پر قائم رہے جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو چھوڑا تھا، اس کا اندازہ اُن کے اس جملہ سے ہو سکتا ہے، جو اُن کے صحیح جذبات کی ترجمانی کرتا اور حمایتِ اسلام و حمیتِ دینی میں ان کا مقام معیّن کرتا ہے، وہ ایک جملہ جو طویل و بلیغ خطبوں کے برابر بلکہ ایک ضخیم کتاب کے

---

[1] عربی لفظ "عقرت" ہے جس کے معنی ہیں، حیرت زدہ ہونا۔

[2] سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۶۵۵-۶۵۶ نیز بخاری نے "باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" میں ایک طویل حدیث میں اس کو روایت کیا ہے۔

برابر ہے، یہ جملہ اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب کہ بہت سے عرب قبیلوں نے بیت المال میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار کر دیا تھا، اور اس کی فرضیت کے منکر ہو گئے تھے[۱]، وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، اور شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی، آپ نے فرمایا "قد انقطع الوحی وتمّ الدّین أینقص الدّین وأنا حیّ[۲]"، وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اور دین مکمّل ہو چکا، کیا میرے جیتے جی دین میں کمی کی جائے گی؟ مانعینِ زکوٰۃ چونکہ زبانی طور پر اسلام کا نام لیتے اور بہت سے احکام کو تسلیم کرتے تھے، اس لئے متعدد بڑے بڑے صحابہ کو اُن سے جنگ کرنے کے معاملہ میں تأمّل تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے اور فیصلہ میں ایک لمحہ کے لئے تبدیلی نہیں آئی، اور اس معاملہ میں اُن کے اندر کوئی لچک یا تردّد پیدا نہیں ہوا، اُن کا یہ قول روایت کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا "اگر ان قبائل نے بکری یا اونٹ باندھنے کی ایک رسّی[۳] بھی (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں دیا کرتے تھے) نہیں دی تو میں اُن سے جنگ کروں گا، زکوٰۃ مال کا حق ہے، اور بخدا میں قطعی طور پر اس سے مقابلہ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا[۴]"۔

حقیقتاً اس وقت خلیفۂ وقت کو زکوٰۃ نہ دینا اسلام کی عمارت میں ایک شگاف

---

[۱] زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے کے بارے میں عرب قبائل کی آراء کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔۔۔ "ارکان اربعہ" از مؤلف (رکن زکوٰۃ) نیز علامہ خطّابی کی "معالم السّنن" میں بحث "انواع المانعین"۔

[۲] مشکوٰۃ میں مذکور ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے خلیفۂ رسول اللہ! لوگوں کو ملایئے اور ان کے ساتھ نرم دلی فرمایئے، تو فرمایا کہ تم جاہلیت میں سخت تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد تم میں کمزوری آگئی؟ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا، دین مکمل ہو گیا، کیا میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت کی جائے گی؟ (روایت رزین)

[۳] ایک روایت میں "عناق" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں، بکری کا بچہ اور دوسری روایت میں "عقال" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جانور باندھنے کی رسّی۔ [۴] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۱

ڈالنے کے مرادف تھا جس سے بغاوت اور انتشار کی کا دروازہ کھل جاتا، اگر خدانخواستہ حضرت ابوبکرؓ اس میں سہل انگاری سے کام لیتے اور اُن کی سرکوبی میں سستی برتتے تو اُن کے بعد کوئی بھی اس شگاف کو پُر نہ کرسکتا، اور اس کے بعد دوسرے دروازے کھلنا شروع ہوجاتے نماز کے بارے میں بھی لوگ کہتے کہ مساجد میں جمعہ اور جماعت کی کیا ضرورت ہے ہم اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیں گے، روزہ کے بارے میں کہتے کہ رمضان کی کیا قید اور اس ابتداء اور انتہاء کے وقت متعیّن کرنے کی کیا ضرورت ہے، کچھ لوگ حج کے سلسلہ میں موشگافی کرتے اور کہتے کہ معیّن مناسک ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے، اور کیوں اس کو ایک خاص وقت ہی میں ادا کیا جائے، اسی طرح اور بھی باتیں پیش آسکتی تھیں، خلافتِ نبی اور امارتِ شرعیہ جس سے حدود اور احکام مرتبط ہیں، ایک ایسے دریا کے مانند ہوجاتے جس میں پانی نہ ہو جیسے شاعری میں فنِ عروض کی بحریں ہوتی ہیں (کہ نام اُن کا "بحر" ہے اور پانی کا ایک قطرہ نہیں) اسلام کی لڑی ٹوٹ جاتی، اور اس کے دانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بکھر جاتے[۱] لہٰذا حضرت ابوبکرؓ کا یہ رویہ جس میں کوئی کمزوری اور ڈھیلاپن نہیں تھا، اور جس میں انھوں نے کوئی سودا کرنا یا اُس سے دست بردار ہونا قبول نہیں کیا، یہ ایک الہامی طرز فکر تھا جس سے اسلام کی صداقت اور عظمت ثابت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین اپنی اصلیت اور خالص شکل میں موجود ہے۔[۲]

اس تاریخی حقیقت کو سبھوں نے تسلیم کیا ہے، اور تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ارتداد کی بیخ کنی

---

[۱] یہ عبارت مؤلف کی کتاب "ارکانِ اربعہ" سے مقتبس ہے۔ [۲] جنگِ ارتداد کے بارے میں بعض معاصر مصنفین کا خیال ہے کہ اس کو ہوا دینے اور بھڑکانے میں اہلِ کتاب کا بڑا ہاتھ تھا، ان کو جزیرۂ عرب میں اپنے اثر و نفوذ بڑھانے اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنے کا موقع نہیں رہا تھا، اس لئے انتقام میں وہ اہلِ ردّہ کو مشتعل کر رہے تھے۔

ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری اپنی تالیف "اثر اهل الکتاب فی الفتن والحروب الأهلية فی القرن الاول الهجری" (پہلی صدی ہجری میں فتنہ اٹھانے اور خانہ جنگی برپا کرنے میں اہلِ کتاب کے اثرات) میں لکھتے ہیں:

"یہ آپس کے پیکٹ دراصل یہودیت کی سازشی شورش تھی جو اہلِ بادیہ کی جانب سے تحریکِ ارتداد کا نقاب ڈالے ہوئی تھی، اس کے ذریعہ اہلِ کتاب نے زیادہ وسیع پیمانے پر سختی اور جوش کے ساتھ مسیلمہ کی قیادت میں اپنی ٹولیوں کو اکٹھا کرنے کا موقع حاصل کر لیا!"

ص ۱۷۹-۱۸۶

کرتے ہیں اور اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا جو کردار تھا وہ انبیاء اور پیغمبروں کا کردار تھا، جو انھوں نے اپنے زمانوں میں ادا کیا تھا، اور یہی نبوت کی خلافت کا حق تھا، جسے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں ادا کیا، اور مسلمانوں کی دعا اور تحسین کے مستحق ہوئے، اور جب تک کہ آسمان وزمین قائم ہیں وہ مستحق رہیں گے۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند اور ناپسند کو اچھی طرح سمجھنا اور انتہائی باریک بینی کے ساتھ اُن کا جائزہ لینا، اور اس بات کی کوشش کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی خواہشوں کے عین مطابق تمام امور انجام پائیں، اس کا نمونہ حضرت ابوبکرؓ کے اس اصرار میں ملتا ہے، جب انھوں نے حضرت اُسامہؓ کی قیادت میں فوج بھیجی، جیشِ اُسامہ کے بھیجنے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارادہ فرما چکے تھے، اور یہ جماعت روانہ ہوگئی تھی، مگر مدینہ سے ایک فرلانگ دور جرف میں اُتری تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رفیق اعلیٰ سے مل گئے، جماعت وہاں پر رُک گئی، مگر حضرت ابوبکرؓ نے اس کی تیاری کا حکم دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش اور ارادہ کے احترام کا یہ جذبہ تھا، ورنہ مدینہ سے اس وقت فوج بھیجنے کا کوئی مشورہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں ارتداد اختیار کرنے والے مدینہ پر حملہ نہ کردیں، یا دوسرے دشمن کسی اور طرف حملہ آور نہ ہو جائیں لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنے ارادہ میں اٹل رہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے اس واقعہ کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، ابوالأعرج حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: "اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر ابوبکرؓ خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی" اس بات کو انھوں نے دوبارہ سہ بارہ دہرایا، پھر جیش اُسامہ کے بھیجے جانے کا واقعہ بیان کیا، اور اس سلسلہ میں فرمایا:

"حضرت ابوبکرؓ نے جیش اُسامہ کو روانہ کر دیا اور کہا: جس جیش کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ کردیا تھا، اُسے واپس نہیں ہونے دوں گا، وہ جھنڈا جس کو رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے، اس کو میں نہیں کھولوں گا" چنانچہ جب اُسامہ اُن قبائل کی طرف سے گزرتے جو مائل بہ ارتداد تھے تو وہ لوگ آپس میں کہتے: اگر اُن لوگوں کے پاس قوت نہ ہوتی تو اس طرح نہیں نکل سکتے تھے، اُن کو جانے دیا جائے کہ روم سے مقابلہ کریں (دیکھیں کیا ہوتا ہے) چنانچہ یہ لوگ رومیوں سے لڑے اُن کو شکست دی اور خود صحیح و سالم واپس آئے اس پر یہ مذبذبین اسلام پر ثابت قدم رہے"۔[1]

وہ لوگ جو مرتد ہو کر ملت سے کنارہ کش ہو گئے تھے، اور کفر کی طرف مائل ہو گئے تھے، اور وہ لوگ جنھوں نے اسلام کے احکام سے روگردانی کی اور نماز وغیرہ کا انکار کرکے اُو جاہلیت کی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ٦ ص ٣٠٤، واضح رہے کہ یہ وہ عرب قبائل کے بدو تھے جن کے دلوں میں اسلام کی عظمت جاگزیں نہیں ہوئی تھی، کیونکہ یہ لوگ مرکز اسلام اور دار ہجرت (مدینہ منورہ) سے دور رہے، جو ایمان کی پرورش اور اسلام کی عملی تربیت کے لئے ایک ایمانی درسگاہ تھی اور جہاں اسلامی ماحول تھا، اور جہاں یہ ممکن تھا کہ اسلام کو اچھی طرح سمجھ کر دل سے اس کے لذت شناس ہوتے اور دین کی محبت ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی، نیز یہ کہ اُن کے اندر قدیم جاہلیت کی رگ زندہ تھی، ربیعہ و مُضَر، عدنان اور قحطان کے درمیان کی آویزشیں اور قبائلی عصبیت، خاندانی اختلافات کی روح باقی تھی، یہی وہ بدو تھے، جن کے بارے میں قرآن نے کہا "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" (الحجرات۔ ۱۴) ترجمہ (دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ تم اسلام لائے ہو، ایمان تو ہنوز تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) اور ایک جگہ فرمایا: "فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (سورۃ النساء۔ ۸۹) ترجمہ (تو جب تک وہ خدا کی راہ میں وطن نہ چھوڑیں ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔)

راہ پر چلنے لگے تھے یعنی وہ لوگ جن کو خطّابی نے قسم اوّل میں شمار کیا ہے، اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کی اور زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر بیٹھے جن کو خطّابی قسم دوم میں شمار کرتے ہیں حضرت ابوبکرؓ کا اُن سب سے قتال کرنا اس بنیاد پر تھا کہ یہ سب ارتداد کے مجرم تھے، جو بات دین میں قطعیت کے ساتھ فرض ہے، اس کے یہ لوگ منکر تھے، اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے کہا تھا کہ واللہ میں اُن لوگوں سے قتال کروں گا، جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کریں گے، کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔

رہا اُن لوگوں سے حضرت ابوبکرؓ کا قتال کرنا جو امام کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے تھے، اور اس پر قبضہ کر کے اپنی ملکیت بنانا چاہتے تھے، یا اپنے قبیلہ میں اپنی مرضی سے تقسیم کرنا چاہتے تھے، یا وہ لوگ جو زکوٰۃ دینے پر راضی تھے، اس کو روکا نہیں تھا مگر اُن کے سردار اُن کو روک رہے تھے، اُن سب سے قتال حضرت ابوبکرؓ نے اس بنیاد پر کیا کہ یہ لوگ باغی تھے، اور باغی سے قتال قرآن سے ثابت ہے، اور تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ۔ (سورۃ حجرات - ۹)

اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ایسے تمام قبائل کے فتنہ کا قلع قمع کر دیا، جنھوں نے ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، پھر مدعیانِ نبوّت کی سرکوبی کی، یہ بھی سخت فتنہ تھا، اگر باقی رہ جاتا اور پھیلتا تو اسلام کا نام و نشان نہ رہتا، اس سلسلہ میں مُسیلمہ کذّاب کیفرِ کردار کو پہونچا[1]، صدیق اکبرؓ نے اہلِ ارتداد کا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، البدایۃ والنہایۃ - ج ۶ ص ۳۲۴۔ ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری لکھتے ہیں:-
"مسیلمہ کی طاقت کو پسپا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ارتداد کی جنگ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی جو اسلام کیلئے بہت بڑا خطرہ تھی، اور اہلِ کتاب جو جزیرۂ عرب میں اپنا نفوذ قائم کرنا چاہتے تھے ان کی آخری کوشش تھی جو ناکام ہو گئی، اور جزیرۂ عرب کیلئے وہ وقت آ گیا کہ اطمینان کے ساتھ اللہ کے دین پر قائم رہے، اور چونکہ مسیلمہ کی طرح کسی اور میں قوت نہ تھی اسلئے مسلمانوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا"۔
(اثر اہل الکتاب فی الفتن والحروب الاہلیۃ فی القرن الاول الہجری ص ۱۸۸) (باقی ص ۱۱۲ پر)

خاتمہ کیا، مانعینِ زکوٰۃ کی سرکوبی کی گیارہ[۱] قائدین جیش کے دستے مقرر کیے، جنھوں نے سجاح، بنی تمیم[۱]، الفجاءۃ کے فتنوں کو خاک میں ملا دیا، اسکے نتیجہ میں اہلِ بحرین، اہلِ عمان، مہرہ اور اہلِ یمن اسلام کے دائرہ میں واپس آئے، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں کفار، مشرکین اور مرتدین جو عراق اور جزیرۂ عرب میں ہلاک و مقتول ہوئے انکی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں ہے[۲]، ابن کثیر اس حقیقت پر صداقت و بلاغت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"حضرت ابوبکرؓ دین سے کٹنے والے بھگوڑوں کو دوبارہ واپس لائے، حق اپنی ہیئت میں واپس آیا، جزیرۂ عرب کی سرزمین پورے طور پر ہموار ہوگئی اور دُور دَراز کے لوگوں اور قریب کے رہنے والوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔"[۳]

محمد بن اسحاق کہتے ہیں:۔

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات ہوئی تو عربوں میں ارتداد نے پاؤں نکالے یہودیت اور نصرانیت سر اُٹھانے لگی نفاق اُبھرنے لگا اور مسلمان ایسے ہوگئے جس طرح بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑ بکرے سرد راتوں میں سمٹے سمٹائے ہوں کیونکہ اللہ کے نبی دنیا سے تشریف لے جاچکے تھے اور یہ حالت اس وقت تک رہی جبتک کہ اللہ نے اُن سبھوں کو حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں یکجا نہ کردیا۔"[۴]

"حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن الولید کو عراق بھیجا اور انھوں نے اس کے بڑے حصّہ کو فتح کرلیا، اسی طرح الأنبار اور دومۃ الجندل کے معرکوں میں فتحیاب ہوئے اس کے علاوہ متعدد معرکے اور جنگیں ہوئیں جن میں فتح اسلام کی ہوئی۔"[۵]

(باقی ص۱۱۱ کا) اسی سلسلہ میں وہ کہتے ہیں:۔

"تحریک ارتداد کے لیڈروں کے زوال کے بعد ہی جزیرہ نمائے عرب اسلام کے جھنڈے کے تحت متحد ہوسکا یا یوں کہیے کہ یہاں کے باشندے اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت میں پیوست ہوگئے، اور اہلِ کتاب کا جزیرۂ عرب میں سیاسی نفوذ ختم ہوا۔" (ایضاً ص۱۹۰)

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص۳۱۹ [۲] ایضاً ص۳۲۹ [۳] ایضاً ص۳۳۲ [۴] ایضاً ج ۵ ص۲۷۹
[۵] ایضاً ج ۷ ص۳

اس طرح عربوں میں امن و امان بحال ہوا، وہ عرب جو اسلام کی اساس اور رأس المال تھے، اور جزیرۂ عرب کو استقرار حاصل ہوا، جو کہ اسلام کا سرچشمہ اور مرجع تھا، جس سے ہر معاملہ میں رجوع کیا جاتا تھا، اسی طرح فتوحات کی لہر عراق اور شام تک پھیل گئی، اور مسلمان اس کوشش میں مشغول ہو گئے کہ اسلام کا سایہ زیادہ سے زیادہ رقبۂ زمین پر چھا جائے، اور اس کی مملکت اور آراضی پڑوسی ممالک تک وسیع ہو جائیں، اور یہ سلسلہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے عہد تک جاری رہا، جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے دنیا سے کوچ کیا اس وقت دمشق فتح ہو چکا تھا، اور یرموک کا فیصلہ کن معرکہ ختم ہونے کے قریب پہونچ چکا تھا، حقیقت یہ ہے کہ جتنی فتوحاتِ اسلامیہ ہیں، وہ خواہ حضرت عمر رضؓ اور عثمان غنی رضؓ کے عہد میں ہوئی ہوں بلکہ اُمویین کی حکومت کے وقت بھی جو حصّے اسلامی مملکت میں داخل ہوئے وہ سب ان کوششوں کا نتیجہ تھے، جو حضرت ابوبکر رضؓ نے اپنے عہد میں کیں، اور یہی وہ بنیاد تھی، جس پر کہ اسلام کا سیلِ رحمت بہا، پھیلا اور پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لیا۔

(۶) جہاں تک دنیاوی راحت و آسودگی سے بے رغبتی، دنیا طلبی سے پرہیز، اور مسلمانوں کے بیت المال سے فائدہ اٹھانے میں انتہائی محتاط رویہ اختیار کرنے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں سیرت ابوبکر رضؓ سے دو مثالیں دینا کافی ہوگا، پہلا واقعہ یوں ہے:۔

"کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی اہلیہ کو کسی میٹھی چیز کی خواہش ہوئی حضرت ابوبکر رضؓ نے فرمایا کہ ہمارے پاس اتنا نہیں ہے جس سے میٹھا خرید سکیں اہلیہ محترمہ نے جواب دیا لیکن میں روزانہ کے خرچ میں سے چند دن میں اتنا کچھ بچا سکتی ہوں جس سے میٹھا تیار کرنے کا سامان ہو سکتا ہے حضرت ابوبکر رضؓ نے کہا کہ اس میں مضائقہ نہیں تمھیں اختیار ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایسا ہی کیا گیا

کچھ دنوں میں اتنے پیسے جمع ہوئے جس سے کچھ سامان لایا جا سکے، جب انھوں نے اس کو پیش کیا کہ اس سے میٹھی چیز تیار کرنے کا سامان بازار سے منگوالیں تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کو لے کر بیت المال میں داخل کر دیا، اور کہا کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس سے کم میں ہمارا کام چل سکتا ہے، لہٰذا آئندہ سے روزینہ اتنا کم کر کے دیا جائے، اور بیت المال کو اپنی ملکیت میں سے اتنا دلوا دیا جو روزانہ کی ضرورت سے زیادہ لیا کرتے تھے۔"[1]

جب حضرت ابوبکرؓ کا اخیر وقت ہوا تو فرمایا:۔

"اے عائشہؓ وہ اونٹنی جس کا ہم دودھ پیا کرتے تھے، اور وہ پیالہ جس میں ہم سالن رکھتے تھے، اور وہ جبہ جو ہم پہنا کرتے تھے، یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ہم اس وقت فائدہ اٹھاتے تھے، جب مسلمانوں کے والی تھے، جب میں مرجاؤں، یہ چیزیں عمرؓ کو دے دینا، چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا تو وہ حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دی گئیں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ کی رحمت ہو تم پر ابوبکرؓ تم نے تو اپنے بعد میں آنے والوں کو بڑی مشقت میں ڈال دیا۔"[2]

اسلام میں شورائی نظام اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت

زمانۂ قدیم میں نسلی موروثی حکومت اور نسل در نسل ایک خاندان کی روحانی و دینی پیشوائی کا رواج تھا، اور جس وقت کہ اسلام آیا اور اس کا عروج شروع ہوا، اس وقت دنیا ان دو

---

[1] الکامل فی التاریخ لابن الاثیر ج ۲ ص ۴۲۳

[2] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۷۲ (المطبعۃ المیمنیۃ مصر ۱۳۰۵ھ)

موروثی و خاندانی سلطنتوں (دنیوی و دینی) کے بوجھ سے دبی کچلی چلی آرہی تھی، ایک دنیوی و انتظامی حکومت تھی جو مطلق العنان بادشاہوں کی ملکیت تھی، اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی، یا خاندانوں کے کسی فرد سے اس کی وصیت کے بموجب دوسرے فرد کو، یا کسی قسمت آزما فرد کو اپنے زورِ بازو اور حسنِ تدبیر سے مل جاتی بلا کسی صلاحیت و استحقاق کے اور بلا اس لحاظ کے کہ ملک اور قوم کے لئے سازگار ہے یا نہیں، ملک کی تمام آمدنیاں اُن بادشاہوں کی ملکیت ہوا کرتی تھیں، مال کے خزانے بھرنے، اعلاترین اور گرانقدر اشیاء اور تحائف کو اکٹھا کرنے اور عیش و آرام کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور زندگی سے لُطف اندوز ہونے اور زندگی کو باغ و بہار بنانے اور مال و عظمت کے مظاہر میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش میں لوگ افسانوی اور ناقابلِ یقین حد تک پہونچ گئے تھے[1] سوائے اُن لوگوں کے جنھوں نے تاریخ قدیم کا مطالعہ کیا ہے، دوسروں کے لئے اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، یہ شاہانِ وقت موروثی طور پر حکومت کے مالک ہوتے اور اپنے کو بنی نوع انسان سے بلند کوئی نوع تصوّر کرتے، عوام یہ سمجھتے کہ ان کی رگوں میں مقدّس اور الٰہی خون ہے۔

دوسری طرف عوام انتہائی ناداری، تنگ حالی، مشقت، بے کاری اور مایوسی اور گریہ و زاری کی زندگی گزار رہے تھے، جن کے قصے آج بھی دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں، اور آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، یہ مفلوک الحال عوام پیٹ کی آگ بُجھانے اور ستر چھپانے کے لئے سخت ترین مشقتیں برداشت کرتے تھے، نت نئے ٹیکس اور خراج کے بوجھ تلے سسک رہے تھے، آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے چکی کے دو پاٹ میں پس رہے تھے، ان کی زندگی جانوروں سے ممتاز نہیں تھی[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو "السیرۃ النبویہ" از مؤلف ص۳۵-۳۶، [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" از مؤلف (فصل: عصر جاہلی میں سیاسی و مالی نظام)

دوسری سلطنت روحانی اور دینی قیادت کی شکل میں تھی، یہ دینی سربراہی کا خاص نظام تھا جس میں یہ قیادت ایک خاص خاندان اور خاندان کی معیّن شاخ کو حاصل ہوتی، دینی رہنمائی اس کی جاگیر ہوتی اور اس کا وہ احترام کیا جاتا جو تقدیس کی حد تک پہنچ جاتا، یہ دینی تقدّس نسل در نسل باپ سے بیٹے کو اور ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا، اور یہ "جاگیردار" بھی اپنے اقتصادی منافع اور اپنی نفسانی اور شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کی دُھن میں لگا رہتا، یہ "خالق و مخلوق" "بندے اور خدا" کے درمیان واسطہ بنا ہوا تھا، اکثر حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیتا، اور آزادی کے ساتھ مذہبی قوانین بناتا اور اُن کو نافذ کرتا، اللہ تبارک تعالےٰ نے قرآن مجید میں اس صورتِ حال کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے زیادہ باریک بینی کے ساتھ کوئی بیان نہیں کر سکتا :۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ	مومنو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے
الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ	عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ	کھاتے ہیں اور (اُن کو) راہِ خدا
عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (سورۃ توبہ۔ ۳۴)	سے روکتے ہیں۔

عیسائیوں میں اس طبقہ کو "اکلیروس" (CLERGY) کہا جاتا تھا،[1] لبنانی عیسائی دانشور و محقّق بطرس البستانی اس لفظ کی شرح میں لکھتے ہیں :۔

"اس نام کا اطلاق عیسائیوں کے نزدیک دین کے خدمت گاروں پر ہوتا ہے، ان کا یہ لقب اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ خدائی حصہ ہیں یا اس کی میراث جس طرح حضرت موسیٰ کی وحی میں سبط لاوی کو میراث رب

---

[1] اکلیروس کے معنی (یونانی میں) حصہ یا ورثہ کے ہیں۔

کہا گیا ہے، قدیم مصری قوموں اور عبرانیوں کے نزدیک ایک طبقہ عبادت ادا کرنے کے لئے مقرر تھا، مسیحی کلیسا میں ابتداء ہی سے کچھ نگراں ہوتے تھے، جو اس کی پالیسیاں بناتے، اگر کلیسا کو کچھ فراغت اور خوش حالی حاصل ہوتی تو ان پادریوں کی بن آتی، یہ لوگ محض دینی خدمت گار اور روحانی مُربّی ہی نہیں تھے، بلکہ اس وقت تمام علم و دانش کے محور بھی سمجھے جاتے تھے، رومی شہنشاہیت کے زمانہ میں یہ پادری عوامی ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے تھے، اور ان سے کوئی مطالبہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ عوامی بہبود کا کوئی کام کریں، ان کو بھی ایک طرح کی حکومت حاصل تھی، اپنے دائرہ کے اندر بھی اور دائرہ کے باہر، عوام پر بھی[1]۔

یہی قدیم ایران (فارس) کا حال تھا، دینی سیادت کی نمائندگی کوئی خاص قبیلہ کرتا تھا، گزشتہ زمانوں میں "میدیا" قبیلہ کو یہ سیادت ملی ہوئی تھی، اور زردشت کے پیروکاروں کے زمانہ میں قبیلہ "المغان" کو یہ روحانی نفوذ حاصل تھا۔

روحانی قبیلہ کے لوگ زمین پر سایۂ خداوندی سمجھے جاتے جو خدائی حکومت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور ایسا حاکم صرف اسی قبیلہ میں پیدا ہوسکتا تھا، اور وہ ذات خداوندی میں مُدغم سمجھا جاتا اور آتش خانے کی حفاظت اور رکھوالی اس گھرانہ کی میراث ہوتی[2]۔

ہندوستان میں برہمنوں کی نوعیت اسی طرح کی تھی، مذہب اور تقدس کے یہ جاگیردار تھے، اور ہندی قانون کے بموجب انھیں ایک اعلیٰ مرکز اور بلند مرتبہ حاصل ہوتا جس میں ان کی برابری کوئی نہیں کرسکتا تھا، برہمن کے متعلق یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ بخشا بخشایا ہوا ہے،

---

[1] دائرۃ المعارف البستانی۔ ج ۴ ص ۱۴۶ طبع بیروت ۱۸۷۶ء

[2] ملاحظہ ہو کتاب "ایران بعہد ساسانیان" از آرتھر کرسٹن سین۔

خواہ وہ اپنے گناہوں سے تینوں عالم کو تباہ کر ڈالے، محاصل سے وہ مستثنیٰ تھے، اگر وہ کسی کو قتل کرتے تو کسی حال میں بھی اُن سے بدلہ نہ لیا جاتا، دینی رسوم و عبادات کی ادائیگی اُن ہی کے ذریعہ سے ممکن تھی۔[1]

اسلام نے موروثی جاگیرداری کے اُن دونوں طریقوں کا خاتمہ کر دیا، جنھوں نے انسانیت پر ظلم کے ایسے پہاڑ توڑے جن کے نمونے اور مثالیں روم، ایران اور ہندوستان کی تاریخوں میں دیکھی جا سکتی ہیں[2]، اسلام نے خلیفہ کے منتخب کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں اور اہلِ تقویٰ اور اہلِ علم و اخلاص کے سپرد کر دی، اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا، اگر ایسا کرنا دینی فرائض میں داخل ہوتا اور اس کو صراحت کے ساتھ بتا دینا ضروری ہوتا تو آپؐ اس حکم کی تنفیذ ضرور فرماتے کیونکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ (سورۃ المائدہ ـ ٦٧)	اے پیغمبرؐ! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو، اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

اور اللہ تعالےٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:۔

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ	اور جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں اُن میں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "السیرۃ النبویۃ" ص ۳۸ بحوالہ "منوشاستر"۔
[2] ملاحظہ ہو کتاب "ایران بعہد ساسانیان" از آرتھر کرسٹن سین۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا	یعنی خدا کا یہی دستور رہا ہے اور خدا کا
الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ	حکم ٹھیر چکا ہے اور جو خدا کے پیغام
وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا	(جُوں کے تُوں) پہنچاتے اور اس سے
اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۔	ڈرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں
(سورۃ الأحزاب ۔ ۳۸ ۔ ۳۹)	ڈرتے اور خدا ہی حساب کرنے کو کافی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ "جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری وقت آیا اس وقت گھر میں کچھ لوگ تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آؤ تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہ ہونے پاؤ، کچھ لوگوں نے کہا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف زیادہ ہے، اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے، ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے، اس معاملہ میں گھر والے ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے اور آپس میں جھگڑنے لگے، اُن میں کوئی کہتا تھا (کاغذ قلم) آپؐ کے قریب کردو تاکہ تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم راہ سے نہ بھٹک سکو، کچھ لوگ اس کے خلاف کہہ رہے تھے، مگر جب زیادہ گفتگو بڑھی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "چلے جاؤ"[1]۔

کاغذ طلب کرنے کے بعد تین[2] روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس نہیں طلب فرمایا، اور خلافت کے سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی، اُس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا۔

آپؐ نے جو وصیتیں فرمائی تھیں، اُن میں یہ تھا "الصّلاۃ وما ملکت أیمانکم" نماز اور ان لوگوں کا خیال رکھنا جو تمہارے زیرنگیں (غلام اور باندیاں) ہیں۔

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری کتاب المغازی (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ووفاتہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا" رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نماز، زکوٰۃ اور غلام اور باندیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی"۔[۱]

اور اُن ہی وصیتوں میں یہ ارشاد بھی ہے" اللہ یہود و نصاریٰ کو ہلاک کرے جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا"۔[۲]

حضرت عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا" جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وقت آگیا تو آپؐ اپنے سیاہ کمبل سے چہرۂ مبارک ڈھکنے لگے، جب دیر تک اسی حال میں رہے تو پھر چہرۂ مبارک کھول دیا اور اسی حال میں فرمایا:۔

" اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا لیا اُن کے اس فعل سے آپؐ اُمّت کو آگاہ اور منع فرما رہے تھے"۔[۳]

" حدیث قرطاس" کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے استاذ عباس محمود العقاد نے لکھا ہے:۔

" یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ ہی وہ تھے جو نبی علیہ السلام کے وصیّت کے نفاذ میں حائل ہو گئے اور آپؐ کو حضرت علیؓ کے خلیفہ معیّن کرنے سے روک دیا انتہائی رکیک اور بے وزن بات ہے، کسی بھی قابلِ ذکر شخص کی طرف ایسی بات منسوب کرنا اس کی اہانت ہے، چہ جائیکہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کی طرف، اور جس نے اس سے اتفاق کیا ہو، حقیقت میں نبی علیہ السلام نے کاغذ اس لئے نہیں طلب فرمایا تھا کہ علیؓ یا کسی اور کے خلیفہ بنانے کی وصیّت فرمائیں، کیونکہ خلافت کی وصیّت لکھنے کی ضرورت نہ تھی، ایک لفظ کافی تھا، ایک اشارہ بھی بہت تھا، جیسے حضرت ابوبکرؓ کو جب نماز کے لئے

---

[۱] رواہ البیہقی و احمد   [۲] مالک فی المؤطا، ابن کثیر ج ۴ ص ۱۷۴

[۳] بخاری باب مرض النبی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم و وفاتہ۔

بڑھایا تو اشارہ کر دیا، اور سبھوں نے سمجھ لیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کیا منشاء ہے۔

طلبِ قرطاس کے بعد تین روز تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم حیات رہے، مگر دوبارہ کاغذ نہیں مانگا، اور حضرت علیؓ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے درمیان کوئی حائل نہ تھا حضرت فاطمہؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ محترمہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں آپ کی روح پرواز کرنے کے وقت تک موجود تھیں، اگر آپؐ چاہتے تو حضرت علیؓ کو بلوا کر اپنا جانشین نامزد فرما دیتے۔

قطع نظر اس سکوت سے جس کے پیچھے کوئی جبر یا زور نہ تھا، کسی امر کی ولایت یا سربراہی سپرد کرنے کے سلسلے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہمیشہ سے یہ طرز عمل رہا ہے کہ اپنے افراد خاندان کو ولایت سے علیحدہ رکھتے، اور انبیاء پر وراثت کے قانون کو جاری کرنا صحیح نہ سمجھتے، آپؐ کا یہ طریقۂ عمل اور یہ سکوت دونوں کو ملا کر دیکھئے تو پتہ نہیں چلتا کہ محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ فرمایا تھا اور آپؐ کے ارادہ کو صاف صاف بتانے میں کوئی حائل ہو گیا؟[1]

استاذ العقاد نے اپنی کتاب "عبقریۃ علی" میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خلافت بربنائے وراثت پر گفتگو کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے:—

"اگر وہ (وراثت) اللہ کے احکام میں سے کوئی حکم ہوتا تو یہ عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم بغیر کسی اولاد ذکور[2] کے اس دنیا سے تشریف

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۶۱۹ للأستاذ عباس محمود العقاد (دار الفتوح، القاهرة)

[2] فرزندانِ رسول میں سے ایک صاحبزادہ قاسمؓ تھے، انہی کے نام پر حضورؐ کی کنیت (باقی ص ۱۲۲ پر)

لے جائیں، اور قرآن مکمل ہو جائے اور اس میں اہلِ بیت میں سے کسی کی خلافت
کا ذکر نہ ہو، اور اگر یہ تقدیر و نشائے خداوندی کی بات ہوتی یا دین کی ضروریات
میں سے کوئی ضرورت ہوتی تو دنیاوی زندگی ہی میں قضائے مبرم کی طرح اس کا
نفاذ ہو جاتا، اور اس کے خلاف خلافت کی ہر کشمکش ناکام و بے نتیجہ رہتی جیسا کہ
ہر کوشش جو قوانینِ فطرت کے خلاف ہوتی ہے، ناکام ہو جاتی ہے۔

لہٰذا نہ تو صراحۃً کوئی نص ہے نہ حالات کی رُو سے اشارہ ملتا ہے، نہ ارادۂ
الٰہی معلوم ہوتا ہے جو ان لوگوں کی تائید کرے جو خلافت بربنائے وراثت کے
مُدّعی ہیں، اس میں غلو کرتے ہیں اور خلافت کو خاندان ہاشمی میں محصور سمجھتے ہیں۔"[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت

مدینہ منورہ کے مسلمان اگرچہ اربابِ حلّ و عقد تھے اور فہم و بصیرت رکھتے تھے، ان میں
مہاجرین اور انصار دونوں تھے، یہ لوگ جو فیصلہ کر دیتے جزیرۃ العرب میں اسی پر عمل ہوتا اور دنیا
میں جہاں بھی مسلمان ہیں، اُن کے فیصلوں کے پابند ہوتے، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی وفات کے بعد وہ ایک دوراہے پر کھڑے تھے، یا تو اتحاد و اتفاق، یکجہتی و یگانگت کے ساتھ

(باقی ص۱۲۱ کا) ابوالقاسم بھی ان کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا ان کے بعد حضرت عبداللہ، طیبؓ و طاہرؓ
پیدا ہوئے، علامہ ابن القیمؒ کی تحقیق یہ ہے کہ طیبؓ و طاہرؓ، عبداللہ ہی کے لقب تھے، یہ سب حضرت
خدیجہ کے بطن سے تھے، ماریہ قبطیہ کے بطن سے ابراہیم تولّد ہوئے ان کی بھی زمانۂ طفولیت میں وفات
ہو گئی، اس طرح اگر اللہ کو آپؐ کے خاندان و اولاد ہی میں خلافت رکھنی تھی تو کیا مشکل تھا کہ ان میں
کوئی ایک زندہ رہ جاتا۔

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص۹۳۶

اسلام کو پھیلانے اور اللہ کے احکام کو خلق خدا تک پہنچانے کی سعی میں لگ جائیں اور ایک ایسے شخص کو اپنا رہنما و سربراہ تسلیم کرلیں جس کی سیرت و کردار اور عظمت کا اقرار سبھوں کو ہے اور جس کے بارے میں ان کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ان کا کیا مقام تھا، اور آپؐ نے کس طرح ان کی وفاداری و صداقت کی شہادت دی ہے، اور کس طرح ان کو نازک اور فیصلہ کن مواقع پر آگے بڑھایا ہے، یا پھر دوسرا راستہ تھا، اختلاف و نزاع کا، باہم دست و گریباں ہونے کا، اختلافِ فکر اور اختلافِ رائے کا، جس سے اسلام کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے، شیرازۂ ملّت بکھر جائے، اور (خدانخواستہ) اسلام بھی دوسرے مذاہبِ عالم کی طرح سیادت و قیادت کے جھگڑوں میں پڑکر اختلاف و افتراق کی بھینٹ چڑھ جائے۔

صورتِ حال زیادہ پیچیدہ اس لئے تھی کہ یہ واقعہ مدینہ میں پیش آیا جو قبیلۂ قحطان کی دو بڑی شاخوں کا مرکز تھا، یعنی قبیلۂ اوس اور قبیلۂ خزرج، یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیر مقدم کیا تھا، اور مسلمانوں کو پناہ دی تھی، اور جو خدمت بھی مدد و نصرت، بھائی چارگی و مہماں نوازی، ایثار و قربانی کی ممکن تھی، انھوں نے پوری فراخ دلی اور وسعتِ قلبی کے ساتھ پیش کی تھی، اور یہی وہ حضرات تھے، جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے:-

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ۔ (سورۃ الحشر - ۹)	اور وہ لوگ جو مہاجروں سے پہلے ہجرت کے گھر (یعنی مدینہ) میں مقیم اور مستقل رہے اور جو اب ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں۔

وہ مہاجروں سے صدیوں پہلے سے وہاں کے باشندے تھے، وہی اہل وطن تھے، لہذا اگر وہ

اپنے آپ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا حقدار سمجھتے (جو مکہ سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کرکے تشریف لائے تھے) تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی بلکہ ایک معقول بات اور حقائق و واقعات کا تقاضا سمجھا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پیچیدہ نفسیاتی بات کو سمجھ گئے، اور اُن کے پیش نظر وہ کٹھن صورتِ حال بھی تھی جس سے اسلام اور مسلمانوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سابقہ پڑا تھا۔ انھوں نے اپنی بالغ نظری اور خداداد ذہانت سے جس میں وہ اپنے رفقاء اور معاصرین میں ممتاز تھے، اور جس کا متعدد بار تجربہ ہو چکا تھا، سمجھ لیا کہ مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، اس میں ایک دن کی بھی تاخیر کی گنجائش نہیں ہے، اگر آج اتحاد و اتفاق کی رسّی اُن لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے جن پر مسلمانوں کے شیرازہ کو قائم رکھنے کی ذمہ داری اور اسلام کے مستقبل کا انحصار ہے تو پھر دوبارہ یہ شیرازہ مجتمع نہ ہو سکے گا، لہٰذا انھوں نے خلیفہ کے انتخاب میں تاخیر کو روا نہیں رکھا، خاص طور پر اس لئے کہ کچھ انصارِ مدینہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ چاہتے ہیں کہ خلیفۂ رسولؐ ان میں سے ہو، وہ انصار صاحبِ دار (اصلی باشندگانِ مدینہ منورہ) تھے، اور اُن کا خیال بے محل نہیں تھا، مگر ان میں دو متوازی عظیم قبیلے تھے، اوس اور خزرج جن میں عرصہ تک جنگ اور محاذ آرائی رہ چکی تھی،[1] حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ

---

[1] واقعہ کی نوعیت بھی یہی تھی جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: "اگر خلافت کی ذمہ داری قبیلۂ اوس کے سپرد کی جاتی ہے تو خزرج والوں کو اعتراض ہوگا اور وہ منافست کریں گے اور اگر خزرج کے کسی فرد کو خلیفہ بنایا جاتا ہے تو اوس والے اعتراض کریں گے، اور منافست کریں گے اور تمام قبائلِ عرب سوائے قریش کی اس شاخ کے کسی پر متفق نہیں ہوں گے، ہم زمام کار اپنے ہاتھوں میں لیں (امراء ہوں) اور آپ ہماری مساعدت کریں (وزراء ہوں) آپ مشورہ دینے سے نہ جھجکیں اور ہم بغیر آپ کے مشورہ کے کوئی بڑا کام نہ کریں"۔

جزیرۃ العرب کے لوگ صرف قریش ہی کو اپنا سربراہ مان سکتے تھے کیونکہ قریش کی قائدانہ حیثیت عُرفی و اجتماعی لحاظ سے، اپنے سابقہ پس منظر کی بنا پر مسلّم تھی، لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت پر مجتمع کرلیا، تاکہ شیطان کو مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور دلوں میں فساد اور کجی پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے، خاص طور پر اس لئے کہ ابھی ابھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بند ہوئی ہیں، اور آپؐ کی تدفین بھی عمل میں نہیں آئی ہے، مسلمان متحد ہیں، یگانگت کی فضا قائم ہے، اگر اس وقت مسلمانوں کا ایک امیر منتخب ہوجاتا ہے تو وہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تدفین کی خدمت مسلمانوں کے سربراہ اور امیر کی حیثیت سے انجام دے گا۔

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں پہلے سے جمع ہوگئے تھے، (ممکن ہے اس میں بعض منافقین کے منصوبہ کو بھی دخل ہو) اور قریب تھا کہ دونوں قبیلوں میں سے کسی قبیلہ کے سردار کے ہاتھ پر بیعت ہوجائے، اور زمام کار بالکل مہاجرین کے ہاتھ سے نکل جائے، بلکہ خود مسلمانوں کے اتفاق اور اجماع کا شیرازہ ہی بکھر جائے، حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنی اس خداداد بصیرت اور دوربینی سے اس نازک صورتِ حال کا اندازہ کرلیا، اور وہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے سقیفۂ بنی ساعدہ میں پہونچ گئے، اور بالاتفاق حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اہلِ مدینہ (مہاجرین و انصار) نے بیعت کی، اور وہ خطرہ ٹل گیا جو خود وجود اسلامی کو خطرہ اور تزلزل میں ڈال دیتا اور پھر اس کے بعد تلافی نہ ہوتی۔

دوسرے روز بیعت عامّہ سقیفہ کی بیعت کے بعد مسجد نبویؐ میں منعقد ہوئی[1]، اس موقع پر امیر المؤمنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر کی جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

---

[1] یہ واقعہ ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ کا ہے۔

"حضرات! مجھے آپ کا والی بنایا گیا ہے، دراں حالیکہ میں آپ سب سے افضل نہیں ہوں، اگر میں صحیح کام کروں تو آپ میری معاونت کریں اور اگر کوئی غلطی کروں تو میری اصلاح کریں، صداقت امانت ہے، دروغ خیانت ہے، آپ میں جو صاحب کمزور ہیں، اُن کی حیثیت میرے سامنے قوی شخص کی ہے، جب تک اُن کو اپنا حق نہ مل جائے، اور آپ میں جو طاقت ور ہیں، اُن کی حیثیت میرے نزدیک کمزور کی ہے، جب تک میں اُن کے ذمہ جو حق ہے، وہ اُن سے لے کر صاحبِ حق کو نہ دلا دوں، یہ امر واقعہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے جہاد فی سبیل اللہ سے روگردانی کی تو اللہ نے اس کو ذلت کی حالت میں چھوڑ دیا، (اور یہ بھی سن لیجئے کہ) جب بے حیائی کسی معاشرہ میں پھیلتی ہے تو اللہ تعالےٰ اُس قوم کو مبتلائے آلام کر دیتا ہے، میں جب تک اللہ تعالےٰ کی اطاعت کی راہ پر قائم رہوں آپ بھی میری اطاعت کرتے رہیں، اور اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو آپ پر میری اطاعت واجب نہیں ہے، بسم اللہ، اٹھئے نماز پڑھیں، اللہ آپ پر اپنا رحم و فضل فرمائے[1]"۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی جس کو کہیں کہ بات بن گئی، اور نہ کوئی سازش تھی، جس کے متعلق کہا جائے کہ کبھی کبھی اس طرح کی سازشیں کامیاب ہو جاتی ہیں، درحقیقت یہ اللہ تعالےٰ کا (جو غالب اور حکمت والا ہے) طے کردہ معاملہ تھا، اور اللہ تعالےٰ کے لطف و کرم کا ایک مظہر، اس لئے کہ اس نے دین کو غالب رکھنے کا فیصلہ فرمایا تھا[2]، اور یہ ارادہ فرمالیا تھا کہ مسلمانوں میں وحدتِ کلمہ باقی رہے، نیز یہ کہ عربوں کے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۴۸، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔

[2] اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ٥ (سورۃ الصف ۹)

رواج و معیار کے مطابق بھی یہ بات تھی کہ وہ آزادانہ رائے مشورہ سے کوئی اہم بات طے کرتے اور اپنے درمیان سربراہ اس کو مقرر کرتے جو عمر میں بڑا ہو، اور اخلاص و بصیرت میں افضل ہو، تجربہ کار، دنیا کے سرد و گرم کو آزمائے ہوئے ہو، فوج اور عوام کی سربراہی کا سلیقہ رکھنے والا ہو، یہ بات اُن کے یہاں نسلوں سے چلی آرہی تھی[1]

انگریزی کے مشہور مسلمان صاحبِ قلم امیر علی[2] (آنریبل جسٹس سید امیر علی) نے اس تاریخی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"عربوں میں کسی قبیلہ کی سرداری اور سربراہی موروثی نہیں ہوتی، اس کا

---

[1] العقاد کہتے ہیں :۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عمر تیس[3] سے دو تین ہی سال زیادہ ہوئی تھی یہ بات ایک دشوار گزار مرحلہ تھا جس کا طے کرنا اس قوم کے لئے ممکن نہ تھا جو عمر اور بزرگانہ سن کو اہمیت دیتی تھی" (العبقریات الاسلامیۃ للعقاد ص ۲۴۱)

[3] تاریخی لحاظ سے یہی ثابت ہے، اور اس روایت کو ترجیح دی گئی ہے کہ حضرت علیؓ کی عمر اس وقت ۳۳ سال تھی اور حضرت ابوبکرؓ کی عمر ۶۱ سال تھی۔

[2] ولادت ۱۸۴۹ء، وفات ۱۹۲۸ء ان کا تعلق ساداتِ شیعہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو نادر شاہ خراسانی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا، وہ ہندوستان کے ممتاز ترین قانون دانوں میں تھے، اسلامی قانون MOHAMMEDAN LAW. پر لکھنے والوں میں وہ خاص امتیاز و شہرت رکھتے ہیں، انگریزی کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان صاحبِ قلم تھے، بنگال ہائی کورٹ کے ۱۹۰۴ء میں چیف جسٹس تھے، اور پہلے ہندوستانی تھے جو پریوی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ان کی دو کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی (۱) روح اسلام SPIRIT OF ISLAM. (۲) مختصر تاریخ عرب A SHORT HISTORY OF THE SARACENS

انحصار انتخاب پر ہوتا ہے، عمومی حق رائے دہندگی کے اصول پر شدت سے عمل کیا جاتا ہے، قبیلہ کے تمام افراد کی سردار کے انتخاب میں آواز ہوتی ہے، انتخاب متوفی کے پسماندگان کے افراد نرینہ میں سن و سال، بزرگی و تقدم SENIORITY کے اصول پر ہوتا ہے۔

اس قدیم قانون و روایت کی پیغمبر صاحب کے جانشین کے انتخاب میں بھی پابندی کی گئی، چونکہ حالات کی نزاکت کسی تاخیر کی اجازت نہیں دیتی تھی، اس لئے ابوبکرؓ جو اپنی عمر اور اس حیثیت و مرتبہ کی بنا پر جو ان کو مکہ میں حاصل تھا، اور وہ عربوں کے حساب و اندازہ میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے بغیر کسی تاخیر کے خلیفہ یا پیغمبر کے جانشین منتخب ہوئے۔

ابوبکرؓ اپنی دانشمندی اور اعتدال کی وجہ سے امتیاز خاص کے مالک تھے، ان کے انتخاب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خاندانِ نبوت نے اپنے روایتی خلوص، اور اسلام کے ساتھ وفاداری اور دلی وابستگی کی بنا پر تسلیم کیا۔"[1]

اس انتخاب کی بدولت مسلمان اور عرب اس قبائلی اور موروثی طرزِ حکومت سے محفوظ رہے جس کی بنیاد نسب اور خون پر ہوتی ہے اور جس میں ضرورت سے کہیں زیادہ خونی رشتہ کو اہمیت دی جاتی، بلکہ اس کی تقدیس کی جاتی ہے، اگر پہلے ہی خلیفہ کا انتخاب

---

[1] مختصر تاریخ عرب ص۲۱ "نہج البلاغہ" کے شارح ابن ابی الحدید متوفی ۶۵۵ھ جو ایک معتزلی شیعہ ہیں لکھتے ہیں "ہمارے قدیم و متأخر بصری و بغدادی علماء لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت صحیح شرعی اور قانونی بیعت تھی، یہ بیعت نص سے نہیں بلکہ انتخاب سے عمل میں آئی تھی، جس پر اجماع ہو گیا تھا، اور یہ بھی انتخاب کا طریقہ ہے" (شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص۷)

بنو ہاشم کے خاندان سے ہوتا (جس کی بلا شبہ اُن کے اندر اہلیت تھی، اور اُن کے متعلق لوگوں کا گمان بھی تھا) تو اس کا نتیجہ ہوتا کہ بنو ہاشم کی دینی روحانی پیشوائی کے ساتھ ایک دنیاوی سلطنت بھی قائم ہو جاتی اور اسلام میں بھی ایک پاپائیت PRIESTHOOD وجود میں آتی، جیسا کہ عیسائیوں میں CLERGY کا نظام اور سلسلہ تھا، اور اس کے بھی وہی تلخ نتائج اور مُضرّ اثرات اُمّتِ مسلمہ اور مسلم معاشرہ میں ظاہر ہو کر رہتے، جن کی نظیر مسیحی پاپائیت، مجوسی اور برہمنی پیشوائی میں ملتی ہے، فکری رہنمائی، روحانی سیادت، استبدادی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) خود رائی اور اقتصادی استحصال ایک گھرانہ میں مرکوز و مجتمع ہوتے، اور آنے والی نسلیں اس لحاظ سے اُن کی حکومت و سیادت کو تسلیم کرتیں کہ یہ لوگ عام انسانی سطح سے بلند اور مافوق البشر انسان ہیں، جو لوگوں کے مال و دولت اور نذر و پیشکش کی بنیاد پر داد عیش دیتے اور انھیں کے سہارے زندگی گزارتے ہیں، یہ بات قطعاً اس روح و مقصد کے منافی ہوتی جس کے تحت رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنو ہاشم کے لئے زکوٰۃ کے قبول کرنے کا "پُر منفعت" دروازہ بند کر دیا اور ان کو مُفت خوری اور تن آسانی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک بار صدقے کے آئے ہوئے کھجوروں میں سے ایک دانہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اٹھا کر منھ میں ڈال لیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کخ کخ کر کے اُن کے مُنھ سے نکلوا دیا، پھر فرمایا: تم کو معلوم نہیں کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے"[1]

دوسری ایک طویل روایت جو عبدالمطّلب بن ربیعہ بن الحارث سے مروی ہے،

---

[1] صحیح بخاری، باب "مایذکر فی الصدقۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم" کتاب الزکوٰۃ اور جامع صحیح مسلم، "تحریم الزکوٰۃ علیٰ آل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" اور وہ بنی ہاشم اور بنی المطّلب ہیں، اور ان کے علاوہ کوئی نہیں ہے، لفظاً الفاظ میں اختلاف ہے مفہوم ایک ہی ہے۔

اس میں مذکور ہے کہ یہ "صدقات لوگوں کے ہاتھوں کا میل ہے، یہ محمدؐ اور آلِ محمد کے لئے (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) روا نہیں ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے خاندان ہاشمی اور اہلِ بیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے افراد کو اس سے بچا لیا کہ وہ اس آیت کا مصداق ہوتے :-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ	مومنو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے
الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ	عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ. (سورۃ توبہ - ۳۴)	کھاتے ہیں۔

اس کے بالمقابل نازک مواقع اور خطرات کے موقعہ پر قریب ترین اعزّہ اور افرادِ خاندان کو آگے بڑھاتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اس حقیقت کو بیان کیا ہے، حضرت معاویہؓ کے نام اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"جب معرکہ جنگ گرم ہوتا اور لوگوں کی ہمتیں جواب دینے لگتیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے افرادِ خاندان کو آگے بڑھا کر دوسروں کو شمشیر و سناں کی زد سے بچا لیا کرتے تھے، چنانچہ بدر میں حضرت عبیدہ بن حارث، اُحد میں حضرت حمزہؓ اور مؤتہ میں حضرت جعفر شہید ہوئے۔"[2]

اور پھر یہ دونوں قسم کی سیادت، حکومتِ دنیاوی اور سیادتِ روحانی، اگر بربنائے وراثت بنی ہاشم کو ملتی تو پھر کبھی اُن کے خاندان سے باہر نہ جاتی اسی لئے قریش کے بعض صاف گو

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ۔

[2] نہج البلاغہ ص ۳۶۸-۳۶۹ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت۔

حضرات نے بلا مبالغہ سچّی بات کہی :۔

إن ولّی علیکم بنو ھاشم لم	اگر تم پر بنی ہاشم کو والی بنایا جاتا تو پھر
تخرج منھم أبدا، وما	اُن کے ہاتھ سے یہ چیز کبھی نہ نکلتی اور یہ
کانت فی غیرھا من قریش[1]	قریش کے کسی اور خاندان یا شاخ میں نہ جاتی۔

جن لوگوں نے انقلابی تحریکوں اور دعوتی کوششوں کی تاریخیں پڑھی ہیں، اُن کو اندازہ ہوگا کہ بہت سی تحریکیں شروع تو ہوئیں خالص دین اور اصلاح کے لئے مگر اُن کی انتہا ہوئی ایک خاندان یا گھرانہ کے لئے جاہ وجلال، حکومت وسلطنت کے حصول پر، یا سیاسی وفوجی قسم کا نفوذ حاصل کرنے پر، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جن کا دینی حاسّہ قوی ہے، اور جن کو اللہ نے فہم وبصیرت عطا کی ہے، وہ اس طرح کی تحریکوں سے مشکوک اور خائف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ اُن کا کیا انجام ہوگا۔

یہاں پر اس گفتگو کا حوالہ دینا مناسب ہوگا، جو ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان اُس وقت ہوئی تھی، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی، اس خط کا ہرقل کے ذہن پر کیا ردِّ عمل ہوا اور اس کے دماغ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ میں کس طرح کام کیا، اور وہ کس بات کا اندازہ لگانا چاہتا تھا؟ یہ سب اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس نے ابوسفیان سے کی، اس نے ابوسفیان سے دریافت کیا: "اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اس کے (خط بھیجنے والے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) باپ دادا میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ ابوسفیان نے جب نفی میں جواب دیا تو اس نے کہا میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے، تو تم نے کہا

---

[1] العبقریات الاسلامیہ صـ ۹۳۸

"نہیں" تو میں نے (اپنے دل میں) کہا اگر اُس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ اپنے خاندان کی حکومت اس ذریعہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے"[1]

ہرقل کا اس نتیجہ تک پہنچنا تاریخی بنیاد پر تھا کہ جو شخص اللہ اور اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے، اس کے آباء واجداد میں بادشاہت نہیں تھی، لہٰذا اگر اس دعوت کے نتیجہ میں ایک موروثی سلطنت وجود میں آجاتی اور حکومت بغیر کسی فصل کے خاندان کے قریبی فرد کو ملتی تو کیا یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا تھا کہ دعوت نبوی اور اصلاح حال کی جدوجہد ــــ معاذ اللہ ــــ اس خاندان کے لئے تھی جس کا نبی سے تعلق تھا، اور ساری کاوش کا محور یہ تھا کہ اپنے افرادِ خاندان کے لئے بہتر مستقبل، آرام دہ رہائش، اور خوشحالی کے ساتھ حکومت وسیادت فراہم کی جائے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس علیم وغالب ذات کا تقدیری فیصلہ تھا کہ مسلمانوں کی سربراہی کے لئے رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد متصلاً آپ کے گھرانہ یا خانوادۂ ہاشمی کا فرد خلیفہ نہیں ہوا،[2] بلکہ آپؐ کی قائم مقامی حضرت ابوبکرؓ نے کی جو بنی تیم سے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ کے جانشین حضرت عمرؓ ہوئے جو بنی عدی سے تھے، اور ان کی قائم مقامی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی جو بنی اُمیّہ سے تھے، اس کے بعد حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اس وقت منصبِ خلافت پر فائز ہوئے، جس وقت صحابۂ رسولؐ بلکہ پوری اُمّت میں اُن سے افضل اور اُن سے زیادہ مُہمّاتِ خلافت کا بار اٹھانے والا کوئی دوسرا

---

[1] بخاری، باب کیف کان بدأ الوحی۔ [2] اس نکتہ کو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے خوب سمجھا جب کہ انھوں نے کہا: "واللہ میں نہیں سمجھتا کہ اللہ ہمارے خاندان (اہلِ بیت) میں نبوت وخلافت دونوں کو یکجا کرے گا"۔ (اعلام النبلاء للذہبی ج ۳ ص ۲۷۵)

نہیں رہ گیا تھا، چنانچہ اس موقع پر شک و شبہ کی گنجائش ختم ہو گئی اور کسی کا منہ نہیں رہا کہ وہ بدگمانی سے کام لے یا زبانِ اعتراض و طعن دراز کرے اس لئے کہ معاملہ خالصۃً خاندانی اور گھریلو نہیں رہا، اور کسی اپنائیت اور عصبیت کا الزام یا حوالہ دینے کا قطعاً موقعہ نہیں رہا، یہ سب تقدیرِ الٰہی اور حکمتِ ربانی کا مظہر تھا "وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا"

حضرت ابوبکرؓ کے لئے پہلی آزمائش اور اُن کا استقلال و عزم

تمام سیرت نگاروں اور محدثین کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :۔

إنّا معشر الانبیاء، لانورث ما ترکنا صدقة۔[1]	ہم پیغمبروں کا گروہ (کسی مال کا کسی کو) وارث نہیں بناتا جو چھوڑ دیا وہ صدقہ ہوتا ہے

اور امام احمد اپنی سند سے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :۔

لایقتسم ورثتی دینارا ولادرهما ما ترکت بعد نفقة نسائی ومعونة عامله فهو صدقة۔	میرے ورثہ دینار و درہم آپس میں تقسیم نہیں کریں گے میں نے اپنی بیویوں کے خرچ اور اس کے کام کرنے والے کے معاوضہ کے علاوہ جو چھوڑا وہ صدقہ ہے۔

بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت مالک بن انس کے واسطوں سے اپنی سند کے ذریعہ حضرت ابوہریرہؓ سے ان ہی الفاظ میں روایت کی ہے، امام بخاری نے حضرت عروہؓ سے

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۴۶۳، وأخرجه النسائی (فتح الباری ج ۱۲ ص ۵)

اور وہ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپؐ کی ازواج نے چاہا کہ حضرت عثمانؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیج کر اپنی میراث طلب کریں، اس پر حضرت عائشہؓ نے کہا: کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم وارث نہیں بناتے، جو چھوڑا وہ صدقہ ہے" اسی طرح مسلم نے بھی روایت کی ہے۔

درحقیقت یہی بات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شایانِ شان تھی، اور آپؐ کے طریق عمل کے عین مطابق تھی، آپؐ نے ہمیشہ جہاں خطرات کے مواقع آئے اور جان دینے یا قربانی کی ضرورت ہوئی اپنے افرادِ خاندان اور بنی ہاشم کے افراد کو آگے بڑھا دیا، اور جہاں حصولِ منفعت کا موقع آیا وہاں آپؐ نے اُن کو پیچھے کر دیا، بدر کے معرکہ میں جیسا کہ گزر چکا ہے، عرب کے سخت ترین جنگجو اور بہادر افراد کے مقابلہ کے لئے سب سے پہلے آپؐ نے جن کو آگے کیا وہ حمزہ، علی اور عبیدہ (رضی اللہ عنہم) تھے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد پاک سے لے کر آج تک آمدنی کا جو سب سے بڑا ذریعہ اُمتِ اسلامیہ میں موجود ہے، زکوٰۃ ہے، جس کو آپؐ نے آل ہاشم اور سادات کے لئے ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیا، حالانکہ یہ وہ ذریعۂ آمدنی ہے جو ایک چشمۂ جاری کی طرح آج تک رواں دواں ہے اور رہے گا، حجۃ الوداع کے موقع پر جب سودی قرضوں کو کالعدم قرار دیا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے سودی قرضوں کو کالعدم قرار دیا، اور جو خوں بہا معاف کیا تو سب سے پہلے اپنے خانوادۂ بنی ہاشم کے فرزند، اپنے بھتیجے ابن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطّلب کا خون بہا کالعدم قرار دیا۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

وربا الجاهلية موضوع، وأوّل	زمانۂ جاہلیت کے تمام سودی قرضے
ربا أضع ربانا ربا العباس بن	کالعدم قرار دیئے جاتے ہیں اور اُن میں

عبد المطلب، ودماء الجاهلية	پہلا قرضہ ہمارا یعنی عباسؓ بن عبد المطلب
موضوعة وإن أول دم أضع	کا ہے، اور جاہلیت کے خون بہا سب کالعدم
من دمائنا دم ابن ربیعة	ہیں اور ان میں پہلا خون بہا ہمارے خاندان
بن الحارث۔[1]	کا ابن ربیعہ بن الحارث کا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے لئے ایک سخت آزمائش کا وقت آیا، سخت اور انتہائی نازک سنگین اور جذباتی نوعیت کا جس میں اُن کو اپنا فیصلہ صادر کرنا ہے، ہر شخص اپنی صوابدید سے جو بات صحیح اور مناسب سمجھتا ہے، اسی کا مکلّف ہے کہ کس طرح ایک گتھی کو سلجھائے، یہاں ایک اصول کا سوال تھا، ایک شرعی مسئلہ تھا، جو سیاسی نوعیت بھی رکھتا تھا، اور جذباتی بھی، پوری احتیاط اور قوت کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو نباہنا جو آپؐ کی سیرت تعلیمات اور تعامل کے عین مطابق ہو۔

یہاں پر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ خود جب حضرت علیؓ سریرآرائے خلافت ہوئے تو آپ نے خود بھی ترکۂ نبوی کو نہ تقسیم کیا اور نہ اپنے مصارف سے ہٹایا۔

اس واقعہ کی تفصیل امام بخاری نے اپنی سند کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتی ہیں:۔

"فاطمہؓ اور عباسؓ، ابوبکرؓ کے پاس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت طلب کرنے آئے، وہ دونوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فدک[2] کی زمین طلب کر رہے تھے، نیز آپؐ کا

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوداؤد روایت جابر بن عبد اللہ۔

[2] فَدَک (ف اور دال کو حرکت آخری حرف کاف) حجاز کا ایک گاؤں ہے، مدینہ منورہ اور اس گاؤں کے درمیان دو دن کی مسافت ہے (تین دنوں کی مسافت کی بھی روایت ہے) اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالے نے صلح کی حالت میں غنیمت کے طور پر عطا فرمایا تھا، اس میں ایک اُبلتے ہوئے پانی کا چشمہ ہے اور کھجور کے باغ ہیں، (مراصد الاطلاع علی أسماء الأمکنة والبقاع لصفی الدین عبد المؤمن بن عبد الحق البغدادی مطبوعة دار المعرفة بیروت ۱۹۵۴ء)

حصہ جو خیبر میں تھا، ان دونوں سے ابوبکرؓ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ "لانورث، ماترکنا صدقۃ" ہم وارث نہیں بناتے جو چھوڑا وہ صدقہ ہے آل محمد صرف اس مال سے بقدر ضرورت لے لیں گے' دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا: "میں نے سنا ہے کہ نبی کسی کو وارث نہیں بناتے لیکن میں اُن کے اخراجات پورے کروں گا' جن کے اخراجات رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پورے کیا کرتے تھے۔" (متفق علیہ)[1]۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "حضرت فاطمہؓ نے ابوبکرؓ سے کہلایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو غنیمت مدینہ اور فدک میں ملی تھی، اور خیبر کے خمس میں جو بچا ہے' وہ دے دیں' ابوبکرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ہم وارث نہیں بناتے، جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے" البتہ آلِ محمد اس مال سے اپنی ضروریات پوری کریں گے' اور میں بخدا رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صدقہ کئے ہوئے مال میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا، اور جیسا کہ آپؐ کی زندگی میں تھا، اسی حال میں رکھوں گا، اور وہی کروں گا، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کیا۔"[2]

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ا ص ا، [2] بخاری باب غزوۂ خیبر (ایک طویل حدیث کے ضمن میں یہ مضمون مذکور ہے)

روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے زمانۂ خلافت میں اہلِ بیت کو مدینہ اور فدک کے اموال اور خیبر کے خمس میں سے اُن کا حق دیتے رہتے تھے' البتہ حدیث مذکور کی بناء پر ان اموال کو آپ نے بطور میراث تقسیم نہیں فرمایا، اور ان حضرات کو مطلقاً ان کا مالک نہیں بنایا، آپ عمل و اسوۂ نبوی کے مطابق ان حضرات کو ان کا حق دیتے رہتے تھے حضرت محمد باقرؒ کا خود بیان و اعلان ہے (جیسا کہ شرح نہج البلاغۃ (جو شیعی عالم علامہ ابن ابی الحدید کی تصنیف ہے) میں صریح طور پر مذکور ہے) کہ اُن کے آبائے کرام کے ساتھ اس سلسلہ میں کوئی ناانصافی نہیں ہوئی یہی حضرت زید شہید سے بھی منقول ہے (شرح نہج البلاغۃ ج ۴ ص ۱۱۳)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "واللہ میں ایسی کوئی بات چھوڑ نہیں سکتا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے، میں بھی وہی کروں گا" حضرت ابوبکرؓ جس امر پر یقین رکھتے اور صحیح سمجھتے تھے اس پر اٹل رہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو پورا کرنے پر مُصر رہے، دوسری طرف حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا برابر اس کا مطالبہ کرتی رہیں، اس کا سبب یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ جو حضرت ابوبکرؓ کو معلوم تھا، اس کا انھیں علم نہ تھا، یا ان کا خیال ہوگا کہ خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے گنجائش اور جواز اس بات کا ہے کہ وہ اُن کی خواہش پوری کرسکیں[1]، دونوں اپنی رائے میں مجتہد تھے، اور دونوں کے لئے اپنا اپنا عذر تھا، اور دونوں حق بجانب تھے۔

مسند امام احمد بن حنبل میں یہ روایت بھی ہے کہ "سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ نے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے، اُس کو آپ ہی بہتر جانتے ہیں[2]"۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد چھ ماہ تک حضرت فاطمہؓ حیات رہیں، اور اُن کو حضرت ابوبکرؓ سے شکوہ رہا اور اپنے انتقال تک اُن سے کوئی راہ و رسم نہیں رکھی، بہرحال رشتہ داریوں اور جماعتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے، اور بشریت کا تقاضہ بھی ہوتا ہے، انسان جس پر یقین رکھتا ہے اور جس کو سچ سمجھتا ہے، اس سلسلہ میں اس کے اندر ایک طرح

---

[1] اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا خیال تھا کہ انبیاءؑ کے مال میں وراثت جاری نہ ہونے کا مطلب مالِ منقول (درہم و دینار وغیرہ) میں وراثت جاری نہ ہونا ہے، چنانچہ ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ "لا یقتسم ورثتی دینارًا ولا درھمًا" لیکن یہاں معاملہ مال غیر منقول (جائیداد و زمین) کا تھا، اس لئے حضرت فاطمہؓ کا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اس میں وراثت جاری ہوسکتی ہے، حضرت ابوبکرؓ اس حکم کو عام سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اس کی تقسیم و حوالگی بھی صحیح نہیں سمجھی۔ [2] مسند احمد ج ۱ ص ۴

حسّاسیت بڑھ جاتی ہے، اور جذباتیت بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ اختلاف ایک حد تک رہا، اور حضرت ابوبکرؓ سے ان کی ناراضگی حدودِ شرع سے متجاوز نہیں ہوئی، اُن کی مخالفت میں بھی شرافت، سیر چشمی، بلند ہمتی اور صبر کا جوہر قائم رہا، کیونکہ یہ اخلاق ان کی سرشت میں داخل تھے، حضرت عامرؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ "جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدّت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابوبکرؓ حضرت فاطمہؓ کی عیادت کے لئے گئے، اجازت طلب کی، حضرت علیؓ نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابوبکرؓ کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں، اگر تم چاہو تو اُن کو اجازت دے دو، حضرت فاطمہؓ نے فرمایا، کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا، ہاں، آپ نے اجازت دے دی، حضرت ابوبکرؓ اندر آئے، معذرت کی گفتگو کی اور وہ (حضرت فاطمہؓ) ان سے خوش ہو گئیں[1]، ہم اس بحث کو علامہ عقّاد کے تبصرہ پر ختم کرتے ہیں وہ اپنی کتاب "العبقریات الاسلامیہ" میں فرماتے ہیں:-

"یہ کوئی سمجھ کی بات نہیں ہے کہ حضرت صدّیق اکبرؓ کی جو وفاداری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھی، اس میں اس لئے شک کیا جائے کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی فاطمہؓ کو میراث سے محروم رکھا،

---

[1] الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ للمحب الطبری ص۱۲۶ دار الکتب العلمیۃ بیروت طبع اول ۱۹۸۴ء
طبقات ابن سعد کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اندر آئے اور اُن سے معذرت اور گفتگو کی تو آپ ان سے راضی اور خوش ہو گئیں "فدخل علیها واعتذر الیها وکلّمها فرضیت عنه" (ج ۸ ص۲۷ طبع بیروت)
طبقات کی اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی نے حضرت فاطمہؓ کی نماز جنازہ پڑھائی (ج ۸ ص۱۹ طبع لیدن) نیز "مسند فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالےٰ عنہا" للعلامۃ السیوطی ص۵۸ طبع المطبعۃ العزیزیہ۔

اگر انھوں نے اُن کو محروم رکھا تو خود اپنی لڑکی عائشہ رض کو بھی اسی طرح محروم رکھا کیونکہ شریعتِ محمدیؐ کی رُو سے انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے، ابوبکر رض نے یہ نہیں چاہا تھا کہ میراثِ محمدؐ سے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورثہ کو محروم کر دیں، جن میں خود اُن کی محبوب ترین اور سرمایۂ فخر بیٹی عائشہ رض بھی تھیں، لیکن انھوں نے چاہا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین اور آپ کی وصیتوں کے معاملہ میں توسّع سے کام نہ لیں، اور دین کو بچانا خاندان اور مال کے بچانے سے زیادہ ضروری تھا۔[1]"

استاذ عقاد مزید لکھتے ہیں:-

"میراث کے معاملہ میں جو انھوں نے طے کر دیا اس کے سوا کوئی فیصلہ کرنے کا ان کو (حضرت ابوبکر رض کو) حق بھی نہ تھا، ان کو یہی معلوم تھا کہ انبیائے کرام کسی کو وارث نہیں بناتے جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا، جب اُن کی وفات کا وقت آیا تو حضرت عائشہ رض کو وصیت کی کہ جو کچھ اُن کو دیا ہے اس سے مسلمانوں کے حق میں دستبردار ہو جائیں جب کہ وہ مال ان کے لئے عطیہ اور میراث کی شکل میں حلال تھا۔[2]"

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا

قلم کو یارا نہیں کہ ایک سطر بھی سیّدۃ نساء اہل الجنّۃ، جگر گوشۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تذکرہ کے بغیر آگے بڑھے۔

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۴۴۶ [2] ایضاً ص ۴۴۵

آپ فاطمہ زہرا ہیں، جگر گوشۂ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور سب سے زیادہ محبوب، روایت ہے کہ آپ کی ولادت بعثت سے پہلے ہوئی تھی، مدائنی نے بھی اس کی توثیق کی ہے، ایک روایت یہ ہے کہ اُن کی ولادت بعثت سے ایک سال چند دن پہلے ہوئی، حضرت علی بن ابی طالبؓ سے اُن کا شروع محرم ۲ھ میں عقد ہوا۔[1]

شیخ ابو جعفر الطوسی کی "الأمالی" سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے موقع پر ان کا جہیز تیار کرنے، پسند کرنے اور خریداری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بڑا ہاتھ تھا۔[2]

اسی طرح حضرت عائشہ اور حضرت اُم سلمہ نے اُن کا جہیز تیار کرنے اور حضرت علیؓ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مسکن تیار کرنے میں خاصا حصہ لیا تھا۔[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل صرف اُن ہی سے قائم ہے جس وقت حضرت علی بن ابی طالبؓ سے اُن کی شادی ہوئی اس وقت اُن کی عمر پندرہ[15] سال اور ساڑھے پانچ ماہ تھی،

---

[1] الاصابہ ج ۸ ص۵۴ (مطبوعہ دار نصفۃ مصر۔قاہرہ) یہی روایت صحیح ہے جیسا کہ باب دوم میں گزر چکا (بحوالہ شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ) اور اس بناء پر کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ۳ھ میں ہوئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب الأمالی للشیخ أبی جعفر الطوسی (شیعی) ج ۱ ص ۳۹ طبع نجف آخری ایڈیشن۔

[3] ابن ماجہ کتاب النکاح باب الولیمہ، منقول از کتاب "رحماء بینہم" از مولانا محمد نافع۔

طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی تھیں کہ فاطمہ رضؓ کے پدر بزرگوار (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد اُن سے بہتر میں نے قطعاً کسی کو نہیں دیکھا۔

عبدالرزاق، ابن جریج سے روایت کرتے ہیں کہ فاطمہ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں اور سب میں زیادہ آپؐ کو محبوب تھیں' ابوعمر (جن کی تصدیق سے دل مطمئن ہے) نے کہا کہ ان صاحبزادیوں میں سب سے بڑی زینبؓ تھیں پھر رقیہؓ، اُن کے بعد اُم کلثوم اور ان کے بعد فاطمہ تھیں رضی اللہ عنہن[1]۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعیم ابوسعید الخدریؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ "جنّتی خواتین کی بزرگ مخدومہ خاتون حضرت فاطمہ رضؓ ہیں" (سیدۃ نساء اهل الجنۃ) صحیحین میں مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا گیا:۔

فاطمۃ بضعۃ منی، یؤذینی ما أذاها ویریبنی ما رابها۔	فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس سے اس کو اذیت پہنچتی ہے اس سے مجھے بھی اذیت پہنچتی ہے' جس نے اس کو رنج دیا اس نے مجھے رنج دیا۔

حضرت عائشہ اُم المؤمنین رضؓ سے روایت ہے کہ "میں نے فاطمہ رضؓ کو ایک مرتبہ آتے دیکھا تو اُن کی چال بالکل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چال کے مشابہ تھی"۔

جب تک وہ زندہ رہیں حضرت علی رضؓ نے کوئی اور نکاح نہیں کیا۔ عقبہ بن یریم ابوثعلبہ الخشنی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غزوہ یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو آپ کا یہ معمول تھا کہ مسجد میں آکر دو رکعت نماز پڑھتے، پھر حضرت فاطمہ کے پاس

---

[1] مسند فاطمۃ الزہراء للسیوطی۔

جاتے، اُن کے بعد اپنی ازواج مطہرات سے ملتے، عائشہ بنت طلحہؓ، حضرت اُمّ المؤمنین عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ "حضرت عائشہؓ نے فرمایا: میں نے بات چیت کے انداز اور گفتگو میں فاطمہ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہ نہیں دیکھا"[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی و خوشی کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا، اور آپؐ کی رضا و خوشنودی سے زیادہ کسی بات کو عزیز نہیں رکھتی تھیں، شفقت پدری اور اولاد کی طبعی محبّت کا جو فطری تقاضا ہے، اُس کے بہت سے مظاہر ہیں، جس کے بہت سے واقعات میں سے صرف چند کا ذکر کرتے ہیں:۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی سفر پر روانہ ہونے لگتے تو آخری کام جو کرتے وہ یہ ہوتا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملتے اور جب واپس آتے تو پہلا کام یہ ہوتا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جا کر دیکھتے"۔

"جب آپؐ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہؓ نے اپنے لئے ایک مقنعہ (سر کو ڈھکنے کا چھوٹا رومال، کسابہ) خریدا ہے، اور اس کو زعفران سے رنگا ہے، اور اپنے دروازہ پر ایک پردہ لگایا ہے، یا (راوی کو شبہ ہے) اپنے گھر میں ایک فرش ڈالا ہے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیکھا تو واپس تشریف لے آئے، اور مسجد میں آکر بیٹھ گئے، حضرت فاطمہؓ نے حضرت بلالؓ کو بلا کر کہا کہ جا کر معلوم کیجئے کہ میرے گھر آکر آپؐ دروازہ سے واپس کیوں چلے گئے؟ چنانچہ حضرت بلالؓ آئے اور دریافت کیا (کہ آپؐ کیوں صاحبزادی کے دروازہ سے واپس آگئے) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ یہ چیزیں وہاں دیکھیں، حضرت بلالؓ نے آکر بتایا، حضرت فاطمہ نے اسی وقت پُرتکلف پردہ جو دروازہ پر ڈالا تھا نکال دیا، اور

---

[1] الاستیعاب فی معرفة الاصحاب لابن عبد البر القرطبی ۔ ج ۴ ص ۳۷۴-۳۷۷

جو کبھی نئی بات آپؐ نے ان کے یہاں دیکھی تھی، جو کپڑے پہنے تھے، اتار دیئے اور اپنی معمولی پوشاک (پیوند لگی چادر) اوڑھ لی، حضرت بلال رضؓ نے جب اس کی خبر دی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے اور فرمایا: اسی طرح رہا کرو، میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں[1]"۔

۲۔ حضرت ابن عمر رضؓ روایت کرتے ہیں کہ "ایک مرتبہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فاطمہ رضؓ کے گھر کی طرف گئے، مگر اندر داخل نہیں ہوئے، باہر ہی سے واپس تشریف لے گئے، جب حضرت علی رضؓ آئے تو انھوں نے یہ بات بتائی، علی رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر کہا تو آپؐ نے فرمایا میں نے اس کے گھر کے دروازہ پر ایک پردہ دیکھا ہمارا (ہمارے گھرانہ کا) دنیا سے (یعنی دنیا کی آرائشی چیزوں سے) کیا واسطہ؟ راوی کہتے ہیں کہ وہ چادر منقش تھی، راوی کا بیان ہے کہ علی رضؓ نے یہ بات فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتائی، انھوں نے عرض کیا کہ آپؐ (یعنی آنحضرتؐ) جو پسند فرمائیں اس کا حکم دیں (اس کی تعمیل کروں گی) حضرت علی رضؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جاکر ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا یہ پردہ فلاں کے گھر بھیج دو، ان لوگوں کو اس کی ضرورت ہے[2]"۔

۳۔ حضرت ثوبان رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام نے کہا "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی سفر پر روانہ ہوتے تو روانگی کے وقت سب سے آخری کام جو کرتے وہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات ہوتی، اور اسی طرح واپسی میں پہلا کام یہی کرتے کہ فاطمہ رضؓ کو دیکھتے، ایک مرتبہ کسی غزوہ سے واپس آئے تو فاطمہ رضؓ کے گھر کے دروازہ پر ایک پردہ پڑا دیکھا،

---

[1] الامام حماد بن اسحاق بن اسماعیل (۱۹۹-۲۶۷ھ) کتاب ترکۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والسبل التی وجہھا فیہا۔ تحقیق ڈاکٹر ضیاء العمری (مطبوعہ جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ) ط ۱ ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۴ء ص ۵۶ (بحوالہ صحیح بخاری، ابوداؤد) ابن شاہین نے الفلوسی کے واسطہ سے بھی نقل کیا ہے۔ [2] ایضاً ص ۵۷

اور یہ دیکھا کہ حسنؓ و حسینؓ کو چاندی کے کنگن نما (مردانہ) زیور پہنا دیئے گئے ہیں[1]، یہ دیکھ کر آپ نے توقف فرمایا اور اندر نہیں تشریف لے گئے، حضرت فاطمہؓ سمجھ گئیں کہ کس وجہ سے آنحضرتؐ اندر نہیں تشریف لائے، چنانچہ اسی لمحہ پردہ اتار دیا، اور بچوں کے ہاتھ سے وہ چاندی کے زیور اتار دیئے، تو وہ دونوں رونے لگے اور روتے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گئے، آپؐ نے ان دونوں سے کنگن لے لئے اور فرمایا اے ثوبان! یہ (مدینہ کے ایک گھرانہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ) فلاں (یا ابو فلاں) کو دے آؤ، یہ لوگ (اشارہ فاطمہ حسن اور حسین کی طرف) میرے اہلِ بیت ہیں، میں پسند نہیں کرتا کہ یہ لوگ اس دنیاوی زندگی میں مزے اڑائیں، اے ثوبان! فاطمہؓ کے لئے کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن لے آؤ[2]۔"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو عمیق اور جذباتی تعلق تھا، وہ ہر طرح قرین قیاس ہے کہ آپؐ والد بھی تھے، اُن کے نبی و مُطاع بھی اور سارے عالم کے نبیؐ مُطاع و محبوب تھے، آپ کی وفات پر اُن کا ایک جملہ پُردرد و طویل مرثیہ سے زیادہ بلیغ اور اثر آفریں ہے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین عمل میں آگئی تو فرمایا: "اے انسؓ کس طرح آپ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مٹی[3] ڈالی گئی؟[4]

حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد وفات پائی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اطمینان دلایا تھا کہ

---

[1] القُلب کے معنی کنگن کے ہیں (لسان العرب از ابن منظور)

[2] ایضاً ص ۵۷-۵۸ (سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل اور ابن ماجہ کی روایت)

[3] یعنی کس دل سے آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مٹی ڈالی۔

[4] صحیح بخاری باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ووفاتہ۔

"آپؐ سے سب سے پہلے وہی (دارِ آخرت میں) آکر ملیں گی، نیز یہ بھی اُن سے فرمایا تھا، کیا تم کو یہ بات خوش نہیں کرتی کہ تم خواتینِ جنّت کی سردار ہو گی"[1]

عبدالرزاق ابن جریج سے راوی ہیں:-

"سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں اور آپ کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبوب تھیں، ابو عمر کہتے ہیں جو بات دل کو لگتی ہے وہ یہ کہ آپؐ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی حضرت زینب، پھر حضرت رُقیہ ان کے بعد حضرت اُمّ کلثوم اور آخری حضرت فاطمہ تھیں رضی اللہ عنہن"[2]

"امام مالکؒ اس سند سے جو حضرت جعفر صادقؓ سے شروع ہو کر سیدنا زین العابدینؒ پر ختم ہوتی ہے، روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال مغرب وعشاء کے درمیان ہوا، انتقال کی خبر سن کر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تشریف لائے، جب جنازہ نماز پڑھنے کے لئے لایا گیا تو حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ نماز پڑھایئے، انھوں نے فرمایا کہ آپ کی موجودگی میں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ ہاں! آگے بڑھئے، واللہ آپ کے سوا کوئی نماز نہیں پڑھائیگا، حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی، اور رات ہی کو تدفین عمل میں آئی"[3]

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ مطرف بن عبداللہ الیساری نے خبر دی کہ ہم سے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۳۲ [2] مسند فاطمۃ الزہراء للسیوطی۔

[3] الموافقہ روایت البصری وابن السمان (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۸ ص ۲۹ دار صادر بیروت)

عبدالاعلی بن ابی مساور نے حماد سے اور انھوں نے ابراہیم سے روایت کیا کہ ابو بکر صدیقؓ نے فاطمہ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ چار تکبیروں کے ساتھ پڑھائی۔[1]

واقدی کی روایت کے مطابق آپ کی وفات ۱۱ھ میں رمضان المبارک کی تیسری تاریخ کو ہوئی،[2] اور شب سہ شنبہ ۳ رمضان کو تدفین عمل میں آئی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اُن کی اولاد میں حسنؓ، حسینؓ، محسنؓ، اُم کلثومؓ اور زینبؓ ہوئیں' اللہ اُن سب سے راضی ہو اور ان کے درجے بلند فرمائے۔[3]

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکرؓ سے بیعت

اس سلسلہ میں مختلف روایتیں ہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی بیعت کب کی' حافظ ابوبکر البیہقی اپنی سند کے واسطہ سے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کرتے ہیں کہ :-

"حضرت ابوبکرؓ منبر پر چڑھے اور لوگوں پر نظر دوڑائی' ان میں حضرت علیؓ کو نہیں پایا تو اُن کو بلا کر کہا: اے رسول اللہؐ کے عم زاد بھائی اور آپؐ کے داماد! کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے؟ حضرت علیؓ نے کہا مجھے کوئی شکایت یا رنجش نہیں اے خلیفۂ رسول اللہؐ یہ کہہ کر آپ نے بیعت کر لی، یہی الفاظ تھے یا اس کا مفہوم یہی ہے۔"[4]

ابن کثیر نے کہا :-

---

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۸ ص ۲۹ دار صادر بیروت [2] الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۴ ص ۳۸

[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۹۳ [4] ایضاً ص ۲۴۹ (مختصر)

"اس واقعہ کا ایک اہم اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے پہلے ہی دن بیعت کی ہے یا وفات کے دوسرے روز، اور یہی حقیقت امر ہے، کیونکہ حضرت علیؓ نے کسی وقت حضرت ابوبکرؓ کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور کسی نماز میں بھی غیر حاضر نہیں رہے[1]"

مشہور ہے کہ حضرت علیؓ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے احساسات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں اس لئے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی، پھر جب فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علیؓ نے برسرِعام بیعت کی، ابن کثیر اور دوسرے اہلِ علم کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ دوسری بیعت پہلی بیعت کی توثیق و تجدید تھی" اس سلسلہ میں صحیحین اور اُن کے علاوہ دوسری کتابوں میں متعدد روایتیں ہیں[2]"

حضرت علیؓ کی آزمائش اور اُن کی ثابت قدمی

خلافتِ صدیقی کے اوّل ہی دور میں ایک ایسا آزمائشی مرحلہ پیش آیا، جس میں حضرت علیؓ کے طرزِ عمل نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ وہ خاندانی عصبیت اور سیاسی طرزِ فکر سے (جو موقعہ سے فائدہ اٹھاتا ہے) کوسوں دُور اور اخلاص و ایثار کا پیکر تھے، ابن عساکر نے سُوید بن غفلہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:۔

"ابوسفیانؓ، حضرت علی اور حضرت عبّاس (رضی اللہ عنہما) کے پاس آئے اور کہا: اے علی! اور اے عباس! کیا بات ہے کہ خلافت قریش کے اس قبیلہ میں گئی جو مرتبہ کے اعتبار سے پست اور تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہے، بخدا اگر تم دونوں آمادہ ہو تو ہم مدینہ کو اپنے حامیوں اور مؤیدین کے لشکر سے بھر دیں، حضرت علیؓ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۴۹ [2] ایضاً ص ۲۴۶

نے جواب دیا: خدا کی قسم میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا، اگر ہم نے ابوبکرؓ کو اس خلافت کا اہل نہ سمجھا ہوتا تو ہم اس آسانی سے منصبِ خلافت ان کے حوالہ نہ کرتے، اے ابوسفیان! اہلِ ایمان کا شعار خلوص و صداقت ہے، وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں خواہ ان کے منتقر اور اُن کے اجسام میں مکانی طور پر کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو قلب و زبان کا تفاوت اور قول و عمل کا تضاد منافقین کا شیوہ ہے۔[1]"

"نہج البلاغہ" کی شرح ابن ابی الحدید میں مذکور ہے کہ:۔

"جب ابوسفیانؓ نے حضرت علیؓ سے اجازت طلب کی کہ وہ اُن کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو حضرت علیؓ نے جواب دیا: تم ہم سے ایسی بات کے طالب ہو جو ہمارا کام نہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں ایک وصیت کی ہے جس پر ہم قائم ہیں؟ ابوسفیان یہ سن کر حضرت عباسؓ کے گھر گئے اور کہا اے ابوالفضل تم اپنے برادر زادہ (حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہو، ہاتھ بڑھاؤ میں تمھیں خلیفہ تسلیم کرتا ہوں، جب میں تم سے بیعت کرلوں گا تو کوئی بھی تمھارے بارے میں اختلاف نہیں کرے گا، حضرت عباسؓ یہ سن کر ہنسے اور کہا: اے ابوسفیان! جس چیز کو علیؓ نامنظور کریں اس کا میں طالب ہوں؟ یہ سن کر ابوسفیان ناکام واپس آئے۔[2]"

اس سلسلہ کی ایک روایت یہ ہے کہ:۔

"جب فضل بن عباسؓ[3] نے کہا: اے بنی تیم آپ نے ایک نبی کی خلافت حاصل کی ہے

---

[1] کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۱ [2] ابن ابی الحدید ج ۶ ص ۱۵

[3] حضرت عباس کے صاحبزادہ جن کے نام پر ان کی کُنیت ابوالفضل تھی۔

(اور وہ نبی ہمارے خاندان کا تھا) تمہارے مقابلہ میں ہم (خاندانی طور پر) اس کے زیادہ حقدار ہیں،

ابولہب بن عبدالمطلب بن ہاشم کے بعض فرزندوں نے اس طرح کا کوئی شعر بھی کہا، زبیرؓ کہتے ہیں کہ

حضرت علیؓ نے یہ سنا تو اُن کو بلا کر اُن کو روکا اور کہا کہ خبردار آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا اور

فرمایا: "سلامۃ الدین أحب إلینا من غیرہ" یعنی دین کی بقا ہمیں دوسری باتوں کی نسبت زیادہ عزیز ہے"[1]

یعقوبی کی روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عتبہ ابن ابی لہب کو سختی سے جھڑک دیا جبکہ

اس نے ایک شعر کہا جس کا مطلب تھا:۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ زمام کار پہلے ہاشم کے خانوادے سے نکلے گی اور پھر ابوالحسن کے

ہاتھ سے نکل جائے گی"[2]

حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کا مُخلصانہ تعلق اور تعاون

حضرت علیؓ عین اپنی روایتی خاندانی شرافت، عالی ظرفی، بے نفسی، عالی نسبی اور بے داغ

خُلوص و صداقت کے مطابق زندگی بھر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اُن کے معاون رہے،

وہ اُن کے بہترین مُشیر اور سچے خیرخواہ تھے، ہر بات میں اسی امر کو ترجیح دیتے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور

بہتری مُضمر ہو، حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اخلاص اور مسلمانوں کے مفاد میں اور خلافت کے اقدامات کو کامیاب

بنانے میں صحیح و مُخلصانہ مشورہ اور تعاون سے کبھی دریغ نہیں کیا، اس کا انتہائی روشن، ناقابلِ انکار

کُھلا ثبوت جس سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد اور خلافت کی کامیابی سے زیادہ

کوئی شے اُن کو عزیز نہ تھی، یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ مرتدین سے جنگ کرنے اور اُن کے خلاف فوجی

کارروائیوں کی بذاتِ خود قیادت کرنا چاہتے تھے، اور اس سلسلہ میں ذوالقصہ[3] جانے کے لئے پابہ رکاب

تھے، جو ایک انتہائی خطرناک اقدام تھا جس سے نہ صرف ان کی ذات بلکہ پورے اسلامی وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا۔

---

[1] ابن ابی الحدید ج ۶ ص ۲۱ [2] الیعقوبی ج ۲ ص ۱۲۴ [3] یہ مقام مدینہ منورہ سے ایک روز کی مسافت پر ہے۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ :۔

"دارقطنی سعید بن المسیب سے اور وہ حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ "ذوالقصہ" کے لئے تیار ہوئے اور اپنی سواری (اونٹنی) پر بیٹھ گئے تو حضرت علیؓ نے اس کی مہار پکڑلی اور کہا، اے خلیفۂ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کدھر جارہے ہیں؟ میں آپ سے وہی کہتا ہوں جو اُحد کے موقعہ پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اپنی تلوار نیام میں رکھو اور ہم سب کو اپنی دائمی جُدائی کا صدمہ نہ دو اور مدینہ واپس جاؤ، بخدا اگر آپ کو کوئی چشم زخم پیش آیا تو اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لئے بکھر جائے گا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ واپس ہوگئے، اس روایت کو زکریا الساجی اور زہری نے حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کیا ہے۔"[1]

حضرت علیؓ کا ـــــ معاذاللہ ـــــ اگر حضرت ابوبکرؓ اور اُن کی خلافت کی طرف سے دل صاف نہ ہوتا اور اُن سے علی الرّغم بیعتِ خلافت کی ہوتی تو اُن کے لئے یہ سُنہرا موقعہ تھا، جس سے بآسانی فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتے کیا تعجب تھا کہ ان کا رشتۂ حیات ہی منقطع ہوجاتا، اور اس قصّہ سے تقدیری طور پر چھٹی ہی مل جاتی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (خاکم بدہن) ممکن تھا (اگر وہ واقعی دل سے حضرت ابوبکرؓ کو ناپسند کرتے اور ان سے گلو خلاصی چاہتے تھے تو) کہ وہ کسی کو اشارہ کردیتے کہ ان کا (کسی ترکیب سے) کام ہی تمام کردیتا، اور یہ سیاسی ذہن رکھنے والوں اور ناخدا ترس مخالفین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے

اس اہم اور نازک موقعہ پر جو اسلام کے مستقبل اور اُمّتِ اسلامیہ کے وجود کو خطرہ میں ڈال سکتا تھا، عام اور روزمرّہ کی زندگی میں بھی صدیق اکبرؓ، علی مرتضیٰؓ کا خصوصی طور پر،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۴-۳۱۵

اور صحابہ کرام کا عمومی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ مسرت اور تکلیف میں شریک حال ہونا. اور ایک خاندان کے افراد کی طرح برتاؤ کرنا تاریخ کے کھلے ہوئے ذہن کے ساتھ وسیع مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔

یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے حضرت محمد باقر (امام محمد باقر بن زین العابدینؒ) سے کثیر النواء نے نقل کیا ہے کہ :۔

أخذت أبا بكر الخاصرة فجعل	حضرت ابوبکرؓ کی کوکھ میں درد ہوگیا
علی کرّم الله وجهه يسخن يدهٗ	تو حضرت علی اپنا ہاتھ آگ سے گرم
(بالنار) فيكوي بها خاصرة	کر کر کے اس پر پھیرتے رہے اور اس کو
أبي بكر رضی الله عنه۔[1]	سینکتے رہے۔

اس قدسی و پاک نفس جماعت کی حقیقت میں وہ شان تھی جو اللہ تعالٰی نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے :۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ	محمد خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ	ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت
بَيْنَهُمْ (سورة الفتح۔ ۲۹)	ہیں اور آپس میں رحم دل ہیں۔

شیخ ابو جعفر الطوسی نے اپنی کتاب "الأمالی" میں جو بات نقل کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے موقع پر ان کے لئے جہیز کا سامان انتخاب کرنے اور خریدنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہ صرف شریک بلکہ سرگرمی اور دلچسپی سے کوشاں تھے[2]، نیز

---

[1] الرياض النضرة للمحب الطبري۔ ج ۱ "در منثور" از سیوطی، ج ۴ ص ۱۰۱

[2] ملاحظہ ہو کتاب الامالی للشیخ ابی جعفر الطوسی۔ ج ۱ ص ۳۹ طبع نجف آخری ایڈیشن۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ نے بھی حضرت فاطمہ اور حضرت علی کے گھر کا اثاثہ تیار کرنے میں حصہ لیا۔[۱]

حضرت ابوبکرؓ کا اہلِ بیت سے محبّت و احترام کا تعلق

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعلق اہلِ بیت نبوی کے افراد وارکان سے اور خصوصاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں نواسوں حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما سے اس درجہ محبّت وشفقت اور احترام کا تھا، جو حضرت ابوبکرؓ کے شایانِ شان اور ان حضرات کی خصوصیات کے مطابق تھا۔

امام بخاری حضرت عُقبہ بن الحارث رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "ایک دن حضرت ابوبکرؓ نے عصر کی نماز پڑھی، پھر مسجد سے نکل کر ٹہلنے لگے، آپ نے دیکھا کہ حسنؓ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں، آپ نے بڑھ کر اُن کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور کہا: میرے باپ قربان، یہ رسول اللہؐ کے مشابہ ہیں، علی کے نہیں، حضرت علیؓ ہنسنے لگے۔"[۲]

محبّت واعتماد کا یہ تعلق (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان) جانبین سے تھا، حضرت علیؓ نے اپنے ایک فرزند کا نام ابوبکر رکھا تھا[۳] حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادہ محمد کو گود لیا اور خصوصی نگہداشت کی[۴]، اور ایک علاقہ کی گورنری کا بھی اُن کو اہل سمجھا اور اُن کو نامزد کیا جس کی وجہ سے حضرت علیؓ پر زبان طعن بھی دراز ہوئی تھی۔

---

[۱] کتاب "رحماء بینہم" از شیخ محمد نافع بحوالہ ابن ماجہ کتاب النکاح باب الولیمہ۔

[۲] صحیح البخاری، کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم [۳] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۳۲

[۴] تاریخ الخمیس للشیخ حسین الدیار بکری ج ۲ ص ۲۶ (مطبعہ عثمان عبدالرزاق، ۱۳۰۲ھ)

حضرت ابوبکر الصدّیقؓ کی زندگی اور طرزِ عمل ایک خلیفہ کی حیثیت سے

حضرت ابوبکر الصدّیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بیان پر اس باب کو ختم کرنے، اور اس موقع پر حضرت علیؓ کے تاثّرات کو نقل کرنے سے پہلے اُن کی خلافت پر ایک اجمالی نظر ڈالنا مناسب ہوگا، تاکہ معلوم ہو کہ خلیفۂ رسول کس درجہ دنیا سے بے رغبتی اور سادگی کی زندگی گزارتے تھے، سادہ دلی اور تصنّع سے پاک زندگی گزارنے کے علاوہ ان کو کس درجہ اہتمام تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدم بقدم پیروی کریں، اور اس پر دنیا اور دنیا کی ساری نعمتوں کو خاطر میں نہ لائیں:۔

ڈاکٹر فلپ ہٹی (DR. PHILLIP K. HITTI) اپنی مشہور کتاب "مختصر تاریخ عرب" (A SHORT HISTORY OF THE ARABS.) میں لکھا ہے:۔

"ابوبکرؓ مرتدّین کو مغلوب کرنے والے اور جزیرۃ العرب کو اسلام کے جھنڈہ کے نیچے متحد کرنے والے ایک سیدھی سادی زندگی گزارتے تھے، جو متانت و وقار سے بھری ہوئی تھی، وہ اپنی خلافت کی مختصر مدّت کے پہلے چھ مہینے میں روزانہ اپنی قیام گاہ "سُنح" سے (جہاں وہ اپنے مختصر خاندان کے ساتھ ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے) صبح اپنے دارالحکومت مدینہ کی طرف آتے تھے، وہ حکومت سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے، اس لئے کہ اس وقت حکومت کی کوئی آمدنی نہیں تھی جو قابلِ ذکر ہو، وہ حکومت کے تمام کام مسجدِ نبویؐ کے صحن میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے"۔ (لندن ۱۹۵۲ء ص ۷۶-۱۷۵)

سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) اپنی مشہور کتاب ANNALS OF THE EARLY CALIPHATE (تاریخ خلافت اولیٰ) میں لکھتے ہیں:۔

"ابوبکرؓ کے دربار کی سادگی کا وہی عالم تھا جو محمدؐ کی زندگی میں تھا، نہ خُدّام تھے، اور نہ محافظ اور نہ حکومت کی شان و شوکت ظاہر کرنے والی کوئی اور شئے، ابوبکرؓ محنت کے عادی تھے، اور ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاملات کی جزئیات پر بھی نظر رکھتے تھے، راتوں کو وہ مظلوموں اور غرباء کی تلاش میں گھومتے رہتے، حکومت کے عُمّال اور اعلیٰ حکام کو تعینات کرنے میں کنبہ پروری یا طرف داری سے بالاتر تھے، اور اُن کے کردار سے عقل و دانش کا اظہار ہوتا ہے۔"[1]

جمع قرآن کریم

حضرت ابوبکرؓ کے کارناموں میں اُن کا ایک عظیم کارنامہ قرآن کریم کا یکجا کرنا ہے، جس طرح اسلام کی بقاء اور اس کی اصل روح کو زندہ رکھنے کے سلسلہ میں مرتدین کے خلاف جہاد ان کا عظیم کارنامہ ہے، اسی طرح پورے عزم و حزم کے ساتھ قرآن کریم کو کتابی شکل میں جمع کرنے کی خدمت بھی ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے، اس کا محرک یہ واقعہ ہوا کہ حُفّاظ کی بڑی تعداد مرتدین کے خلاف جنگوں میں شہید ہو گئے،[2] اور یہ ڈر تھا کہ باقی ماندہ حُفّاظ بھی

---

[1] ANNALS OF THE EARLY CALIPHATE, LONDON-1982, P. 128

[2] اہلِ یمامہ کے خلاف جنگ میں ستّر صحابی شہید ہوئے جو قرآن کے حافظ تھے، روایت اس سے زیادہ تعداد کی بھی ہے کہ جنگ یمامہ کے روز حفّاظ قرآن کی شہادتیں بہت زیادہ ہوئیں ڈر تھا کہ اس کے بعد کی جنگوں میں اور بھی حفّاظ شہید ہوں، حضرت ابوبکرؓ کے لئے یہ بڑے فکر و غم کی بات تھی، مگر جو کام رسول اللہ صلے اللہ علیہ آلہ وسلم نے نہیں کیا وہ کیونکر کریں؟ اس لئے ان کو تردد تھا لیکن بعد میں اللہ تعالےٰ نے اُن کو اس معاملہ میں شرح صدر عطا فرمایا۔

روم و فارس سے ہونے والی جنگوں میں کام آجائیں، بہرحال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ختم نہ ہونے پائی تھی کہ قرآن کریم (مشہور اقوال کی بناء پر) کی کتابت مصاحف میں اس طرح مکمل ہوگئی جس شکل میں آج ہم پڑھتے ہیں۔

اس باب کو ہم حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ان تأثرات کے بیان پر ختم کرتے ہیں، جو حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد آپ نے غم و اندوہ کی حالت میں ظاہر کئے[1]:۔

"روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوئی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا، اور روتے ہوئے عجلت کے ساتھ وہاں پہونچے اور کہا:۔

"اللہ کی آپ پر رحمتیں ہوں اے ابوبکر! واللہ آپ سب سے پہلے اسلام لائے اور سب سے زیادہ آپ کا ایمان مکمل تھا، اور سب سے زیادہ آپ کا یقین پختہ تھا، آپ سب سے زیادہ اللہ کا خوف اپنے دل میں رکھتے تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے زیادہ اعتماد رکھنے والے تھے حضورؐ کے اُسوہ، اخلاقِ حسنہ خوبی و بلندیٔ کردار سے آپ ہی کو سب سے زیادہ مشابہت و مناسبت تھی، حضورؐ کے نزدیک زیادہ محترم اور زیادہ قابلِ اعتماد آپ ہی تھے، اللہ تعالیٰ اسلام کی طرف سے آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے اس وقت رسول اللہ صلے اللہ

---

[1] المحب الطبری نے اپنی کتاب "الریاض النضرہ" میں حضرت علیؓ کا ایک طویل خطبہ نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد دیا تھا، اس کے طویل، لفظ بہ لفظ منقول ہونے کے سلسلہ میں شک کیا جا سکتا ہے، لہذا کتاب "الجوہرۃ فی نسب النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم واصحابہ العشرۃ" لمحمد بن ابی بکر بن عبداللہ بن موسی التلمسانی معروف بہ البری کے نقل کردہ حصہ پر ہم اکتفاء کرتے ہیں۔

علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی جب سبھوں نے تکذیب کی تھی، اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں آپ کو صدّیق قرار دیا، اور فرمایا: "وَالَّذِی جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝" (سورۃ الزمر۔۳۳) (جو سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ متقی ہیں) آپ نے حضورؐ کی اس وقت غمخواری کی جب سب لوگ پیچھے مڑ رہے تھے، آپ ان کے ساتھ اس وقت کھڑے ہوئے جب لوگ بیٹھ رہے تھے، سختی و مصیبت کے وقت آپؐ کا ساتھ دیا جب کہ لوگ ساتھ چھوڑ کر نکل رہے تھے" ثَانِیَ اثْنَیْنِ" کا اعزاز صحبت رکھنے والے، ہجرت میں آپؐ کے رفیق، آپؐ کو دلاسا اور تسکین دینے والے، اُمّت میں ان میں بہترین قائم مقامی (خلافت کا حق ادا) کرنے والے آپ ہی تھے، آپ اس وقت مضبوط رہے جس وقت آپؐ کے ساتھ ڈھیلے تھے، ایسے موقع پر سامنے آئے جب دوسرے شست تھے، آپ ایسے وقت میں کامیاب رہے جب دوسرے ناکام رہے، قوت کے ساتھ اس وقت چلے جب لوگ رُک رہے تھے، آپ سب میں زیادہ دیر تک خاموش رہنے والے اور سب سے زیادہ جچی تُلی بات کرنے والے تھے، دل کے سب سے زیادہ شُجاع، عمل میں سب سے برتر آپ اس شان کے تھے، جن کے بارے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے" جسم کے کمزور اور خدا کے حقوق ادا کرنے میں قوی، اپنی ذات کے لحاظ سے منکسر المزاج مگر اللہ کے نزدیک ذی وجاہت، آسمان و زمین میں پسندیدہ" اللہ آپ کو ہماری طرف سے، اسلام کی طرف سے بہترین صلہ و جزاء عطا فرمائے[1]!!

---

[1] الجوھرۃ فی نسب النبی واصحابہ العشرۃ۔ ج ۲ ص ۱۲۶

۱۵۷

باب چہارم

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی رض کے عہد میں

امت اسلامیہ عربیہ کے نازک ترین عبوری دور میں کیسے قائد و خلیفہ کی ضرورت تھی؟ حضرت عمر رض خلیفۂ قوی و امین، حضرت علی رض کا حضرت عمر رض سے بے نظیر اخلاص و تعاون اور اس کے ناقابلِ انکار تاریخی شواہد، اہلِ بیتِ کرام کے ساتھ حضرت عمر رض کا محبت و احترام کا رویہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت

اُمتِ اسلامیہ عربیہ کے نازک ترین عبوری دور میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے لئے نامزدگی اور اس کے اثرات ونتائج

حضرت ابو بکرؓ کی وفات ہوئی اور ان کی جگہ حضرت عمرؓ خلیفہ نامزد ہوئے[1]، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لئے اس لئے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروقؓ میں قوتِ فیصلہ، مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل ورائے کی پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے، جو ایک ایسے ترقی پذیر معاشرہ اور نوخیز مملکت کی سربراہی اور قیادت کے لئے ضروری ہے، اس وقت اسلام دنیا میں ایک نئی قوت بن کر ابھر رہا تھا، عظیم و وسیع فتوحات (جن سے کسی قوم یا مذہب کو کبھی سابقہ پڑا ہوگا) وہ پہلے پہل اسلام کے ذریعہ عربوں کو حاصل ہورہی تھیں، یہ تاریخ کا انتہائی نازک موڑ تھا، اور اس وقت پیدا ہونے والے مسائل کی گتھیاں کسی ایسے ناخنِ تدبیر کی محتاج تھیں جو سب کو بیک وقت سلجھا سکے، اس وقت دنیا کی دو[2] عظیم طاقتیں رومی بازنطینی، اور ایرانی ساسانی سلطنتیں اسلامی سلطنت کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگی تھیں، اور ان کے سرنگوں ہونے کے آثار شروع ہو چکے تھے، ان سلطنتوں کے ساتھ ان کی دولت، عیش و تنعم[3] کے وہ سامان جو ان کے صاحبِ ثروت اور دادِ عیش دینے والے گھرانوں میں استعمال ہوتے تھے، اور جو عیش پسند اور عیش کوش معاشروں میں رائج تھے،

---

[1] اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عمر باون[52] سال چھ[6] ماہ کی تھی، اور حضرت علی کرم اللہ

اُن عربوں کے سامنے اُن کے انبار لگے ہوئے تھے، اور اُن کے زیرِ قدم تھے، جو ابھی تک ایک صحرائی یا نیم صحرائی زندگی گذار رہے تھے، چمڑے کے خیموں یا نیم خام نیم پُختہ مکانوں میں رہنے کے عادی تھے، عیش و عشرت کے سامان علیٰحدہ رہے، وہ مُتمدّن ممالک کے روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے بھی ناواقف تھے، انھوں نے عراق میں جب پہلی بار کافور دیکھا تو اس کو نمک سمجھے اور شاید کسی نے آٹا گوندھنے میں اس کو ملا بھی لیا تھا۔[1]

مسلمان عرب فاتحین کو ایک پیچیدہ صورتِ حال اور زندگی کے ایک نئے تجربہ کا سامنا کرنا تھا۔ ایک طرف عربوں کی سپاہیانہ زندگی، اسلامی اقدار و معیار اور اس مثالی معاشرہ کو اس کی نوک پلک کے ساتھ محفوظ رکھنے کا سوال تھا، جس کی اسلام نے تعلیم دی تھی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ اوّلین نے اس کی روشن عملی مثال قائم کی تھی، دوسری طرف مفتوحہ علاقوں اور ان اسلامی نو آبادیات کے انتظام و انصرام اور ان مُتمدّن اقوام کی قیادت کا فرض انجام دینا تھا، جو اپنی تمدّنی خصوصیات میں بہت آگے نکل چکی تھیں۔

ان حالات کی روشنی میں حضرت عمرؓ کی نامزدگی ایک طرح سے حکمتِ الٰہی کا مظہر تھا، اسلام کو باقی رکھنے کے لئے، دین کو سارے عالم میں غالب کرنے کے لئے اور اخلاقی لحاظ سے دنیا کے کھوکھلے اور پست معاشروں کو اعلیٰ اسلامی قدروں سے روشناس کرنے اور ان کو صحیح راستوں پر لگانے کی ذمّہ داری اس اُمّت کے حصہ میں آئی تھی، حضرت عمرؓ اس مُہم کو انجام دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، اور اس کے ہر طرح اہل تھے، قوت و امانت میں ممتاز تھے، اسلام کے مقاصدِ اوّلین کو اور خلافتِ نبوی کے بار کو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ج ۷ ص ۶۷

جس خوبی سے انھوں نے سنبھالا اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔

حضرت عمرؓ کا لوگوں کے دلوں میں احترام بھی تھا، اور رُعب بھی ایسا رُعب جو ایک آہنی عزم کے انسان ہی کا ہو سکتا ہے، اور اس کی روشن مثال یہ ہے کہ انھوں نے حضرت خالد بن ولید (جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سیف اللہ" (خدا کی تلوار) کا لقب دیا تھا) کی معزولی کا پروانہ اس وقت جاری کیا، جب اُن کی شہرت بامِ عروج پر پہونچی ہوئی تھی، جنگ میں اُن کی قیادت بلکہ محض موجودگی بھی کامیابی اور فتح مندی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی، ہر طرف سے اُن کو مدح و تحسین کا خراج پیش کیا جا رہا تھا، اور ان کا قائدانہ و فاتحانہ اقبال اپنے آخری نقطہ پر تھا، ایسے عالم میں اور ایسے وقت جب کہ مسلمانوں کو ان کی قیادت کی سخت ضرورت تھی، اور وہ ہر دل عزیز تھے، حضرت عمرؓ نے اُن کو معزول کرنے کا فیصلہ نافذ کر دیا، اور یہ حکم اُس وقت پہونچا جب مسلمان رومیوں کے مقابلہ میں (سب سے عظیم جنگ) جنگِ یرموک کے میدان میں صف آرا تھے، اور حضرت ابو عبیدہؓ کو قیادت کی ذمّہ داری سونپی گئی، یہ ایسا نازک وقت تھا کہ اچھے اچھّوں کے قدم ڈگمگا سکتے تھے، اور نفس امّارہ بلکہ فطری خودداری بھی اپنا رنگ دکھا سکتی تھی، لیکن حضرت عمرؓ کا رُعب و جلال اور حضرت خالدؓ کی قوتِ ایمانی تھی کہ حکم پاتے ہی اُن کی زبان سے نکلا "سمعاً وطاعة لأمير المؤمنين"[1] (امیر المؤمنین کا حکم سر آنکھوں پر!) اور جب اُن سے کہا گیا کہ ایسے نازک موقعہ پر یہ عظیم تبدیلی لشکرِ اسلام اور مسلمانوں میں انتشار کا موجب

---

[1] البدایة والنهایة ج ۷، ص۱۸-۱۹ ابن اسحاق، ابوعُبیدہؓ کی امارت کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ یرموک کا واقعہ ہے جب دمشق کا محاصرہ جاری تھا" بہرحال واقعہ جب بھی پیش آیا ہو حالات نازک تھے۔

ہوسکتی ہے، تو انھوں نے فرمایا کہ "جب تک عمرؓ موجود ہیں کسی فتنہ کی گنجائش نہیں ہے"۔[1]

حضرت خالدؓ کا امیر المؤمنین کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اور جب کہ وہ ایک مقبولِ عام صاحبِ اقبال، فاتح و سپہ سالار تھے، اور اُن کا اس طرح انکساری کے ساتھ سپہ سالاری کے عہدہ سے اُتر کر معمولی سپاہی بن جانا ایک ایسا واقعہ ہے، جس کی دنیا کی جنگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کی تاریخ میں مثال ملنی مشکل ہے، اسی کے ساتھ وہ حضرت عمرؓ کے دبدبہ کی بھی دلیل ہے، اور یہ کہ کس درجہ ان کو تمام امورِ سلطنت اور فوج پر قابو تھا۔

اسی طرح مصر کے فاتح اور حاکم سیدنا عمرو بن العاصؓ کا واقعہ بھی ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے، ان کے صاحبزادہ محمد اور ایک مصری کے درمیان گھوڑدوڑ کا مقابلہ ہوا، مصری کا گھوڑا آگے نکل گیا، محمد بن عمرو بن العاصؓ نے کہا: ربّ کعبہ کی قسم میرا گھوڑا آگے نکلا ہے، مصری نے بھی قسم کھائی کہ ربِّ کعبہ کی قسم میرا گھوڑا آگے تھا، محمد نے غصہ میں آکر مصری کو کوڑے لگا دیئے اور کہا: یہ لو، میں ابن الاکرمین ہوں، یعنی میں بڑوں کی اولاد

---

[1] ملاحظہ ہو "کتاب الخراج" از قاضی ابو یوسف ص۸۷ اور تاریخ طبری ص۲۵۲

یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خالد کی معزولی ان کی بعض ایسی کارروائیوں کی وجہ سے ہو جو حضرت عمرؓ کو ناپسند ہوئی ہوں، اجتہاد کی گنجائش ہر مرحلہ پر رہتی ہے، تاریخ میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے شہروں کے والیوں کو لکھا کہ "میں نے خالدؓ کو کسی ناراضگی یا ان کی خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا، بلکہ اس لئے کہ لوگ اُن کے اس درجہ گرویدہ ہو رہے تھے کہ ساری فتوحات کو ان کی ذات سے منسوب کرنے لگے تھے، حالانکہ فتح و نصرت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور وہی قادرِ مطلق ہے"۔ (تاریخ طبری ۲۵۲۸) عزل و نصب کے اس واقعہ کا تجزیہ استاذ صادق عرجون نے اپنی کتاب "خالد بن الولیدؓ" (مطبوعہ الدار السعودیہ۔ ط ۳ ۱۹۸۱ء) میں تفصیل سے کیا ہے۔

ہوں (یا یوں کہئے میں رئیس زادہ ہوں) مصری نے حضرت عمرؓ کے یہاں فریاد کی، حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر (سیدنا) عمرو بن العاصؓ کو خط لکھ کر اُن کو اور اُن کے لڑکے کو بلایا، جب یہ دونوں آئے تو مصری سے کہا کہ تمھارے سامنے یہ دُرّہ رکھا ہے، اس سے ان رئیس زادہ کی خبر لو، اور حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا: "متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم احرارًا؟" (تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا جب کہ اُن کی ماؤں نے اُن کو آزاد پیدا کیا تھا۔)[1]

عرب فاتحین کی محنت کش سادہ زندگی اور قبائل عرب کی موروثی سادگی کی محافظت

اُمّتِ اسلامیہ اُس وقت ایک عبوری دور سے گزر رہی تھی، تاریخِ اسلام کا یہ ایک انتہائی نازک اور فیصلہ کن زمانہ تھا، جس سے دوسری قوموں کو اپنی طویل تاریخ میں گزرنا پڑا ہے، عرب ابھی نئے نئے اس صحرائی زندگی اور بدویانہ معاشرت سے نکل کر دنیا کو دیکھ رہے تھے، کہاں وہ صحرائی خیموں کی زندگی، اونٹ اور بھیڑوں کی رکھوالی ان ہی کے گوشت اور دودھ پر گزر اوقات، کھالوں اور بالوں کے خیمے، اور کہاں وہ ترقی یافتہ متمدن زندگی کے لوازمات، عیش و عشرت کے سامان، جاہ و حشم کے مظاہر؟ اُن دونوں کے درمیان اعتدال کے ساتھ توازن باقی رکھنا شیشہ و آہن کو آپس میں ٹکرانے سے بچانا تھا۔

اس کام کو حضرت عمرؓ نے انجام دیا اور اسی طرح خود اُن کی زندگی کے طرز و معیار میں تبدیلی نہیں ہوئی، وہی سخت کوشی اور سادگی، جو ان کے اندر پہلے سے تھی،

---

[1] "سیرت عمر بن الخطاب" از ابن جوزی، ص ۸۶ (المطبعۃ المصریۃ بالأزہر ۱۳۳۱ھ)

اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں آئی، دوسری طرف پوری طرح چوکنا رہے کہ عربوں کی معاشرت دولت و تمدن کے مظاہر سے بدل نہ جائے، فتوحات کی ریل پیل تھی، لیکن حضرت عمرؓ ایک ایک دانہ کا محاسبہ کرتے، اور خود اُن کی زندگی کا جو معیار تھا، وہ صاحبِ "البدایۃ والنہایۃ" کے اس بیان سے ظاہر ہوگا:۔

"جب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) بیت المقدس گئے تو وہاں جو صحابہ پہلے سے موجود تھے، ان کو ایسی قبائیں (باچوغہ) پہنے ہوئے دیکھا جس کو عربی میں "یلامق"[1] کہتے ہیں، جو دیباج (موٹے مخملی انداز کے کپڑے) سے بنے تھے، حضرت عمرؓ سے خوشحالی کا یہ منظر دیکھا نہیں گیا، ان کے بدن سے اتروانے لگے، مگر جب انھوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ حالتِ جنگ میں ہیں، اور اسلحہ سے لیس رہنے کے لئے اس لباس کی ضرورت ہے تو آپ نے اُن کی معذرت قبول کرلی۔"[2]

طارق بن شہابؓ سے روایت ہے کہ "حضرت عمرؓ جب شام جارہے تھے تو راستہ میں ایک بڑا نالہ سامنے آگیا، آپ بے تکلفی کے ساتھ اترے اور پائتابہ[3] (جو خفین کے اوپر لپیٹا جاتا ہے) اتار کر ہاتھ میں لیا اور اپنی اونٹنی کے ساتھ پانی میں اُتر گئے، اور وہ پانی کا حصہ پار کرلیا، اس پر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی، (جوتے سنبھالنے اور اونٹ کی مہار پکڑنے کا کام خادموں کو کرنا چاہیئے تھا) حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا: یہاں والوں کے لئے تو آپ نے غیر معمولی سادگی کا انداز اختیار کیا، حضرت عمرؓ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا: ابوعبیدہ! تمہارے علاوہ کسی نے ایسی بات کہی ہوتی (تو شکایت کی بات نہ تھی)

---

[1] یلمق کی جمع یلامق، قباء یا چوغہ۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۵۶

[3] خفین کے اوپر ایک ہلکی کھال کا پائتابہ جوتے کی شکل کا ہوتا ہے۔

ابو عبیدہ! تم (یعنی عرب) وہ ہو جو لوگوں میں پست، حقیر اور نا قابلِ التفات قوم شمار ہوتے تھے، تم کو عزت اسلام کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اگر اسلام کو چھوڑ کر کسی اور ذریعہ سے عزت طلب کرو گے تو اللہ تم کو پھر ذلیل کر دے گا[1]!"

حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عاملوں کو جو عجمی ممالک میں تعینات تھے لکھا:

"عیش پسندی اور اہلِ عجم کے لباس نہ اختیار کرنا، دھوپ (میں چلنا اور کام کرنا) نہ چھوڑنا، یہ عربوں کا حمام ہے، محنت کش اور فاقہ کش معاشرت کو اپنائے رکھنا، کھردرے اور چوبی بستروں کی عادت قائم رکھنا (یعنی نرم بچھونے گدے مخمل وغیرہ کے استعمال سے بچنا) موٹے جھوٹے پرانے کپڑوں پر گزر کرنا[2]، نیزے بھالے رکھنا نہ بھولنا، گھوڑوں پر جست لگا کر بیٹھنا، تیر اندازی اور نشانہ بازی کرتے رہنا[3]!"

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ سے یہ بھی مروی ہے جو اُن کی پختہ مزاجی، آہنی عزم اور اخلاقیات کے اعلیٰ ترین معیار کو بتاتی ہے، فرماتے ہیں:-

"اسلام نے اپنے بال و پر نکالے ہیں[4]، قریش چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مال کو اپنے لئے خداداد مدد سمجھیں اور اس کی عبادت (فرائض) سے غافل رہیں، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب تک عمر زندہ ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں ناکہ پر کھڑا ہوا نگرانی و حفاظت کر رہا ہوں، قریش کی گردنیں اور پاؤں پکڑے ہوئے ہوں کہ کہیں یہ آگ میں نہ گر جائیں!"

لوگوں کی نفسیات سے گہری واقفیت اُن کے مزاج کو سمجھنے، اور اُن کی حکیمانہ سیاست کا

---

[1] ابن کثیر ج ۷ ص ٦٠ [2] عربی لفظ ہے "اخلولقوا" یعنی معمولی موٹے جھوٹے کپڑے پہننا۔

[3] روایت البغوی عن ابی عثمان النہدی۔ [4] عربی لفظ ہے "قد بزل" یعنی بچے نے دانت نکالے، مطلب ہے کہ اب اُبھرنا شروع ہوا ہے، ترجمہ کیا گیا "بال و پر نکالے ہیں"!

ایک نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے صحابہ کو مدینہ میں روک رکھا تھا، اور فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ جس بات کا خدشہ ہے وہ یہ کہ آپ لوگ مختلف ملکوں میں پھیل جائیں۔ حضرت عمرؓ سمجھتے تھے کہ اگر اس معاملہ میں تساہل سے کام لیا گیا تو مفتوحہ علاقوں میں فتنے سر اٹھانے لگیں گے، اور لوگ "اہم شخصیات" کے گرد جمع ہو جائیں گے، پھر ان شخصیات کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے، مختلف پارٹیاں اور جماعتیں ہو جائیں گی، اور یہی بعد میں نااتفاقیت کا سبب بنیں گے۔

ممتاز شیعہ قانون داں اور انگریزی کے نامور صاحبِ قلم جسٹس سید امیر علی حضرت عمرؓ کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مختصر عہدِ خلافت صحرا نشین عرب قبائل میں امن و امان قائم رکھنے میں صرف ہو گیا، ان کو نئی اسلامی سلطنت کی تنظیم کا موقع نہیں ملا، لیکن حضرت عمرؓ جو واقعی ایک عظیم انسان تھے، انھوں نے جب خلافت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لی تو اس بات کی انتھک اور کامیاب کوشش کی کہ مفتوحہ ممالک میں عوام کو زندگی کی سہولتیں حاصل ہوں اور بہبودی کا دور دورہ ہو، یہ ایک اہم خصوصیت ہے، جو اسلامی حکومت کو ابتداء ہی سے حاصل رہی"[1]

موصوف ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"حضرت عمرؓ کی خلافت بڑی اہمیت کی حامل اور اسلام کے لئے بڑی قوت بخش تھی، حضرت عمرؓ اخلاقی لحاظ سے ایک صاحبِ کردار انسان تھے، مزاج میں پختگی اور فطرت میں نرمی تھی، عدل و انصاف کے معاملہ میں ٹھوس اور اصول پسند تھے، سیرت کی پختگی اور قوتِ عمل میں بے نظیر تھے"[2]

لہ THE SPIRIT OF ISLAM, *OP. CIT.*, P. 278

مہ A SHORT HISTORY OF THE SARACENS, *OP. CIT.*, P. 27

"وہ سخت آدمی تھے، انصاف کے بارہ میں بڑے بااصول وحساس، عربوں کی سیرت وفطرت کے پوری طرح نبض شناس، ایک ایسی قوم کی قیادت کرنے کے پوری طرح اہل اور مناسب ترین انسان تھے، جو قوم لاقانونیت کی خوگر تھی، ان کو جرائم کے مرتکب اور بے راہ روی پر مائل افراد کو سزا دے کر سیدھا رکھنے کی جو قوت حاصل تھی، اس کے ذریعہ وہ اس پر قابو پاگئے کہ کس طرح نیم وحشیانہ زندگی کے عادی افراد جو خانہ بدوش قبائل کی خصوصیات رکھتے تھے، ان کو اخلاق و قانون کی راہ پر چلائیں، اور ان کو اس وقت اخلاقی انارکی سے محفوظ رکھیں جب کہ انھوں نے یکبارگی عیش وعشرت اور دولت کی بہتات دیکھی، مفتوحہ ممالک کی دولت اور عیش کوشی کے وہ سامان ان کے سامنے تھے جن کا وہ پہلے تصور نہیں کرسکتے تھے، اور اب وہ معمولی سے معمولی فرد کے لئے قابلِ حصول تھا۔

وہ بغیر کسی محافظ یا چوکیدار کے راتوں کو گشت لگایا کرتے تھے تاکہ لوگوں کے صحیح حالات کا پتہ چلائیں، یہ تھی اپنے وقت کے ایک عظیم طاقت کے مالک حکمراں کی حالت"۔[1]

سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) نے لکھا ہے :-

"اسلامی سلطنت میں رسول اللہ ؐ کے بعد عمرؓ عظیم تر انسان تھے، ان کی ثابت قدمی اور ذہانت کا یہ ثمرہ تھا کہ ان دس برسوں میں انھوں نے شام، مصر، اور فارس کو اسلامی طاقت کے آگے سرنگوں کردیا، اور اس وقت سے آج تک یہ ممالک اسلام کے تابع ہیں۔

باوجود اس کے کہ وہ ایک بڑی سلطنت کے عظیم حکمراں تھے، کبھی بھی بات کی

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE SARACENS, PP. 43-44

تہ تک پہونچنے میں اور حکمت و قوت کے ساتھ تمام معاملات کا منصفانہ فیصلہ
کرنے میں ان سے کوتاہی سرزد نہیں ہوئی، انھوں نے کبھی اس کو گوارا نہیں کیا۔
کہ ان کو بڑے شاہانہ قسم کے القاب سے نوازا جائے' ایک سادہ عوام کی زبان پر
چڑھا ہوا لقب اُن کے لئے استعمال ہوتا تھا "رئیس العرب"[1] یعنی عرب سردار"
دور دراز کے ملکوں سے ان کے پاس وفود آتے تھے' دریافت کرتے کہ خلیفہ'
اور حاکم عمر کہاں ہیں؟ مسجد کے گوشوں میں لوگوں سے پوچھتے' کیا "امیر المؤمنین"
مسجد میں ہیں؟ حالانکہ وہ اُن کے سامنے معمولی سے لباس میں بیٹھے ہوتے تھے۔"[2]

حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلامی سلطنت کی توسیع

مصنف کے لئے مختصراً ابھی ان عظیم فتوحات کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے'
جو حضرت عمرؓ کے عہد میں حاصل ہوئیں اور دنیا کی دو[3] عظیم شاہنشاہیاں جنھوں نے
اس وقت کی متمدن دنیا کو آپس میں بانٹ لیا تھا، اور جن کی سیاسی تنظیم اور تمدنی و
معاشرتی زندگی پر اپنا سکہ رائج کر رکھا تھا، اس زمانہ میں اسلامی سلطنت (جس کے لئے
صحیح لفظ "خلافت نبویہ راشدہ" ہے) نے کس طرح اُن کے بڑے صوبوں اور دار الحکومتوں
اور بڑے بڑے شہروں کو قابو میں لے لیا تھا، جن پر بڑے بڑے پرانے فاتح قابض
نہ ہو سکے، اور کس طرح نئے شہروں کو آباد کیا، کیونکہ ان کی تفصیل مکمل و مفصل تاریخِ
اسلام کا موضوع ہے یا وہ کتابیں جو حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت میں

---

[1] صحیح لفظ "امیر المؤمنین" ہے یا خلیفہ۔

[2] ANNALS OF THE EARLY CALIPHATE, *OP. CIT.*, P. 283

لکھی گئی ہیں[1]"۔

حضرت عمر فاروق رضؓ کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کا تعاون

لیکن ہم مختصراً یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سیدنا عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے درمیان کس درجہ اخلاص و مودّت کا تعلق تھا، وہ ایک دوسرے کے کیسے قدرداں تھے، اور ہر ایک ایک دوسرے پر کس درجہ اعتماد کرتا تھا، نیکی و پرہیزگاری (جس کو قرآن کریم نے "اَلْبِرُّ وَالتَّقْوٰی" کہا ہے) کے امور میں تعاون کرتے تھے، خلافت کے اہم معاملات میں ہاتھ بٹاتے تھے، اور ایک دوسرے کی خیر خواہی اور آپس میں مشورہ سے کام کرتے تھے، اس سلسلہ کی چند مثالوں پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

نافع العیشی کا بیان ہے:۔

"ایک مرتبہ میں احاطۂ صدقہ[2] میں عمر بن الخطابؓ اور علی بن ابی طالبؓ کے ساتھ داخل ہوا، عثمانؓ سایہ میں بیٹھ کر لکھنے لگے، علیؓ ان کے سامنے کھڑے جو کچھ عمرؓ کہتے اس کا املاء کرا رہے تھے، عمرؓ کی کیفیت یہ تھی کہ وہ دھوپ میں کھڑے تھے، سخت گرمی پڑ رہی تھی، اُن کے جسم پر دو چادریں تھیں، ایک سے جسم لپیٹے ہوئے تھے، اور دوسری چادر سر پر ڈالے تھے، صدقہ میں آئے ہوئے اونٹ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھا جائے "البدایۃ والنہایۃ" از ابن کثیر ج ۷، اور "الکامل فی التاریخ" از ابن اثیر ج ۳ "فتوح البلدان" از بلاذری "عمر بن الخطاب" از سید علی طنطاوی و ناجی طنطاوی (اس موضوع پر اردو میں علامہ شبلی نعمانی متوفی ۱۳۳۲ھ کی کتاب "الفاروق" سب سے زیادہ جامع اور طاقتور تحریر ہے)

[2] "الحیرۃ" کے معنی ہیں احاطہ "حیرۃ الصدقۃ" وہ احاطہ جہاں صدقات کے اونٹ باندھے جاتے تھے

شمار کر رہے تھے، ان اونٹوں کے رنگ اور ان کے دانت (تاکہ اونٹوں کی عمریں معلوم ہوں) نوٹ کر رہے تھے، اس موقع پر علیؓ نے عثمانؓ سے کہا کہ قرآن میں آیا ہے یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ۝ (سورۃ القصص ۲۶) پھر عمر فاروقؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا "هذا القويّ الأمين" یہ ہیں وہ جن کو قوی اور امین کہا جائے۔[1]

سیدنا علیؓ حضرت عمر فاروقؓ کے ایک خیر خواہ، قابلِ اعتماد رفیق و مشیر تھے حکیمانہ انداز میں مشکل سے مشکل مسئلہ کو اس طرح حل کر دیتے کہ شک و شبہ کی گنجائش نہ رہتی، ایک روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "لولا عليٌّ لهلك عمر" اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"[2] نیز تاریخ و ادب کی کتابوں میں یہ جملہ ضرب المثل بن گیا ہے "قضيّة ولا أبا حسن لها" (ایک پیچیدہ مسئلہ سامنے ہے مگر اس کے حل کے لئے ابوالحسن نہیں) اس کے علاوہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "أقضاهم علی" یعنی مشکل مسائل کے حل اور گتھیوں کے سلجھانے میں سب سے زیادہ قدرت رکھنے والے علیؓ ہیں۔

حضرت عمرؓ جب بیت المقدس کے سفر پر گئے تو اپنی جگہ پر قائم مقام حضرت علیؓ ہی کو بنا گئے تھے۔

حضرت علیؓ نے اپنی صاحبزادی اُم کلثومؓ کو حضرت عمرؓ کی زوجیت میں دیدیا تھا، اور یہ دلیل ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کی کتنی عزت دل میں رکھتے تھے، اور ان کا آپس میں کس درجہ ارتباط تھا۔[3]

---

[1] الکامل فی التاریخ لابن اثیر ج ۳ ص ۵۵-۵۶ [2] الاستیعاب از ابن عبدالبر ص ۲۰۱۵

[3] "مجالس المؤمنین" از قاضی نور اللہ الشوستری اور "المسالک شرح الشرائع" از ابی القاسم القمی۔ (یہ دونوں شیعہ عالم ہیں)

حضرت علیؓ کا اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تعاون و اخلاص کا بیّن ثبوت

سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ کو اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کس درجہ عزیز تھی، اور حضرت عمر فاروقؓ کے وہ کس درجہ مُخلص تھے، اس کا سب سے زیادہ واضح اور بیّن ثبوت یہ ہے کہ جب نہاوند[1] کا معرکہ سامنے آیا، اس موقع پر (جو انتہائی فیصلہ کُن مرحلہ تھا) حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے جو موقف اختیار کیا وہ صرف ایک مخلص ترین انسان کا ہو سکتا ہے، واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

نہاوند[2] کا معرکہ درپیش تھا، اس معرکہ کو جس چیز نے اُبھارا تھا وہ یہ کہ مسلمان جب فارس میں العلاء کی فوج کو شکست دے چکے اور الاہواز فتح ہو گیا، اہلِ فارس نے اپنے بادشاہ یزدگرد سے مُراسلت قائم کی جو اس وقت مرو میں تھا، اُس کو جوش دلایا، دوسری طرف الباب سے لے کر سندھ تک جتنے حکمراں تھے، نیز خراسان اور حلوان میں جو ریاستوں کے والی تھے، سب جوش میں آ گئے، وہ سب اکٹھا ہوئے اور آپس میں عہد و پیمان کئے، اور نہاوند کی طرف چل پڑے، ایرانیوں کو جب یزدگرد کا حکم ملا تو نہاوند میں فیروزاں کے پاس ڈیڑھ لاکھ جنگجو سپاہی آ گئے، شاہ ایران نے اس موقع پر یہ وہ حربہ استعمال کیا جو ان فوجیوں کے اندر مذہبی جوش اور قومی و نسلی غیرت اُبھار دے، اور وہ جذبہ ان کے اندر پیدا کر دیا کہ ساسانی کیانی سلطنت جو دنیا کی ایک قدیم شاہنشاہیت تھی، اس کا چراغ بجھ رہا ہے، اس کو باقی رکھنا ہے، اس موقع پر ایران کا قدیم عَلَم (دُرفش کاویانی) نکالا گیا، جو جواہرات سے مُرصّع تھا، اہلِ ایران اس عَلَم کے نکلنے کو فالِ نیک سمجھتے اور فتح و کامرانی کا رمز تصوّر کرتے تھے، اس عَلَم کے ساتھ آتش پارسی جس کی اہلِ ایران

---

[1] ایک شہر ہے جو ہمدان کے جنوب میں پہاڑی علاقہ میں پڑتا ہے۔

[2] کہا جاتا ہے یہ واقعہ ۱۸ھ کا ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے ۱۹ھ کا واقعہ ہے۔

پرستش کرتے تھے، ساتھ لے لیا گیا، یزدگرد نے مردان شاہ (اپنے بیٹے) کو سر لشکر مقرر کر کے نہاوند کی طرف روانہ کیا۔

اسلامی لشکر کے قائدِ عام حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کو یہ خبر لکھ بھیجی اور جب آئے تو زبانی بھی بتایا اور یہ بھی کہا کہ اہلِ کوفہ اس کی اجازت طلب کر رہے ہیں کہ وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں، اور خود ہی اپنی طاقت کا اظہار کرنے میں پہل کریں تاکہ اُن کے دشمنوں پر رُعب پڑے۔

حضرت عمرؓ نے اہلِ شوریٰ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا اور فرمایا کہ "اب سخت خطرناک حالات سامنے ہیں، میں نے ارادہ کیا ہے کہ میرے ساتھ جو لوگ ہیں اور جن پر قابو ہے، ان کو لے کر اُن دونوں شہروں کے درمیان کسی منزل پر فوج اُتاروں، پھر اُن کو دشمنوں سے مقابلہ پر کھڑا کر دوں، اور خود ان کی پُشت پناہی کرتا رہوں، تا آنکہ اللہ تعالےٰ اُن پر فتح و نصرت کے دروازے کھول دے اور وہ فیصلہ کر دے جو اس کی مرضی و مشیّت ہے، اگر اللہ تعالےٰ نے ان کو فتح مند کیا تو دشمنوں کو خود اُن کے شہروں میں پسپا کر دوں گا۔"

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ نے کہا: "آپ معاملہ کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، جو بھی فیصلہ کریں مناسب ہوگا، ہمیں جو حکم دیں گے، ہم اس کی اطاعت کریں گے۔"

حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کی رائے معلوم کی، انھوں نے فرمایا: "امیر المؤمنین! میری رائے یہ ہے کہ آپ اہلِ شام کو حکم دیں کہ وہ شام کی طرف سے نکلیں اور اہلِ یمن کو لکھیں وہ یمن کی طرف سے نکلیں پھر آپ اہلِ حرمین کو لے کر کوفہ اور بصرہ پہونچ جائیں، اس طرح سارے مسلمان بہ یک وقت تمام کفار کے مقابلہ میں ہوں گے۔"

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی طرف دیکھا اور اُن کی رائے معلوم کی، حضرت علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ نے ان دونوں کی رایوں سے اختلاف کیا، اور حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا کہ

وہ مدینہ نہ چھوڑیں، اسی جگہ پر رہیں، اور فوج کی قیادت کے لئے کسی کو نائب بنا دیں، اہلِ بصرہ اور مسلمانوں کی فوج عراق آجائے اور تمام والیوں کو اپنے مراکز پر ثابت قدمی کے ساتھ موجود رہنا چاہیئے (اور آپ یہیں قیام کریں) کیونکہ اگر مسلمانوں کے ذمّہ دار (خلیفہ) پر خدانخواستہ کوئی اُفتاد آئی، (یعنی حالتِ جنگ میں قتل ہوگئے) تو اسلام اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا اور پھر اس کا کوئی تدارک نہیں ہوسکے گا، اور اس کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: "یہی مناسب رائے ہے" اور اُسی پر انھوں نے عمل کیا، پھر رائے معلوم کی کہ اس جنگ کا سپہ سالار کس کو بنایا جائے اور اس کو عراق ہی کا باشندہ ہونا چاہیئے، لوگوں نے کہا: اپنی فوج کا حال آپ کو زیادہ معلوم ہے، آپ جانتے ہیں کہ کون کہاں ہے، اور کیا صلاحیت رکھتا ہے، حضرت عمرؓ نے نعمان بن المقرن المزنی کو سرِلشکر متعین کردیا، لوگوں نے کہا وہی اس منصب کے اہل ہیں[۱]۔

"نہج البلاغۃ" (امیرالمؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مکاتب و خطبات کا مجموعہ ہے[۲]) میں تفصیل کے ساتھ اور پُرتاثیر اندازِ بیان میں اس مکالمہ کا ذکر ہے، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود فوج کی قیادت کرنے کا ارادہ کیا اور اس معاملہ میں حضرت علیؓ سے مشورہ لیا تو انھوں نے فرمایا:۔

"یہ اسلام کا معاملہ ہے، اس میں نصرت یا عدمِ نصرت کا دار و مدار افراد کی کمی بیشی پر نہیں ہے، یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے غالب کرنے کا ارادہ فرما لیا ہے، اپنا لشکر خود اسی نے تیار کیا ہے، اور اسی نے اپنی نصرت سے سرفراز کیا ہے، وہ جب قدر بھی پھیلا بڑھا اور چمکا وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا ایک مظہر ہے، وہی اپنے وعدہ کو پورا

---

[۱] تلخیص از کتبِ تاریخ۔ [۲] "نہج البلاغۃ" وہ کتاب ہے جس پر تمام شیعہ اور ان کے سب مکاتبِ فکر متفق ہیں اور سب ہی اس سے دلیل لاتے ہیں۔

کرنے والا اور اپنے لشکر کا محافظ و نگراں ہے، اور قیّم بالامر (ولی الامر و خلیفہ) کی حیثیت اس لڑی کی ہے جس میں دانے گندھے ہوتے ہیں، یہ لڑی سب دانوں کو جوڑے رکھتی ہے اور باہم ایک کو دوسرے سے پیوست رکھتی ہے، اگر وہ لڑی ٹوٹ جائے تو سب دانے بکھر جائیں گے، پھر کبھی بھی اپنی اصل اور ابتداء کے مطابق یکجا نہ ہوسکیں گے،

آج عرب اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن اسلام کی بدولت ایک اہم قوت ہیں، وہ غالب اس لئے ہیں کہ سب متحد اور یکجا ہیں، آپ (ان کے لئے) "قطب"[1] کی حیثیت سے رہیئے اور عربوں کو اُس کے گرد گھمایئے، اور ان کو جنگ کی آگ سے مقابلہ کرنے دیجئے، اس لئے کہ اگر آپ اُن کے درمیان سے ہٹ گئے تو اطراف و اکناف سے سب عرب آپ پر ٹوٹ پڑیں گے، آپ اپنے پیچھے جو غیر محفوظ سرحدیں چھوڑ جائیں گے، وہ ان سے زیادہ اہمیت رکھتی ہوں گی جو آپ کے سامنے درپیش ہیں۔

اہلِ عجم کل آپ کو دیکھ کر کہیں گے، یہ عرب کی اصل طاقت اور سرمایہ ہے، اگر تم نے اُن پر قابو پالیا تو ہمیشہ کے لئے چھٹی مل گئی، اور یہ بات ان کے مقابلہ کے جذبہ اور صلاحیت کو تیز کر دے گی اور ان کے حوصلہ اور طمع کو بڑھائے گی، اور جو آپ نے ذکر کیا کہ یہ اہلِ عجم مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے نکل پڑے ہیں، تو اللہ اُن کے اس اقدام کو آپ سے زیادہ ناپسند کرتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے، اس کو بدل دینے پر زیادہ قادر ہے، اور آپ نے اُن کی تعداد کا جو ذکر کیا ہے تو یاد رکھئے اب تک اللہ تعالیٰ نے جو فتح و ظفر نصیب فرمایا ہے، اس میں تعداد کی کثرت کو کوئی دخل نہیں تھا، ہم تو صرف اللہ کی مدد اور اعتماد پر جنگ کرتے رہے ہیں"[2]

---

[1] چکی کا کھونٹا جس کے گرد چکی کا پاٹ گردش کرتا ہے۔ [2] نہج البلاغۃ (طبع دار الکتاب اللبنانی ط ۱) ص ۲۰۳-۲۰۴

اسی طرح یرموک کی جنگ سے پہلے جب حضرت عمرؓ نے روم پر حملہ کرنے کے سلسلہ میں
مشورہ لیا تو اس موقع پر بھی حضرت علیؓ کی رائے نہ صرف صائب تھی بلکہ ان کے اخلاص کی
دلیل بھی ہے، جیسا کہ معلوم ہے یرموک کی جنگ شام کے معرکوں میں سب سے اہم تھی، اس جنگ میں
کامیابی پر شام کی دوسری فتوحات کا انحصار تھا حضرت ابو عبیدہؓ نے ایک پیام رساں
حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا کہ انھیں مطلع کرے کہ روم کے فوجیوں کا ایک امڈتا ہوا سیلاب ہے جو
خشکی اور تری دونوں راستوں سے مسلمانوں کی طرف بڑھ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے انصار و مہاجرین
کو جمع کیا اور ان کو ابو عبیدہؓ کا خط پڑھ کر سنایا، صحابہ کرام یہ سن کر بڑے متأثر ہوئے اور کچھ لوگوں کے
آنسو نکل آئے، کچھ لوگوں نے جوش میں آکر کہا کہ ہم امیر المؤمنین کو خدا کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ
ہمیں شام جا کر اپنے بھائیوں کے لئے اپنے دل و جان نچھاور کرنے کی اجازت دیں، انصار و مہاجرین
کا جوش بڑھ رہا تھا کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے تجویز پیش کی کہ امیر المؤمنین خود شام کی
طرف بھیجی جانے فوج کی قیادت کریں، اور ان کی ڈھال بن جائیں اور مدد پہونچائیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس رائے کی مخالفت کی اور فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ نے دین کے حاملین کی ذمّہ داری اپنے ذمّہ لے لی ہے، گہوارۂ
دین کو مضبوط کرنا اور اس کی کھلی سرحدوں کو محفوظ کرنا اسی کا کام ہے، جن لوگوں کو
اس نے فتح مند کیا وہ اتنے کم تھے جو عام حالات میں کامیاب نہیں ہوا کرتے، اور
جن کا دشمنوں سے بچاؤ کیا وہ اتنے کم تھے کہ وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے تھے، وہ
ذات واحد ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، اس کے لئے موت نہیں ہے۔

آپ جب اتنی مختصر جماعت کو لے کر جائیں گے اور مقابلہ کریں گے تو ناکامی
کا خطرہ ہے، اور خدانخواستہ ناکامی ہوئی تو مسلمانوں کے لئے دنیا کے کسی کونے میں

جائے پناہ نہیں رہ جائے گی اور آپ کے بعد کوئی ایسا حاکم نہیں رہ جائے گا
جس سے حکم لے سکیں، لہذا آپ کسی تجربہ کار شخص کو سرِ لشکر بنا کر بھیجیے اور اس کے
ساتھ جنگ آزمودہ اور قربانیوں کا جذبہ رکھنے والوں کی جماعت ساتھ کر دیجیے،
اگر اللہ تعالیٰ نے کامیاب کر دیا تو یہی مطلوب ہے اور اگر دوسری بات پیش آگئی
تو آپ لوگوں کے لئے جائے پناہ اور مسلمانوں کے لئے سہارا بنے رہیں گے۔"[1]

اس تقریر سے جو بات کھل کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر حضرت علیؓ (معاذ اللہ) حضرت
عمرؓ کے بارے میں بُری نیت رکھتے یا اُن کے خلاف اُن کے دل میں غبار ہوتا، یا اُن کو خلافت کے بارے
میں غاصب سمجھتے تو اس تدبیر میں رہتے کہ اُن پر کوئی اُفتاد پڑے اور اُن کے وجود سے گلو خلاصی
ہو جائے اور اپنے اوپر کوئی ذمہ داری بھی نہ آئے، یا کسی کو اُن کے اچانک قتل پر اُبھار دیتے،
لیکن حضرت علیؓ اُن سب باتوں سے بلند اور بہت بلند تھے، انھوں نے خیر خواہی کی بات کی جس میں
مسلمانوں کی بھلائی پیشِ نظر تھی، اور جو اُن کی دُور رس نظر، صائب رائے اور اخلاص کی اعلیٰ دلیل ہے،
اللہ تعالیٰ اُن کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے وہ بہترین اجر دے جو اپنے اولیائے مخلصین کے لئے
مخصوص فرمایا ہے، اور جو بات اُن سے صادر ہوئی وہ اس قول کی تصدیق کرتی ہے "الشیٔ من
معدنہ لا یستغرب" (کوئی جوہر اپنے معدنِ اصلی سے نکلے تو اس پر تعجب نہیں کیا جاتا۔)

ٹھیک اس کے برعکس جب عیسائیوں نے حضرت عمرؓ کو یہ دعوت دی کہ وہ بیت المقدس
آکر صلح کی دستاویز اپنے ہاتھ سے لکھیں، تو یہ لوگ (عیسائی) اُن کو مسجد اقصیٰ شریف کی
چابیاں حوالہ کر دیں، اور حضرت ابو عبیدہؓ نے لکھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی آمد پر
موقوف ہے، حضرت عمرؓ نے کبار صحابہ کو جمع کر کے ان کی رائے معلوم کیں، حضرت عثمان بن عفانؓ

[1] "نہج البلاغۃ" صـ ۱۹۲-۱۹۳

نے مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ وہاں نہ جائیں تاکہ وہ اپنی زیادہ ذلت محسوس کریں، اور اُن کی ایک طرح سے تحقیر ہو، لیکن حضرت علی مرتضیٰ نے رائے دی کہ حضرت عمرؓ کو ضرور جانا چاہیئے، (کیونکہ اس میں ایک تاریخی اعزاز ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا، اور یہ بات ہر ایک کو ہر ایک زمانہ میں حاصل نہیں ہوتی) اور اس طرح مسلمانوں پر بوجھ کم ہو گا، حضرت عمرؓ کو حضرت علیؓ کی رائے پسند آئی اور سفر کے لئے تیار ہوئے، اور اپنی جگہ پر حضرت علیؓ کو امورِ خلافت کی ذمہ داری سپرد کر کے رجب ۱۶ھ کو شام کی طرف روانہ ہو گئے۔[1]

سیدنا عمرؓ کا بیت المقدس کی طرف سفر

قارئین کتاب کی خواہش ہو گی کہ وہ یہ معلوم کریں کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن سے روم و فارس دہل رہے تھے، وہ کس شان و شوکت کے ساتھ سفر پر گئے ہوں گے، اور موقع بھی ایسا تھا کہ شاہانہ جاہ و جلال کا مظاہرہ ہو، جو دلوں میں مسلمانوں کے خلیفۂ اعظم کا دبدبہ بڑھا دے اس تاریخی سفر کی تفصیل ملاحظہ ہو:

"حضرت عمرؓ الجابیہ[2] ایک گندمی رنگ کے اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لائے[3] آپ کے سر کا وہ حصہ جس میں بال نہیں تھے، دھوپ سے چمک رہا تھا، آپ کے سر پر ٹوپی نہ تھی نہ عمامہ، بلا رکاب کے دونوں پیر لٹک رہے تھے، زین کے طور پر ایک اونی قسم کی انبجانی چادر تھی، وہی ان کے زین کا کام دیتی، سوار ہوتے اور جب اُترتے تو وہی بستر ہوتی، اُن کی گٹھری یہ

---

[1] تفصیلی واقعہ کے لئے ملاحظہ ہو "الکامل" از ابن اثیر ج ۳ ص ۹۹-۳-۴۰۲ و "تاریخ طبری" ص ۲۴۰۲ والیعقوبی ص ۱۶۷ البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۵۵ [2] ملک شام کا ایک شہر۔

[3] گندمی رنگ یا جس کو عربی میں رمادی رنگ کہتے ہیں، یا لوکا رنگ۔

ایک کھال یا کپڑے کا غلاف تھا جس میں کھجور کے پتے بھرے تھے، جب سوار ہوتے تو یہی گھڑی تھی، اور جب اترتے تو اُسی کو تکیہ کے طور پر استعمال کرتے حضرت عمرؓ کے جسم پر ایک موٹے سوتی کپڑے (کرباس) کا کرتہ تھا جس پر جگہ جگہ سے نشان پڑ گئے تھے، اور جا بجا سے پھٹا ہوا تھا۔[۱]

آپ نے فرمایا "اس قوم (عیسائی) کے سردار کو بلاؤ، جو لوگ خدمت میں حاضر تھے، انھوں نے اس کو بلا بھیجا، اس وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا، میرا کرتا دھو ڈالو، اور جہاں چاک ہو گیا ہے، اس کو سی دو، اور (سرِ دست) اپنا کوئی کرتہ یا عباء عاریۃً دیدو، لوگوں نے فوراً ایک "کتّان" کا بنا ہوا کرتہ پیش کیا، فرمایا: یہ کس طرح کا کپڑا ہے؟ عرض کیا یہ "کتّان" ہے، فرمایا کتّان کیا ہوتا ہے؟ لوگوں نے بتایا، آپ نے اپنا کرتہ اتارا جس کو دھو کر اور مرمّت کر کے لائے تو اُن کا (کتّان کا) کرتہ اتارا اور اپنا پہن لیا، عیسائی سردار نے عرض کیا: آپ عرب کے بادشاہ ہیں، اس ملک میں یہ اونٹ کی سواری معیوب ہے، لہٰذا اگر آپ اس کرتے کے بجائے اچھا لباس (کتان کی عباء) پہن لیتے اور خچر پر سوار ہوتے تو رومیوں کی نظر میں اس کی اہمیت ہوتی، فرمایا: ہم وہ لوگ ہیں جن کو عزّت اسلام سے ملی ہے، ہم اللہ کی رضا چھوڑ کر کوئی دوسری چیز اختیار نہیں کر سکتے، پھر جب خچر لایا گیا آپ نے اس پر اپنی صدری ڈال دی، اس پر کوئی کاٹھی نہیں تھی اور نہ رکاب تھے، آپ اس پر سوار ہوئے تو فرمایا، اس کو روکو، روکو، میں نے لوگوں کو اس سے پہلے نہیں دیکھا کہ شیطان پر سواری کریں، پھر آپ کا اونٹ لایا گیا اور اس پر سوار ہوئے۔"[۲]

اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دوسرے سفر کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جو شام کی طرف سنہ ۱۷ھ میں ہوا تھا، طبری کی روایت ہے کہ:۔

"حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر سفر پر روانہ ہوئے آپ کے ساتھ

---

[۱] ابن جوزی کی "سیرۃ عمر بن الخطاب" سے ماخوذ۔ [۲] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۵۹-۶۰

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت تھی، سواریوں کو تیز گام کیا گیا، ایلہ (بحر احمر کا ساحل) کا راستہ پکڑا، یہاں تک کہ شام قریب آیا تو عام راستہ سے کٹ گئے آپ کا غلام پیچھے چل رہا تھا، سواری سے اتر کر استنجیٰ کیا، پھر واپس آکر غلام کے اونٹ پر سوار ہوگئے، اور آپ کے اونٹ پر روئیں والی کھال کا بستر الٹا ہوا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنی سواری اپنے غلام کو دے دی، جب پہلے سامنے آنے والے لوگوں نے دیکھا تو پوچھا امیر المؤمنین کہاں ہیں؟ فرمایا تمھارے سامنے (یعنی اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا) مگر وہ لوگ سمجھے نہیں، اُن کے آگے چلے گئے، حضرت عمرؓ اُن لوگوں سے نکل کر ایلہ پہنچ گئے، اور اتر گئے پھر استقبال کرنے والوں کو بتایا گیا کہ امیر المؤمنین ایلہ پہنچ کر اپنی سواری سے اُتر چکے ہیں، تو یہ لوگ پھر واپس آئے[1]۔"

خاندانِ نبوی سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا تعلق اور اس سلسلہ میں اُن کا موقف

حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے اقتدار اور دبدبہ کے باوجود اور لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے اور خلافت سے متعلق ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل کا بہت اکرام ملحوظ رکھتے تھے، اور اپنے خاندان کے افراد اور خود اپنے فرزندوں پر اُن کو ترجیح دیتے تھے، اس سلسلہ کے بہت سے واقعات میں سے چند یہ ہیں۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے جو واقعات مروی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں:۔

"مجھ سے ایک روز حضرت عمرؓ نے کہا، بیٹے! تم ہمارے پاس بھی آیا کرتے اور مل لیا کرتے! ان کے کہنے کی بنا پر میں ایک روز وہاں گیا، اس وقت تخلیہ تھا اور آپ تنہائی میں

---

[1] الطبری ج ۴ ص ۲۰۳-۲۰۴

باتیں کر رہے تھے، اور ابن عمرؓ دروازہ پر تھے، اُن کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، یہ دیکھ کر میں واپس آگیا، پھر ایک دن حضرت عمرؓ کا سامنا ہوا تو انھوں نے فرمایا: بیٹے تم میرے پاس آئے نہیں؟ میں نے کہا میں آیا تھا مگر تخلیہ تھا اور آپ تنہائی میں گفتگو فرما رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ابن عمرؓ واپس گئے تو میں بھی لوٹ آیا، حضرت عمرؓ نے کہا: تم عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ اجازت پانے کے مستحق تھے، ہمارے دل و دماغ میں ایمان کی جو تخم ریزی ہوئی وہ اللہ کا احسان ہے، پھر تمھارے گھرانے ہی کا فیض ہے، یہ کہہ کر اپنے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔"[1]

ابن سعدؒ جعفر صادقؒ بن محمد الباقر سے اور وہ اپنے والد ماجد علی بن الحسین (زین العابدینؒ) سے روایت کرتے ہیں، فرمایا:۔

"حضرت عمرؓ کے پاس یمن کے حُلّے[2] آئے، آپ نے لوگوں میں تقسیم کر دیئے وہ سب یہ نئے کپڑے پہن کر مسجد نبویؐ میں آئے، حضرت عمرؓ منبر اور قبر شریف کے درمیان بیٹھے تھے، لوگ آتے سلام کرتے، اُن کو دعائیں دیتے، اتنے میں حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما اپنی والدہ حضرت سیدہ فاطمہؓ کے مکان سے نکلے، لوگوں کے درمیان سے گزر رہے تھے، اور اُن صاحبزادوں کے جسم پر وہ حُلّے نہیں تھے حضرت عمرؓ افسردہ اور اُداس بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا میں ان بچوں کی وجہ سے مغموم ہوں کہ ان کے بدن کے مطابق کوئی حُلّہ نہ تھا، چادریں بڑی تھیں اور اُن کے قد چھوٹے ہیں، اس کے بعد یمن پیغام بھیجا کہ دو جوڑے حسنؓ اور حسینؓ کے لئے

---

[1] کنز العمال ج ۷ ص ۱۰۵، الاصابہ ج ۱ ص ۱۳۳ [2] اگر ایک ہی کپڑے کا تہبند اور قمیص ہو اور کپڑا قیمتی ہو تو حُلّہ کہتے ہیں، یہ قدیم عربوں میں وہی درجہ رکھتا تھا جو اس زمانے میں سوٹ کا ہے

بہ عجلت بھیجے جائیں، چنانچہ وہ بھیجے گئے، آپ نے اُن دونوں کو پہنایا تب اطمینان ہوا[1]۔"

"ابوجعفر سے روایت ہے کہ جب اللہ نے فتوحات کے دروازے کھول دیئے تو حضرت عمرؓ نے ہر ایک کے لئے ایک حصہ ماہانہ یا روزینہ کی شکل میں مقرر کرنے کا ارادہ کیا، لیکن کس کو کتنا دیا جائے، ترتیب کیا ہو، اس کے لئے اکابر صحابہ کو جمع کیا، اور اُن کی رائیں معلوم کیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ اپنی ذات سے شروع کیجیے، حضرت عمرؓ نے کہا، لا واللہ، اس سے شروع کروں گا، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ قریب ہوگا، اُن کے بعد بنو ہاشم کے حصے مقرر کروں گا، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت عباسؓ کا پھر حضرت علیؓ کا حصہ نکالا، یہاں تک کہ پانچ قبائل کے درمیان ترتیب قائم کی، اور اخیر میں بنی عدی بن کعب تک پہونچے، ترتیب یوں لکھی گئی کہ بنوہاشم میں جو لوگ بدر میں شریک تھے، اُن کے لئے عطیات مقرر کئے، پانچ قبائل کے بعد بنی عدی (حضرت عمرؓ کے قبیلہ) کا نمبر آیا پھر بنی اُمیّہ بن عبد شمس میں جو لوگ بدر میں شریک تھے اُن کے نام لکھے الأقرب فالأقرب (جو زیادہ قریب تھا وہ پہلے پھر اُس سے جو قریب تھا) ان سب کے حصے دیئے اور حضرات حسنین (حسن وحسین رضی اللہ عنہما) کو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قُرب تھا اس کا پہلے لحاظ کیا[2]۔"

علاّمہ شبلی نعمانیؒ اپنی کتاب "الفاروق" میں متعلقین جناب رسول اللہؐ کے پاس لحاظ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ بڑی بڑی مُہمّات میں حضرت علیؓ کے مشورہ کے بغیر کام نہیں کرتے

---

[1] الاصابۃ ج ۱ صفحہ ۱۰۶ [2] "کتاب الخراج" از ابو یوسف، صفحہ ۲۴-۲۵ (المطبعۃ المیریۃ۔ مصر سنۃ ۱۳۰۲ھ ط)

تھے، اور حضرت علیؓ بھی نہایت دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتے تھے، اور جب بیت المقدس گئے تو کاروبار خلافت ان ہی کے ہاتھ دے کر گئے، اتحاد و یگانگت کا اخیر مرتبہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت ام کلثومؓ کو جو فاطمہ زہراؓ کے بطن سے تھیں اُن کے عقد میں دے دیا[1]۔"

حضرت علیؓ نے اپنے ایک فرزند کا نام عمر رکھا، اور دوسرے کا نام ابوبکر اور تیسرے کا نام عثمانؓ رکھا، عام طور سے لوگ اپنے فرزندوں کے نام انھیں لوگوں کے نام پر رکھتے ہیں جن سے دلی تعلق ہوتا ہے اور جن کو مثالی انسان سمجھتے ہیں[2]۔"

اسلامی ہجری تقویم (جنتری) کی ابتداء اور اس کارنامہ کا مُفکّر

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زندۂ جاوید کارناموں میں ایک ایسا کام ہے جو اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اسلام اور اُمّتِ اسلامیہ دنیا میں باقی ہے، وہ اسلامی تقویم کی بنیاد مقرر کرنا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں لوگ کسی حادثہ یا واقعہ کی تاریخ مختلف طریقوں سے قلمبند کرتے تھے، اور اُن کے درمیان اختلاف تھا کہ تاریخ کس بنیاد پر مقرر کی جائے، بعض لوگوں کا رُجحان تھا کہ جس طرح اہلِ فارس اپنے بادشاہوں اور حکمرانوں کی پیدائش یا تخت نشینی سے زمانہ کا تعیّن کرتے تھے، اس کو اختیار کیا جائے، اور کچھ لوگ رومیوں کا طریقہ اپنانا چاہتے تھے، بعض صحابہ کی رائے تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ

---

[1] حضرت عمرؓ سے حضرت ام کلثوم کے نکاح کے دلائل اور اس کے تاریخی شواہد، علمی تاریخی اور کلامی بحثیں نواب محسن الملکؒ کی کتاب "آیات بیّنات" (ج ۱ ص ۱۲۷-۱۶۴ طبع مرزاپور ۱۸۷۰ء) میں تفصیل سے درج ہیں۔

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۳۱-۳۳۲

علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی تاریخ کو اسلامی جنتری کی ابتداء قرار دیا جائے، سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت مکّہ سے مدینہ منورہ جس دن ہوئی اس کو اسلامی تقویم کی اساس قرار دیا جائے[۱] حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کو یہ رائے پسند آئی اور حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا کہ تاریخ کا تعیّن ہجرتِ نبوی کی بنیاد پر کیا جائے۔

عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے، اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ پیغام پر رکھا ہے[۲] اسی طرح تقویم کو بھی کسی شخصیت یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت سے مربوط نہیں کیا، جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیت ہے، اللہ اور مسلمانوں کے نزدیک محبوب ترین نام ہے، اسلامی فتوحات سے بھی مربوط نہیں کیا، ہجرت سے اس تقویم کا آغاز ایک خاص فکر اور بڑی حکمت پر مبنی ہے، کیونکہ اس تقویم پر ایک پیغام اور ایک دعوت کی ہمیشہ کے لئے چھاپ پڑ گئی، اس طرح جو بھی اس تقویم کی ابتداء کو جاننا چاہے گا اس کو معلوم ہوگا کہ بنیادی نقطۂ آغاز اور قابلِ ذکر عظمت، اور یادگار کے لائق چیز صرف عقیدہ اور ایمان ہے، اور عقیدہ کو تمام پسندیدہ اور قابلِ فخر و مباہات امور پر ترجیح دینا اس کا شعار ہے، اس کے اندر ایک فال نیک اور خوش خبری کا پہلو بھی ہے کہ یہ نسل انسانی کی تاریخ میں ایک عہد جدید کی ابتداء اور قافلۂ انسانیت کا نقطۂ آغاز ہے، عقیدہ پر کاربند رہنے اور اصول کو ہمیشہ سامنے رکھنے اور اس کی خاطر ہر قسم کے خطرات مول لینے کا سبق بھی اس سے

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۷۴ [۲] یہ حصہ مؤلف کی تقریر "پندرہویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں" سے ترجمہ میں بلفظہ نقل کیا گیا ہے۔

ملتا ہے، اور یہ کہ اصول وعقیدہ کو ہمیشہ عرفی وطبعی امور پر ترجیح حاصل رہے گی۔[1]

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصول تھا کہ وہ کسی بالغ ذمی (جزیہ ادا کرنے والے غیر مسلم) کو مدینہ منورہ میں آنے کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے، مگر حضرت مغیرہ بن شعبہ جو کوفہ کے گورنر تھے، انھوں نے حضرت عمرؓ سے اپنے ایک کاریگر غلام کو (جس کا نام ابولولوءۃ تھا) مدینہ منورہ میں آنے اور رہنے کی اجازت طلب کی جو دستکاری میں ماہر تھا[2]، اس کو ابولؤلؤۃ کہہ کر پکارا جاتا تھا، اصل نام فیروز تھا، دراصل ایرانی الاصل اور مجوسی المذہب تھا، کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ عیسائی تھا، اور نہاوند سے اس کو رومیوں نے گرفتار کر کے غلام بنایا تھا، اور روم کے ہاتھوں سے مسلمانوں کے پاس پہونچا تھا، جب نہاوند کے اسیر اور آزاد شدہ غلام ۲۱ھ میں مدینہ منورہ پہونچے تو ابولؤلؤۃ کا یہ حال تھا کہ رویا کرتا اور کسی بچہ کو بھی دیکھ لیتا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا کہ عمرؓ نے میرا جگر کھالیا، حضرت مغیرہ کو ابولؤلؤۃ سے بڑا فائدہ تھا، وہ لوہاری نجّاری اور نقّاشی کے کام جانتا تھا، اُس سے چار درہم روزانہ لیتے تھے، وہ چکّی بنایا کرتا تھا، ایک روز وہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مغیرہؓ مجھ سے بہت مشقت کا کام لیتے ہیں، لہٰذا ان سے کہہ دیجئے کہ کچھ کم رقم لیں، حضرت عمرؓ نے اُس سے پوچھا کہ تم کیا کام بخوبی انجام دیتے ہو؟ اس نے بتایا کہ یہ اور یہ کام جانتا ہوں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہارے کام کو دیکھتے ہوئے یہ رقم زیادہ نہیں ہے، اللہ سے ڈرو، جاؤ اپنے مالک کے ساتھ خوش اسلوبی سے خدمت انجام دو،

---

[1] تفصیل کے لئے مذکورہ رسالہ "پندرہویں صدی ہجری ــــ ماضی وحال کے آئینہ میں" (مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" لکھنؤ، ۱۴۰۱ھ) ملاحظہ ہو۔

[2] عربی لفظ "غلام صَنَع" سے یعنی دستکاری اور اس میں ماہر لڑکا۔

حضرت عمرؓ کے دل میں تھا کہ جب مغیرہ سے ملاقات ہوگی تو اُن سے کہہ دیں گے کہ اس کو کچھ مراعات دو، مگر ابولولؤۃ نے حضرت عمرؓ کا جواب سنا اور غم و غصّہ سے بھر گیا، اُس نے ایک خنجر تیار کیا جس کے دونوں طرف دھار تھی، اور اس کو زہر میں بجھایا، پھر ایران کے قدیم سردار ہرمزان کے پاس گیا اور کہا آپ کا کیا خیال ہے، یہ خنجر کیسا رہے گا؟ اس نے کہا اس کی کاٹ سے کوئی زندہ نہیں بچ سکتا، اس طرح یہ ایک مجوسی ایرانی سازش تھی جس میں ذاتی انتقام اور قومی غیظ و غضب دونوں کار فرما تھے۔

جس صبح کو حضرت عمرؓ شہید ہوئے اسی روز حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے بتایا کہ ہم نے ہرمزان، ابولؤلؤۃ اور حفینہ کو سرگوشی کرتے دیکھا تھا، وہ بات کرتے ہوئے جوش میں آئے تو وہ خنجر ہاتھ سے گر گیا تھا جس سے حضرت عمرؓ کی شہادت واقع ہوئی، اس لئے بہت سے مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت ہوئی جس میں یہود اور اہلِ ایران دونوں شریک تھے، اور درحقیقت یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، انتقام کے جذبہ سے مغلوب قومیں جن کے ملک کو فتح کیا گیا ہے، اور ایسے اہلِ ملک جن کو آزادی اور سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا ہے، وہ جذبات انتقام سے مغلوب ہو کر فاتح قوم کے سربراہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کا پورا واقعہ یہ ہے کہ وہ نماز فجر کی امامت کے لئے کھڑے ہوئے، تکبیر تحریمہ کی آواز لوگوں نے سنی، اس کے بعد یہ آواز سنائی دی، کتّے نے مجھے مار دیا، ابولؤلؤۃ نے خنجر سے جو وار کیا وہ آپ کے شانہ پر اور کمر پر پڑا، کہا جاتا ہے کہ اس نے چھ وار کئے، یہ عجمی کا فرزادہ (علج) اپنا دو دھاری خنجر لے کر بھاگا، اور جو بھی ملتا گیا اس پر وار کرتا گیا جس سے تیرہ ۱۳ افراد گھائل ہوئے، جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس کو دیکھا تو اس پر برنُس (ایک لمبے قسم کی پوشاک جس میں ٹوپی سلی ہوتی ہے) ڈال دی جس سے وہ اُلجھ گیا اور سمجھا کہ اب پکڑ لیا گیا، تو اس نے اپنا گلا کاٹ لیا، ادھر حضرت عمرؓ گر پڑے اور کہہ رہے تھے،

کان أمر الله قدراً مقدوراً"[1]

حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ کس نے اُن پر حملہ کیا ہے؟ کہا گیا کہ مغیرہ بن شعبہ کے غلام نے، فرمایا الحمد للہ کہ میرا قاتل کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے کبھی ایک سجدہ بھی کیا ہو اور قیامت میں مجھ سے اس سجدہ کا حوالہ دے کر بحث کرے یہ عربوں کا کام نہیں۔[2]

حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند عبداللہ بن عمرؓ کو بلا کر کہا اُم المؤمنین عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ عمرؓ آپ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے اور میرا حوالہ امیر المؤمنین کہہ کر نہ دینا کیونکہ اب میں مسلمانوں کا امیر نہیں ہوں، حضرت عبداللہؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس آئے، وہ رو رہی تھیں حضرت عمرؓ کا سلام کہا اور پیغام پہونچایا حضرت عائشہؓ نے کہا اس جگہ کو میں اپنے لئے محفوظ رکھنا چاہتی تھی لیکن آج میں عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی، عبداللہؓ واپس آئے، لوگوں نے حضرت عمرؓ کو خبر کی، حضرت عمرؓ ان کی جانب متوجہ ہوئے اور دریافت کیا، کیا خبر لائے ہو؟ انھوں نے کہا امیر المؤمنین آپ جو چاہتے تھے، وہی ہوا، انھوں نے اجازت دیدی ہے، فرمایا، الحمد للہ، میرے لئے اس خواب گاہ سے بڑھ کر کوئی بات قابلِ اہمیت نہ تھی، اور دیکھو جب میری روح قبض ہو جائے، میری نعش میری چارپائی پر لے جانا اور دروازہ پر ٹھہر جانا اور پھر اجازت مانگنا اگر وہ واپس کر دیں تو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری حاکمانہ حیثیت کے پیشِ نظر اجازت دیدی ہو، بہرحال جب نعش لے جائی گئی تو سب مسلمان اس درجہ متأثر اور غم زدہ تھے کہ جیسے اس سے پہلے کوئی مصیبت نہ پڑی ہو، حضرت عائشہؓ نے دوبارہ اجازت دی اور حضرت عمرؓ اپنی آخری آرامگاہ پر پہونچ گئے، اللہ تعالےٰ نے اُن کو اعزاز بخشا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دائمی آرام گاہ پائی "رضی اللہ عنہ وأرضاہ"۔[3]

---

[1] ابن سعد ج ۱ ص ۲۵۲-۲۵۳ اور تاریخ کی دوسری کتابیں [2] اسد الغابۃ ج ۴ ص ۷۴، [3] ابن سعد ج ۱ ص ۲۴۴

فاضل صاحبِ قلم جسٹس سید امیر علی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"حضرت عمرؓ کی وفات ایک سخت ترین نقصان اور اسلام کے لئے بہت بڑا حادثہ تھا"[1]

حضرت عمر فاروقؓ پر حملہ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو ہوا تین[3] دن کے بعد انتقال کیا، اور محرم ۲۴ھ کی پہلی تاریخ ہفتہ کے روز مدفون ہوئے، وفات کے وقت آپ کی عمر ترسٹھ[63] سال تھی۔

حضرت علی مرتضیٰ کو اُن کی شہادت کا غم اور اعتراف

ابو جُحیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ "جب حضرت عمرؓ کی وفات ہو چکی ان کا جسدِ مبارک ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا، میں ان کے پاس تھا، حضرت علیؓ آئے اور حضرت عمرؓ کے چہرہ کو کھولا، پھر کہا "ابو حفص! آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، اللہ کی قسم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے، جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ میں اللہ کے سامنے جانا پسند کروں"[2]"

"حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ کی وفات پر رو رہے تھے، اُن سے پوچھا گیا کہ کیوں رو رہے ہیں تو فرمایا: عمر کی موت پر رو رہا ہوں، عمر کی موت اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے جو قیامت تک پُر نہیں کیا جا سکے گا"[3]

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE SARACENS, PP. 43-44

المعلم بطرس البستانی (عیسائی) نے لکھا ہے: "حضرت عمرؓ کی شہادت کا سبب وہ نہیں ہے جو مؤرخین نے عام طور پر سمجھا اور لکھا ہے، بلکہ غیر مسلموں نے اس غلام کو اُبھارا تھا کہ اُن کو قتل کر دے تاکہ اُن کی موت سے اسلام کی قوت کمزور ہو جائے، اور اُن کی سلطنت ختم ہو جائے"۔
(دائرۃ المعارف ج ۲ ص ۲۳ (حالات زندگی ابو لؤلؤۃ)

[2] مسند الامام احمد بن حنبل، مسند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ [3] الفتوحات الاسلامیۃ ج ۲ ص ۴۲۹ از سید احمد زینی دحلان (المطبعۃ المیریۃ مکۃ المکرمۃ ط ۲ ۱۳۱۱ھ)

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا وصف اور تعاون و اختلاف کی نوعیت

اس فصل کو ختم کرنے سے پہلے بہت مناسب ہو گا کہ اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ کے چند فقرے یہاں نقل کر دوں، جس میں حضرات صحابہ کرام کے اعلیٰ ترین کردار، بے مثل اتحادِ فکر و عمل کی تصویر سامنے آجاتی ہے، یہ تحریر ایک طرف عربی بلاغت کا ایک نمونہ ہے، دوسری طرف امانت و صداقت کے ساتھ تیار کیا ہوا نقشِ جمیل ہے:-

"آپس میں تعاون کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ تصوّر قائم کیا جا سکتا ہے، ان حضرات کا باہمی تعاون اس کا نمونہ تھا، ایک دوسرے کی خیر خواہی، باہمی احترام کی بلند ترین مثال ان کے تعامل میں نظر آتی ہے، اصول و ضوابط کی تطبیق میں باریک سے باریک باتوں میں ایک دوسرے سے اپنا اختلاف ظاہر کر دیتے تھے، اور جب کوئی بات ان کو حق کے خلاف معلوم ہوتی تو اس کا بر ملا اظہار کرنے میں نہ دوستی حائل ہوتی، نہ خاطر داری راستہ روکتی، نہ کسی کی سربراہی یا بڑائی کا دبدبہ مانع ہوتا، صاف کھلے دل کے لوگ تھے، ایسے کھرے جو صرف ایک عربی کی خصوصیت ہو سکتی ہے، جس میں نہ نفاق کا گزر تھا، اور نہ کسی چالاکی اور چالبازی کا، انتہائی مہذّب و مؤدّب لوگ، جن کے اخلاق و معاملات میں کوئی کھُردرا پن یا سخت گیری کبھی نہیں تھی، آپس میں ایک دوسرے سے حقیقی بھائیوں کا جیسا معاملہ کرتے، کسی قسم کے تکبّر یا غرور کا اُن کے یہاں گزر نہیں تھا، جب امیر کی اطاعت کرتے تو ایک سپاہی کی طرح ہوتے، سرکشی یا نافرمانی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، تبع سلطنت

نئے قوانین واصول اور نئی قوم کے کامیاب ترین معمار تھے، اُن کی نظر گہری اور علم وسیع تھا، محنت ومشقت اُن کی خو تھی، وسائل کے اختیار کرنے میں چھان بین اُن کی عادت تھی"۔[۱]

۱؎ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی۔ از ڈاکٹر مصطفیٰ باعی صـ ۱۴۷
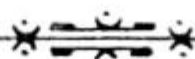
باب پنجم

سیّدنا علی ابن ابی طالبؓ سیّدنا عثمان بن عفانؓ کے دورِ خلافت میں

سیدنا عثمانؓ کا دینی لحاظ سے اسلامی معاشرہ اور ماحول میں مقام، ان کے دور کی فتوحات و وسعتِ سلطنت، ان کے زندہ جاوید کارنامے، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے کی مشکلات اور ان کے اسباب، سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ کا حضرت عثمانؓ کی طرف سے شریفانہ و بہادرانہ دفاع اور ان کی شہادت کی ذمّہ داری سے کلیتہً برات، حضرت عثمانؓ کا عزم و یقین اور اسلامی سیرت کا امتیاز

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ تفصیل سے گزر چکا، ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے خلیفہ منتخب کرنے کی ذمہ داری ایک مجلس کے سپرد کی جو چھ افراد پر مشتمل تھی، وہ چھ افراد یہ تھے۔

عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن العوام، سعد بن ابی وقاص اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم،[1] ان چھ میں سے کسی ایک کا تعین کرنا اُن کے لئے سخت اُلجھن کا باعث تھا، انھوں نے کہا میں یہ ذمہ داری زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی اٹھاؤں یہ ممکن نہیں ہے، اگر اللہ تعالےٰ کو آپ لوگوں کے ساتھ بھلائی منظور ہوگی تو کسی ایک پر آپ کو متفق کر دے گا، جو آپ میں سب سے بہتر ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے نبی (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد بہتر شخص کی خلافت پر آپ سب کو متحد کر دیا، حضرت عمرؓ کے خوفِ خدا اور کمالِ تقویٰ کی بات تھی کہ اس شوریٰ میں سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کا نام نہیں رکھا کیونکہ وہ حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی تھے، انھیں ڈر تھا کہ ممکن ہے کہ لوگ اُن کے چچازاد بھائی ہونے کی وجہ سے ان ہی کو منتخب کر لیں، اس لئے ان کو چھوڑ دیا، حالانکہ وہ بھی "عشرہ مبشرۃ بالجنۃ" میں سے تھے، اہلِ شوریٰ سے کہا: "آپ کی مجلس میں عبد اللہ (حضرت عمرؓ کے فرزند) بھی شریک ہوں گے لیکن اُن کو کوئی اختیار نہ ہوگا" (یعنی ایک مشاہد کی حیثیت سے جس کو موجودہ اصطلاح میں OBSERVER کہا جاتا ہے) اور وصیت فرمائی کہ "جب تک خلیفہ کا

---

[1] یہ چھ افراد ان دس میں سے تھے جن کو مغفرت خداوندی اور جنت کی بشارت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات میں دیدی تھی، جن کو "العشرۃ المبشرۃ بالجنۃ" کہا جاتا ہے۔

انتخاب نہ ہو جائے تینؓ دنوں تک صہیب بن سنان الرومی نمازوں میں مسلمانوں کی امامت کریں گے" اور یہ کہ "اہلِ شوریٰ جمع ہوں اور کچھ لوگ اس کا اہتمام و فکر رکھیں کہ اہلِ شوریٰ جلد کسی نتیجہ پر پہونچ جائیں" اور فرمایا "میں نہیں سمجھتا کہ لوگ عثمانؓ اور علیؓ کے مقابلہ میں کسی اور کو ترجیح دیں گے"۔

حضرت عمرؓ کی تدفین سے فارغ ہونے کے بعد مقداد بن الأسود نے اپنے مکان پر سب کو جمع کیا، باتیں شروع ہوئیں، اور بلند آوازوں میں کچھ لوگ اپنے دلائل پیش کرنے لگے آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ تینؓ اشخاص جو خلافت کے طالب نہیں ہیں، وہ بقیہ تینؓ میں کسی کو اپنا حق دے کر خود دستبردار ہو جانے کا اعلان کر دیں۔

چنانچہ حضرت زبیرؓ نے اپنا حقِ خلافت حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا اور حضرت سعد نے اپنا حق حضرت عبد الرحمنؓ بن عوف کے سپرد کیا، اور حضرت طلحہؓ نے اپنا حق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیدیا، حضرت عبد الرحمنؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے کہا آپ دونوں میں سے کون اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہے کہ میں اس کے سپرد یہ کام کردوں کہ وہ دوؓ میں سے کسی ایک کو منتخب کر دے اور اس کو خدا کا اور اسلام کا واسطہ ہے کہ بقیہ دوؓ میں سے جو افضل ترین ہو اس کے ذمہ خلافت سپرد کرے، اس پر شیخین علی مرتضیٰؓ اور عثمان غنیؓ خاموش رہے، لہذا عبد الرحمنؓ نے کہا کہ میں اپنا حق چھوڑتا ہوں اور مجھے اللہ کی اور اسلام کی قسم ہے کہ میں مخلصانہ اجتہاد اور امکانی صوابدید سے کام لوں گا اور اپنی عقل و دانست میں آپ دونوں میں جس کو افضل سمجھوں گا اس کے سپرد یہ خدمت کر دوں گا، دونوں نے کہا بہتر ہے، پھر دونوں سے علیحدہ علیحدہ بات کی اور ان کے مرتبہ اور فضائل کا اعتراف کیا، اور یہ قول و قرار لیا کہ اگر ان کو ولی الامر بنایا گیا تو وہ عدل سے کام لیں گے، اور اگر

دوسرے کو بنایا گیا تو اس کی اطاعت کریں گے، دونوں نے رضامندی کا اظہار کیا۔

پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ اٹھے، ان دونوں کے بارے میں لوگوں کی رائیں معلوم کیں، لوگوں سے علیحدہ علیحدہ بھی مشورے لئے اور علانیہ مجمعوں میں بھی رائے معلوم کی، رازداری کے طور پر بھی کچھ لوگوں کے رجحانات کا پتہ چلایا اور برملا بھی، یہاں تک کہ خواتین سے پردوں کے پیچھے سے بات کی، یہی نہیں، بلکہ دوسرے شہروں سے آنے والے بدوؤں اور قافلہ والوں سے بھی ان کے خیالات معلوم کئے، یہاں تک کہ مکتب کے بچوں تک سے ان کی خواہشات اور رجحانات کا پتہ چلایا، تین دن اور رات اُن کا یہی مشغلہ اور وظیفہ رہا، انھوں نے کسی دو کو بھی حضرت عثمانؓ کی افضلیت کا منکر نہیں پایا، وہ ان دنوں اور راتوں میں بہت کم سوئے نماز و استخارہ میں اور اہلِ رائے کی رائیں معلوم کرنے میں مشغول رہے۔

چوتھے روز (یعنی حضرت عمرؓ کی وفات کے چوتھے دن) اہلِ شوریٰ اسی جگہ جمع ہوئے جہاں پہلے روز ان کا اجتماع ہوا تھا، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کو بلایا، جب یہ دونوں حضرات آگئے تو فرمایا: میں نے لوگوں کی آراء معلوم کیں، کسی کو بھی ایسا نہیں پایا جو آپ دونوں پر کسی کو فوقیت دیتا ہو، یا آپ کے برابر کسی کو سمجھتا ہو، پھر اُن دونوں سے عہد لیا کہ اگر اُن کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو وہ عدل کریں گے، اور اگر اُن کے اوپر دوسرے کو ولی قرار دیا گیا تو سمع وطاعت کا معاملہ کریں گے، اس عہد اور قول و قرار کے بعد پھر دونوں کو ساتھ لئے مسجد چلے گئے، جمعہ کی اذان ہوئی، اس روز حضرت عبدالرحمٰن نے وہ عمامہ باندھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو عطا فرمایا تھا، تلوار حمائل کی، مہاجرین و انصار میں سے اہم شخصیات کو خصوصی طور پر آدمی بھیج کر بلایا، جمعہ کی اذان ہوئی، مسجد کھچا کھچ بھر گئی اور لوگ ایک دوسرے سے پیوست ہو کر بیٹھے، یہاں تک کہ

حضرت عثمانؓ کے لئے بیٹھنے کی جگہ بھی نہ رہی تو وہ آخری صف میں جاکر بیٹھ گئے کیونکہ ان کے اندر حیا کا مادّہ زیادہ تھا، پھر عبدالرحمٰن بن عوف منبر پر چڑھے، اور دیر تک کھڑے رہے، اور ایک طویل دعا کی جو بہت سے لوگوں نے ازدحام کی وجہ سے نہیں سنی، پھر حاضرین سے مخاطب ہوکر بولے :۔

حضرات! میں نے آپ سے تنہائیوں میں آپ کی آراء معلوم کیں، اور علانیہ طور پر بھی، میں نے آپ میں سے کسی کو ایسا نہیں پایا جو اُن دونوں کے برابر کسی اور کو خلافت کا اہل سمجھتا ہو، علی ہوں یا عثمان، لہٰذا علی آپ کھڑے ہو جائیے اور میرے قریب آجائیے، حضرت علی ان کے قریب جاکر کھڑے ہو گئے، عبدالرحمٰنؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کیا آپ میرے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقہ پر خلافت کا کام کروں گا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا، اس کا وعدہ نہیں کرتا، لیکن اپنے امکان بھر خلافت کا حق ادا کرنے کی سعی و جہد کروں گا، عبدالرحمٰنؓ نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا، پھر کہا عثمانؓ میرے پاس اٹھ کر آئیے، وہ آئے تو اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا کیا آپ میرے ہاتھ پر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کے مطابق اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقہ پر چلنے کا عہد کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا، ہاں[1]،

---

[1] حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طرزِ خلافت سے سب لوگ مانوس تھے اور اس طریقہ کو پسند کرتے تھے، اور ان کو اطمینان تھا کہ اُن کا طرزِ عمل وہ بہترین طرز تھا، جو خلافتِ نبوت کے لئے موزوں ہے، اور اس راستہ میں تمام خطرات سے امان ہے اور اس میں انحراف اور کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں اس لئے جب حضرت عثمانؓ سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے بعد طریقۂ شیخین کا نام لیا گیا تو وہ راضی ہو گئے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی مطمئن ہو گئے، دوسری طرف حضرت علیؓ کو جو خود کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے بلند پایہ عالم اور اجتہاد کے اہل تھے کو پورا حق تھا کہ اس شرط کو (باقی ص ۱۹۴ پر)

پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا (وہ اس وقت حضرت عثمانؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے) اور کہا اے اللہ! تو سُن لے اور گواہ رہنا، اے اللہ تو سُن لے اور گواہ رہنا کہ میری گردن میں جو قلادۂ (خلافت) تھا وہ میں اتار کر عثمانؓ کی گردن میں ڈالتا ہوں، اس کے بعد لوگوں کی بھیڑ ہو گئی اور سبھوں نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی، عبدالرحمٰنؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشست پر بیٹھے رہے، اور عثمانؓ کو منبر کی دوسری سیڑھی پر بٹھایا، لوگ آ آ کر بیعت کرتے رہے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی (سب سے پہلے یا سب سے آخر میں اس میں اختلاف ہے)[1]

حضرت عثمانؓ کی دینی و عُرفی حیثیت اور مقام

خلافت کے لئے حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کا انتخاب اُن کی عمر اور اُن کے فضائل کو دیکھتے ہوئے اور اُن کو اس وقت کے اسلامی معاشرہ میں جو عُرفی و اجتماعی حیثیت و مقام حاصل تھا، بالکل حق بجانب اور برمحل تھا۔

وہ عام الفیل کے چھٹے سال پیدا ہوئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پانچ سال عمر میں چھوٹے تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دارالارقم میں جانے سے پہلے

(باقی ص۱۹۱ کا) قبول نہ کریں، لیکن یہ بات لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہ تھی، وہ شیخین کے طریقۂ عمل کے خوگر اور شیدائی تھے اسی لئے انھوں نے حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ پر ترجیح دی کیوں کہ انھوں نے کتاب و سنّت کے ساتھ اُسوۂ شیخین کی پیروی کی شرط قبول کر لی۔

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ از ابن کثیر ج ۷ ص۱۴۴-۱۴۷ ہم نے مذکورۂ بالا روایت کو اس لئے ترجیح دی کہ یہ تمام روایتوں کی جامع ہے، اور ان روایتوں کی بنیاد صحاح اور قابل اعتماد روایت پر ہے۔

ایمان لے آئے تھے، انھوں نے رُقیہؓ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہجرت سے پہلے شادی کی تھی، جب قریش کی ایذا رسانی بڑھ گئی تو انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر ہجرت کی اجازت طلب کی، آپؐ نے اجازت دیدی، وہ اُن کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، آپ نے اُن دونوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "آلِ ابراہیم اور آلِ لوط کے بعد اللہ کی راہ میں پہلے ہجرت کرنے والے یہی میاں بیوی ہیں" اس کے بعد وہ حبشہ سے واپس آگئے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ ومہاجرین کی ہجرتِ مدینہ کے بعد حضرت عثمانؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوگیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی اُمّ کلثومؓ سے اُن کا نکاح کردیا، یہ خصوصیت حضرت عثمانؓ ہی کو حاصل تھی، اور اسی لئے اُن کا لقب "ذُوالنّورین" تھا۔

قریش اُن کا بڑا احترام کرتے تھے حضرت عمرؓ نے کہا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے صُلحِ حُدیبیہ کے موقع پر اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا کہ کیا میں ایک ایسے شخص کی نشاندہی کروں جو قریش کی نگاہ میں مجھ سے زیادہ وقیع اور قابلِ لحاظ ہے؟ وہ عثمانؓ بن عفان ہیں، چنانچہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو ابوسفیان اور سردارانِ قریش سے گفتگو کے لئے اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔

حضرت عثمانؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حسبِ ہدایت ابوسفیان اور سردارانِ قریش سے ملے اور وہ پیغام پہونچا دیا جس کے لئے مامور تھے، جب وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام سن چکے تو حضرت عثمانؓ سے کہا: اگر آپ چاہیں تو بیت اللہ کا طواف کرلیں، انھوں نے جواب دیا جب تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ کا طواف نہ کرلیں، میں نہیں کروں گا،[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ ج ۲ ص ۳۱۵

جب حضرت عثمانؓ اس پیام رسانی کی مہم سے واپس آئے تو مسلمانوں نے کہا، آپ نے تو بیت اللہ کے طواف کا لطف بھی اٹھالیا ہوگا اور سعادت حاصل کرلی ہوگی؟ فرمایا، آپ لوگوں نے میرے بارہ میں یہ خیال کیسے کیا؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں وہاں سال بھر بھی رہتا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ میں رہتے تو بھی میں اس وقت تک طواف نہ کرتا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ کا طواف نہ کرلیتے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر پہونچی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے، آپؐ نے بیعت کے لئے مسلمانوں کو طلب فرمایا، مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پروانہ وار حاضر ہوگئے، آپ اس وقت ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے، لوگوں نے اس بات پر بیعت کی کہ وہ فرار نہیں اختیار کریں گے، آپؐ نے اپنا ہاتھ خود ہی پکڑا اور فرمایا، یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے، اس طرح "بیعت الرضوان" مکمل ہوگئی۔[2]

حضرت عثمانؓ کا حضرت عمرؓ کے یہاں بڑا درجہ تھا، لوگ جب کوئی بات حضرت عمرؓ سے پوچھنا چاہتے تھے، تو وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی مدد لیتے تھے، حضرت عثمانؓ کو "ردیف" کہا جاتا تھا، (عربی میں ردیف اس کو کہتے ہیں، جو گھوڑے یا اونٹ کی کاٹھی پر کسی کے پیچھے بیٹھے، کسی بڑے صاحبِ مرتبت یا صدر کے بعد جس کا نمبر ہو کہ اس کے بعد وہی جگہ لینا اس کو بھی ردیف کہتے ہیں) جب ان دونوں سے بھی کام نہ چلتا تو لوگ حضرت عباسؓ کی طرف رجوع کرتے۔[3] حضرت عثمانؓ ہی وہ شخص تھے جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر لشکر کے لئے سامان مہیا کیا تھا،[4] اور بئر رومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۲ [2] ایضاً [3] تاریخ الطبری۔ ج ۴ ص ۲۱۳

[4] اسی سے اس کو "جیش العسرۃ" کا لقب دیا گیا کہ وہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں تیار کیا گیا تھا۔

امام ترمذی حضرت عبدالرحمٰن بن خباب سے روایت کرتے ہیں، فرمایا:۔

"میں اس وقت موجود تھا، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جیش العسرہ کی تیاری کے لئے ترغیب دے رہے تھے، حضرت عثمانؓ بن عفّان نے کہا یارسول اللہ میری طرف سے سَو اونٹ مع کجاؤں اور کاٹھیوں کے فی سبیل اللہ حاضر ہیں، اس کے بعد آپؐ منبر سے اُتر آئے اور فرمایا کہ "اگر عثمانؓ اس کے بعد کچھ عمل نہ کریں تو اُن کے لئے یہی ایک عمل کافی ہوگا۔"

امام ترمذی حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں، اور حاکم حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے (اور ترمذی نے حدیث کی توثیق بھی کی ہے) کہ :۔

"جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جیش العُسرہ تیار کر رہے تھے حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے، اور آپؐ کے دامن میں اُن کو بکھیر دیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے اور فرماتے "اگر آج کے بعد عثمانؓ نے کوئی بُرا عمل نہیں بھی کیا تو ان کے لئے کوئی نقصان نہیں ہے، یہ بات آپؐ نے دوبار فرمائی۔"

حاکم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "عثمانؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں دوبار جنّت خریدی (یعنی جنّت کی بشارت حاصل کرلی) ایک اس وقت جب کہ انھوں نے بئر رومہ خریدا تھا، اور دوسرے اس وقت جب جیش العسرۃ کو تیار کیا تھا۔"

حضرت عثمانؓ نے بئر رومہ[1] بیس ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کردیا

---

[1] یہ کنواں العقیق کے بڑے میدان میں سیلابی پانی کے جمع ہونے کی جگہ کے قریب واقع ہے جس کو آج کل زغابہ کہتے ہیں، یہ مقام مدینہ منورہ سے شمال مغرب کی جانب ہے، اس کنویں میں پانی وافر مقدار میں تھا، بہت شیریں ہلکا اور بہت صاف، پانی کی شیرینی اور فراوانی کو دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ آلہ وسلم نے صحابہ کو ترغیب دی کہ اس کو خرید لیں، اور مسلمانوں کے لئے وقف کردیں، (باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

تھا ـــــ یہ ایک بڑا کنواں تھا جس کا مالک ایک یہودی تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا، کوئی ہے جو بئر رومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کردے، اپنا ڈول ان کے ڈولوں کے ساتھ کنوئیں میں ڈالے، مسلمان اس کے پانی سے مستفید ہوں، اور اس کے عوض انہارِ جنّت سے فائدہ اٹھانے میں اس کو خصوصی استحقاق حاصل ہو[1]، مسلمانوں کو اس وقت شیریں اور فراواں پانی کی سخت ضرورت تھی ۔

حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ جس وقت خلیفہ ہوئے اس وقت اُن کی عمر ہجری تقویم سے ستّر سال اور عیسوی جنتری کے لحاظ سے ۶۸ سال تھی ۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ کی فتوحات اور اسلامی سلطنت میں توسیع

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ نقطۂ عروج تک پہنچ گیا تھا، اس کا سبب وہ خصوصیات اور نفسیاتی تبدیلیاں تھیں جو اسلام نے مسلمانوں میں پیدا کر دی تھیں، راہِ خدا میں جہاد اور حصولِ شہادت کا شوق، جنت کی آرزو، دنیا اور دنیا کی لذّتوں کو خاطر میں نہ لانا، خارق عادت حد تک دلیری و بہادری، دشمنوں کی تعداد اور ان کی جنگی طاقت کو اہمیت نہ دینا، اللہ تعالےٰ کی طرف سے مکمل مدد پہونچنا،

(باقی ص۱۹۵ کا) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس خواہش کی حضرت عثمانؓ بن عفان نے تکمیل کی اور اس کے طمّاع یہودی مالک سے جس نے بڑے چوں وچرا اور سودا بازی کے بعد منظوری دی اس کا سودا کر لیا، اور بیس ہزار درہم میں کنواں خرید کر مسلمانوں کے حوالہ کر دیا (آثار المدینۃ المنورۃ از استاذ عبدالقدوس الانصاری مرحوم ص۲۴۵ المکتبۃ السلفیۃ للمدینۃ المنورۃ)

[1] الجوہرۃ فی نسب النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم واصحابہ العشرۃ ج ۲ ص۱۷۳

اور اس کا بار بار تجربہ و مشاہدہ، یہ وہ اسباب تھے، جن کی بنا پر اسلامی فتوحات کا سلسلہ ایک موجِ رواں کی طرح فارس اور روم تک پہونچ گیا، شمالی افریقہ تک کوئی چیز ان کا راستہ روکنے والی نہ تھی، بڑی بڑی سلطنتیں اور پُرشکوہ و پُرجلال شہر ان کے سامنے اس طرح گر رہے تھے، جیسے موتیوں کا ہار ٹوٹ جائے اور موتی بکھر جائیں۔

شاید یہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا اور مسلمانوں کے حق میں خیر و برکت کے الٰہی فیصلہ کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی جانشینی حضرت عثمانؓ کے حصہ میں آئے اور نئی فتوحاتِ اسلامیہ کا جو سلسلہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں شروع ہوا تھا، وہ پھیلے بڑھے اور ترقی پائے کیونکہ اکثر و بیشتر مفتوحہ ممالک کے گورنر اور زیادہ تر اسلامی افواج کے سربراہ اموی تھے، اور ان کا حضرت عثمانؓ سے رشتہ داریوں کا قریبی تعلق تھا، (جیسے معاویہ بن ابی سفیانؓ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، مروان بن الحکم، اور ولید بن عقبہ) ان ہی فتوحات کے ذریعہ لاکھوں انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، یہ بجائے خود بڑے خیر و برکت کی بات اور شکر کا مقام تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں آذربائیجان اور طبرستان فتح ہوئے، اور آپ ہی کے عہد میں حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ الباہلی بلاد الخزر تک فاتحانہ داخل ہو گئے، بحر قزوین CASPIAN SEA کے ساحل پر وسیع مقامات ہیں (اور اسی پر بلاد الدیلم واقع ہے، اور الجبل بھی اسی علاقہ میں ہے) اسلامی فوجیں مسلسل بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ بلنجر پہونچ گئیں، اور اس کے آگے بڑھیں تو قہستان سے نیساپور، طخارستان، اور وہاں سے مرو الرود، بلخ، خوارزم، آرمینیا اور وہاں سے نا یفلا، اور تفلیس تک کا علاقہ اسلامی فتوحات میں داخل ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں قبرص CYPRUS اور برِاعظم افریقہ

کے شمالی ساحلی علاقے پر طرابلس سے طنجہ تک اسلامی حکومت کو وسیع کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں خلافتِ اسلامیہ ایک ایسی سلطنت بن گئی جس کی اپنی بحری طاقت بھی تھی، رومی جہاز اس کے قبضہ میں آگئے تھے، اس میں وہ جہاز بھی داخل ہیں جو معاویہؓ اور عبداللہ بن سعدؓ نے تیار کئے تھے، اس وقت اسلامی فتوحات اس وسعت سے پھیل گئی تھیں کہ سرحدوں کی حفاظت کے لئے بحری بیڑے ضروری ہو گئے تھے اور خاص طور پر اس لئے کہ روم کی طرف سے آئے دن حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔[1]

اسلامی فوجوں نے حضرت عمرؓ کے عہد میں مملکت فارس (ایران) پر پورا قبضہ کر لیا تھا، اسی طرح بلاد سوریہ (شام) اور مصر بھی اسلامی قلمرو میں داخل ہو چکے تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض مفتوحہ ممالک میں امن و امان پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا، اور وہاں کے رہنے والوں کو کوئی بھی ورغلاتا اور اسلام اور اسلامی نظامِ حکومت کے خلاف اشتعال دلاتا، تو وہ اس کے ساتھ ہو جاتے، حضرت عثمانؓ کے دور میں یہ مستقل کام تھا کہ اگر کوئی ملک یا علاقہ بغاوت کرتا تو اسلامی فوج اس شورش کو دبا دیتی، اور اسلامی حکومت کا نظام برقرار رہتا، اس طرح ان باغی عناصر کو اسلامی حکومت کا اطاعت گزار بنانا بھی ملک فتح کرنے سے کم نہ تھا، حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتوحات ہوئیں ان میں بہت سے ایسے ممالک اور علاقے تھے، جہاں مسلمان مجاہدوں کے اس سے پہلے قدم نہیں پہونچے تھے۔[2]

حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں نے بلخ، ہرات، کابل اور بدخشاں پر قبضہ کیا، اور ایران کے جنوب میں بغاوت اس بات کا سبب بنی کہ کرمان اور سجستان اسلامی قلمرو میں

---

[1] تاریخ الامم الاسلامیہ مصنفہ شیخ محمد خضری بک ج ۲ ص ۲۷-۳۰ (ملخصاً) المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۹۶۹ء

[2] الخلفاء الراشدون از شیخ عبدالوہاب النجار ص ۲۷۰

داخل ہوگئے، فاتح حکومت نے عوام کی بہبودی اور راحت رسانی کے بہت سے کام کئے، متعدد نہریں کھودی گئیں، اور چشمے جاری ہوئے، سڑکیں نکالی گئیں، پھل دار درخت لگائے گئے، تجارتی وسائل کو محفوظ اور پُرامن بنایا گیا، اور اُس کے لئے پولیس کا محکمہ قائم ہوا، اور پہرہ دار مقرر ہوئے، رومیوں کے حملوں نے اسلامی فوج کو ایشیائے کوچک اور بحرِ اسود کی طرف بڑھنے پر مجبور کیا، اس طرح طرابلس العرب اور برقہ افریقہ میں اور قبرص (CYPRUS) بحرِ روم میں فتح ہوا، مسلمانوں نے اس بحری بیڑے کو بھی تباہ کر دیا جو روم نے مصر کو فتح کرنے کے لئے اسکندریہ کی بندرگاہ پر تیار کیا تھا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ

آپ کی خلافت انہی خطوط پر تھی جن پر آپ سے پہلے کے دونوں خلفاء کی خلافتیں تھیں، ہر اعتبار سے، مساوات، انصاف، شریعت اسلامیہ کا نفاذ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، امن وامان کا قیام سب اسی طرح تھا جس طرح پہلے ہوتا رہا۔

تاریخ طبری میں سالم بن عبداللہ کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا:۔

حضرت عثمانؓ جب سے خلیفہ ہوئے، انھوں نے سوائے آخری حج کے ہر سال حج کا سفر کیا، لوگوں کو امن وامان دیا، دوسرے تمام شہروں میں منادی کرائی کہ عمّالِ حکومت اور ان سے شکایت رکھنے والے حج کے موقعہ پر حاضر ہوں، معروف پر عمل پیرا ہیں، نواہی (ممنوعات) سے اجتناب کریں، اہلِ ایمان اپنے آپ کو کمزور و بے بس نہ سمجھیں، اگر کوئی کمزور مظلوم ہے تو انشاءاللہ میں قوی کے مقابلہ میں اس کا ساتھ دوں گا، چنانچہ لوگوں کا

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE SARACENS, PP. 43-44

عمل بھی اس پر ہوا، مگر کچھ گروہ ایسے تھے جنھوں نے اس کو جتھہ بندی کا ذریعہ بنا لیا[1]۔ اور ابن کثیرؒ "البدایہ والنہایہ" میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت عثمانؓ کا معمول تھا کہ تمام گورنروں کو موسم حج میں حاضری کا پابند کرتے تھے، اور رعایا کو مطلع کیا جاتا تھا کہ اگر کسی حاکم کے خلاف کسی کو شکایت ہو تو اس کو موسم حج کے موقع پر پیش کرے، میں اس کے گورنر سے اس کا حق دلواؤں گا۔"[2]

حضرت عثمانؓ کا زندہ جاوید کارنامہ

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پورے عالمِ اسلام کو ایک مُصحف اور ایک ہی قرأت (بہ اعتبار حروف و ترتیبِ آیات و سُوَر) پر متفق کر دیا ـــــــ مُصحف کے متعدد نسخے لکھوا کر تیار کرنا اور تمام اسلامی ملکوں کے دارالحکومت میں ایک ایک سرکاری نسخہ بھیج دینا اور ایک قرأت کو طے کر دینا حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

امام بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) لکھتے ہیں :۔

"لوگوں کو اختیار تھا کہ ان کو جس قدر قرآن یاد ہے، اس کو جس قرأت میں بھی پڑھنا چاہیں پڑھیں، یہ صورتِ حال اس قدر بڑھی کہ فساد کا خوف ہونے لگا، لہٰذا ایک قرأت ان سب پر لازم قرار دیدی گئی جس طرح آج تک ہم لوگ پڑھتے ہیں، عوام میں مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

---

[1] تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۳۴ منقول از کتاب "رحماء بینہم" از مولانا محمد نافع۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۱۵ (مصدر سابق)

"جامع القرآن" ہیں، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، جو بات صحیح اور ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں پر یہ لازم قرار دیا کہ ایک قرأت کے پابند رہیں، وہ قرأت جس پر انصار و مہاجرین کا اتفاق ہے کیونکہ اہلِ عراق اور اہلِ شام حروف کے تلفظ اور زیر زبر کو مختلف انداز سے پڑھنے لگے تھے، اور ایک بڑا فتنہ سر اٹھا رہا تھا، سب سے پہلے جس نے قرآن کو ایک مُصحف میں جمع کیا وہ ابوبکر صدیقؓ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"اللہ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن کو دو لوحوں کے درمیان محفوظ کر دیا، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں کسی صحابی نے اس ترتیب پر اعتراض نہیں کیا جس ترتیب پر حضرت عثمانؓ نے اس کو نقل کرایا، کیوں کہ ان دونوں (حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما) کے زمانہ میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، کیونکہ وہ اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا، جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں سامنے آیا، اللہ تعالےٰ نے حضرت عثمانؓ کو ایک بڑی خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی، اس سے اختلافات دور ہو گئے، اور اُمت کو یکسوئی نصیب ہوئی[1]"

"حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا" اگر عثمانؓ کے بجائے مجھے اس صورتِ حال سے سابقہ پڑتا تو میں بھی مصاحف کے سلسلہ میں وہی کرتا جو عثمانؓ نے کیا[2]"

ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں سُوید بن غفلہ سے روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا:-

---

[1] "البرہان" ص۲۳۹ (طبع دار احیاء الکتب العربیۃ) [2] ایضاً ص۲۴۰

"اے لوگو! عثمانؓ کے بارے میں ناانصافی سے کام نہ لو، تم کہتے ہو کہ انھوں نے مصاحف میں ردّ و بدل کر دیا، خدا کی قسم انھوں نے (ایک قرأت پر جمع کر دینے کے بارے میں) جو طرزِ عمل بھی اختیار کیا، وہ صحابۂ رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں تھا، اور اُن کو اُن کی تائید حاصل تھی، اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے کیا۔"[1]

مسجد نبوی کی توسیع

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کارناموں میں ایک کارنامہ حرم نبوی شریف کی توسیع بھی ہے، مسجد نبوی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں کچّی اینٹوں سے بنی تھی، چھت کھجور کی ٹہنیوں کی تھی، اس کے پائے کھجور کی لکڑی کے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے کوئی اضافہ نہیں کیا، حضرت عمرؓ نے کچھ توسیع کی انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیر کردہ مسجد کی بنیادوں پر اس کو اسی طرح کچّی اینٹوں سے دوبارہ تعمیر کیا، اس کے ستون لکڑی ہی کے رکھے، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے آگے قدم بڑھایا اور مسجد میں بڑی توسیع کی اس کی دیوار پتھر کی بنائی، جس پر نقش تھے، اور گارے چونے سے اس کو پختہ کیا، منقّش پتھروں سے اس کے پائے تیار کرائے اور چھت کے لئے ساج (ساکھو) کی لکڑی استعمال کی۔[2]

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں مشکلات و مصائب کی یورش

جنگوں میں کامیابی اور فتوحات کی کثرت کی وجہ سے دولت کی ریل پیل تھی،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۱۸   [2] "البرہان" ص ۵ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ" از سمہودی (م ۹۱۱ھ) (دار احیاء التراث العربی بیروت ط ۳-۱۹۸۱ء)

خوش حالی اور فارغ البالی کا ہر طرف دَور دَورہ تھا، آرام و آسائش اور عیش و عشرت کے وسائل سے پہلی بار عرب کے صحرا نشیں مسلمان متعارف ہو رہے تھے، یہ باتیں ایسی نہ تھیں جو رنگ لائے بغیر رہتیں، طبائع و نفسیات پر ان کا اثر پڑنا بھی نظامِ قدرت ہے، تاریخ انسانی میں اس کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں، ان اثرات کو آزادی و فارغ البالی کا ایک ٹیکس کہئے جو لازماً ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کا زمانہ (جب انھوں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی اور فتوحات میں وُسعت و ترقی ہوئی) فکر و معاشرت کے قدیم سانچوں کے ٹوٹنے اور تمدن کے نئے سانچوں کے ڈھلنے کا زمانہ تھا، اسلامی معاشرہ کا وہ سانچہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت نے تیار کیا تھا، جس کا امتیاز سادگی و جفاکشی تھا، اور جس میں دنیاوی نعمتیں آخرت کے اجر و ثواب کے پیمانہ سے ناپی اور تولی جاتی تھیں، اس کے اثر سے اُن سے وہ گرویدگی اور وابستگی نہیں پیدا ہوئی تھی، جس کے نتیجہ میں دنیاوی جاہ و منصب، مال و دولت کے حصول میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی جدّوجہد اور مہم شروع ہو جاتی۔

حضرت عثمانؓ کے وقت سے ہواؤں کا رخ تبدیل ہونے لگا، حضرت عمرؓ نے آنے والے سیلاب کا رُخ بھانپ لیا تھا، اور اس کی روک تھام پوری قوت کے ساتھ کرتے رہے، مگر فتوحات کی کثرت اور پے در پے نئے نئے ملکوں کا سرنگوں ہونا اور ہر جگہ سے دولت کا سمٹ کر آنا معاشرہ کے بنیادی نظام پر اثر انداز ہو کر رہا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی معاشرہ کا قلعہ ایسا جھروکہ بن گیا جس سے مسموم ہوائیں آندھیاں بن کر اندر آنے لگیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عزم و حزم میں کوئی کمی نہیں تھی، نہ وہ جادۂ حق سے سرِ مُو منحرف ہوئے، اپنے طرزِ حکومت میں عدل کے ضوابط اور تقاضوں کو پورا کرتے رہے لیکن جن لوگوں سے اب سابقہ تھا

وہ پہلے کے سادہ مزاج، جفاکش صحرانشین عرب نہیں تھے، بلکہ جہاں دیدہ، دولت کے مظاہر دیکھے ہوئے اور متاعِ دنیا سے لُطف اندوز ہونے والی اقوام کی عیش کوشیوں سے واقف لوگ تھے، انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے، دولت سے اس کے پر نکل آتے ہیں، اگر ایمان کا طاقت ور پہرہ نہ ہو تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اور سامنے کا راستہ نظر نہیں آتا اور عقل کی زمام کار ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔[1]

مشہور صاحبِ قلم استاذ کبیر عبّاس محمود العقاد نے بڑی خوبی کے ساتھ اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"سب سے بڑی آزمائش (جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہوگی) یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے اگرچہ کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی پہلے خلفاء کے عہد میں نظیر نہ ملتی ہو، مگر ماحول اور حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے، حالات اور ماحول یکسر بدل گئے تھے، حضرت عثمانؓ کے سامنے اُن کے پیش رو خلفاء حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے نمونے تھے، اور ان کے ساتھ تجربات کے ساتھ اُن کی سیاسی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہ اُن کی اصل قوت تھی لیکن تمام مشکلات میں سب سے بڑی مشکل یہ درپیش تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق تصرّفات کرنا چاہتے تھے، اور ہر حال میں اُن کے سامنے نمونہ وہ تھا جس پر عہدِ نبوی اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں عمل تھا، مگر جس زمانہ اور جس ماحول میں اُن کو نافذ کرنا چاہتے تھے، وہ زمانہ مختلف تھا، اور لوگ وہ نہیں رہے تھے، ماحول یکسر بدل چکا تھا۔"[2]

---

[1] اقتباس و تلخیص از کتاب "عثمان بن عفّان" از صادق ابراہیم عرجون ص ۹۳، (مطبوعہ الدار السعودیہ ط ۲- ۱۹۸۱ء)

[2] العبقریات الاسلامیہ ص ۷۶۱

وہ مزید لکھتے ہیں :۔

"جس زمانہ میں حضرت عثمانؓ ایمان لائے تھے، اور وہ زمانہ جب وہ منصب خلافت پر متمکن ہوئے، دونوں کے درمیان آسمان زمین کا فرق تھا، عرب سوسائٹی بڑے پیمانے پر بدل چکی تھی، اور اسلامی چھاپ، عالمی چھاپ کا ایک حصہ بن چکی تھی، جو دنیا کے دوسرے متمدن معاشروں کے طرزِ زندگی اور شرق اور مغرب کی ترقی یافتہ اقوام کے قریب قریب ہم پلہ تھی"[1]

اور یہیں سے حضرت عثمانؓ کے ناقدین و معترضین کو موقع ملا کہ وہ اُن کے عمل کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیخین کے معیار پر جانچیں اور اُن کا محاسبہ کریں، استاد عقاد لکھتے ہیں :۔

"اس وقت جو لوگ اسلامی سلطنت کی رعیت تھے، عام ممالک کے باشندوں کی طرح زندگی گزارتے تھے، وہی ان کا طرزِ معاشرت تھا لیکن حکام کو چاہیئے تھے کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طرز سے بال برابر بھی تجاوز نہ کریں خود وہ اس معیار کے نہیں تھے، جس معیار کے ابوبکرؓ و عمرؓ کے وقت کے لوگ تھے، اُن کے اعمال و کردار میں انحراف تھا، وہ اس کو نظر انداز کر دیتے مگر خلیفۂ وقت کا محاسبہ سختی سے کرتے۔

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو وہ قوت حاصل نہیں تھی، جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حاصل تھی لیکن حضرت عمرؓ نے (با وجود اپنے دبدبہ اور ہیبت کے) اپنی زندگی کے آخری دور میں زمانہ کے فرق سے

---

[1] العبقریات الاسلامیہ صـ۲۷۷۔

حالات میں فرق آجانے کا اندازہ کرلیا تھا، چنانچہ وہ اپنی دعاؤں میں فرمایا کرتے تھے۔

اللھم کبرت سنی وضعفت	اے اللہ میں بوڑھا ہوچکا ہوں اور
قوتی وانتشرت رعیتی	میری قوت کمزور ہوگئی ہے اور میری رعیت
فاقبضنی غیر مضیع ولا	بہت پھیل گئی ہے، مجھے اس حال میں دنیا
مفرط۔[1]	سے اُٹھا کہ نہ کسی کا حق مجھ سے ضائع ہوا ہو
	اور نہ کسی کے حق میں میں نے زیادتی کی ہو۔

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان دونوں زمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے تفاوت کو سمجھتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں یہ بیماری زیادہ نہ بڑھ جائے اور لوگوں کو ڈراتے بھی رہتے تھے، اپنے مخاطب لوگوں سے کہتے نیز اپنے خطبوں میں فرماتے "یہ قوم جس آزمائش سے دوچار ہے، وہ تقدیری بات ہے جس کو دور نہیں کیا جاسکتا، یہ دنیا کا فتنہ ہے جو دلوں پر حاوی ہے اور ایسا حاوی ہے کہ کوئی تدبیر یا کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی[2]"

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"سب سے بڑی مشکل یا آزمائش یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ جس زمانہ میں تھے، اس وقت ضرورت تھی کہ لوگوں کو خلافت پر اعتماد ہو، وہ حاصل نہ تھا، کبھی ضرورت پڑتی کہ حکومت کی طاقت ہو وہ بھی میسر نہ تھی لہذا ایسی حکومت (تنقید واعتراض اور اختلاف وانتشار سے) بچ نہیں سکتی، جس کو اعتماد کی ضرورت ہو مگر اعتماد حاصل نہ ہو اور جب حکومت کی طاقت مطلوب ہو تو وہ بھی نہ ملے[3]"

---

[1] العبقریات الاسلامیہ ص۷۱۰   [2] ایضاً ص۷۹۹   [3] ایضاً ص۸۲۶

اس سب کے بعد استاد عقاد لکھتے ہیں:۔

"حضرت عثمانؓ نے اختیارات سنبھالنے کے بعد سلطنت کے امور خارجہ کو جس طرح قابو میں کیا اور جو حالات اچانک سامنے آگئے تھے، اُن کا مداواجس پامردی، استقلال اور عزم کے ساتھ کیا، وہ قابلِ تعریف ہے، اور اس وقت ایک خلیفہ کو یہی کرنا چاہیئے تھا، ہوشمندی، معاملہ فہمی، احتیاط و اعتدال کے ساتھ جلد کارروائی، حکّام اور ان کے خلاف دعوی داروں کے معاملہ میں نرمی کی پالیسی ہی مناسب تھی۔"[له]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لئے جو بات سب سے پہلے تنقید و اعتراض کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ انھوں نے حکومت کے لئے جن عُمّال و حکام کا انتخاب کیا اُن کے ماضی میں خدمت اسلام کے شاندار کارنامے نہ تھے، اور نہ اُن کی کوئی بڑی دینی وجاہت معاشرہ میں تھی، ان میں سے بعض وہ تھے، جن سے بعض ایسی کارروائیاں ظہور میں آئیں جو نقد و ناراضگی کا سبب ثابت ہوئیں، خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جنھوں نے عصرِ نبوی کے کارندوں کو دیکھا تھا، یا جن کے سامنے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے کارندوں کے نمونے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ان کے خلاف جابجا چرچے ہوئے، حالانکہ خلیفہ یا حاکمِ اعلیٰ کے سامنے مختلف سیاسی اور انتظامی مصلحتیں ہوتی ہیں، جن کے پیشِ نظر وہ حکام یا گورنروں کا انتخاب کرتا ہے اور وہ ہر ایک کو مطمئن نہیں کرسکتا۔

استاذ کُرد علی نے "اسلامی انتظامیہ" کے عنوان سے اپنے "خطبات" میں "الطبری" کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عاملوں (حکومت کے علاقائی ذمہ دار

له العبقریات الاسلامیہ صفحہ ۸۰۴

گورنر یا حکام) میں دو تہائی عامل بنو امیہ میں سے تھے، کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیش نظر عاملوں کے انتخاب میں ان کی صلاحیتیں اور کارکردگی کی قوت پیش نظر رہتی تھی، آپ نے اُن اشخاص کو منتخب نہیں فرمایا جو اُمور نظم و ضبط سے نابلد ہوں اور اُن کے اندر عمل کی کمزوری ہو یہ اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ فوجوں کی سربراہی، سیاسی اُمور کی دیکھ بھال اور حکومت کے انتظامیہ کو سنبھالنے کے لئے اشخاص کا انتخاب سربراہ مملکت کی ذمہ داری ہے، اس سلسلہ میں دولت یا خاندانی شرافت و عزت، طویل رفاقت و صحبت یا کبرسنی پر فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ جو صلاحیت دیکھی جاتی ہے، وہ علم، کام کی صلاحیت اور جو امور اس سے متعلق کئے گئے ہوں، اُن کی بجاآوری کی قابلیت ہے، اور یہ کہ اس کی پالیسی (حکیمانہ) اور صحیح رُخ پر کام کرتی ہو۔"[1]

ابن ابی الحدید نے قاضی القضاۃ عبدالجبار کا ایک قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے حکام اور والیوں کے انتخاب کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدافعت میں کہا:۔

"اس امر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ جب حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں کو گورنر اور حاکم بنایا، اس وقت اُن کو اُن لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا، ممکن ہے کہ ان کے علم میں صرف وہ رائیں ہوں جن سے اُن کی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہو، اور کسی علانیہ بُرائی کا پتہ نہ ہو۔"[2]

استاذ کرد علی کہتے ہیں:۔

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ ص ۱۰۲ [2] "شرح نہج البلاغہ" از ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۱۲ (حضرت عثمان پر اعتراضات اور اُن کے جوابات)۔

"کیا سیاسی حکمتِ عملی کا تقاضہ یہ نہیں تھا کہ حضرت عثمانؓ اپنی قومی اور قبائلی حمایت و تعلق پر اعتماد کریں، کیونکہ اُن لوگوں کا اُن کو کلی اعتماد حاصل تھا، اور دوسروں کی بہ نسبت اُن میں حضرت عثمانؓ کے دورِ حکومت کو کامیاب بنانے اور ان کے مقاصد کی تکمیل کا زیادہ جذبہ ہونا فطری امر ہے"۔[1]

اگرچہ والیوں اور اُمراء کے انتخاب کے سلسلہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بہت سی تاویلات کی جا سکتی ہیں، اور وہ حق بجانب ہوں گی، لیکن ہم اُن کو کلیۃً خطا سے معصوم نہیں سمجھتے، بلکہ ہم اُن کو مجتہد سمجھتے ہیں، جو کبھی صحیح کام کرتا ہے، اور کبھی اس سے (اجتہادی) غلطی بھی ہو جاتی ہے، اللہ کے علاوہ کسی کو ہر قسم کے عیوب سے مبرا اور رسول کے علاوہ کسی کو معصوم نہیں سمجھتے (ولا نزکّی علی اللہِ أحداً) ہم مروان بن الحکم، ولید بن عقبہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو بری نہیں سمجھ سکتے، ان کا طرزِ عمل، قرابت و رشتہ کا استحصال، اور جو مہارت ان کو کاموں کے انجام دینے میں حاصل تھی، اس سے فائدہ اٹھا کر جو کچھ وہ کرتے رہے، اس کا یکسر انکار اور اس سے چشم پوشی ضروری نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ لوگ جو حضرت عثمانؓ کے خلاف تھے، اور ان پر تنقید کرتے تھے، ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو خود پورے طور پر مُخلص اور بے غرض نہیں تھے، اُن کے شخصی اغراض اور سیاسی مُحرکات تھے، استاد عباس محمود العقاد نے اس سلسلہ میں حقیقت پسندانہ اور عادلانہ تجزیہ کیا ہے، حضرت عثمانؓ کے خلاف مخالفت اور شکایت و تنقید کی جو مہم شروع ہوئی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ کے احتساب میں افراط و غلو اور مبالغہ سے کام لیا گیا، اور آزادیِ رائے

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ ص ۱۰۳

کا جو حق اسلام نے اُمّتِ اسلامیہ کے افراد کو بخشا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس کو بے محل استعمال کیا گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مُحاسبہ کرنے کے لئے جو لوگ اٹھے ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جن کی اپنی غرضیں تھیں، جو وہ کہتے تھے، کرتے نہیں تھے، ان میں ایسے بھی تھے، جن پر حد قائم کی گئی تھی، وہ بھی تھا جس کے باپ کو کسی جُرم میں قید کر دیا گیا تھا، وہ بھی تھا جس کی بیوی کو اس سے جُدا کر دیا گیا تھا کہ غیر قانونی طور پر اس نے شادی کی تھی، اور وہ بھی ہوگا جس کے ساتھ ان امور میں سے کوئی بات نہیں کی گئی، مگر فساد کی نیت اس کے دل میں تھی، یہ تمام باتیں ایسی ہیں، جو خلیفہ کے اعمال پر مُحاسبہ کی تحریک کے اسباب میں شمار کی جائیں گی۔"[1]

فتنہ نقطۂ عروج پر

یہاں ہم اختصار کے ساتھ اس فتنہ کا ذکر کرتے ہیں، جو اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا، جس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حالتِ محاصرہ میں شہادت ہوئی، ہم اس سلسلہ میں ابن کثیر کی "البدایۃ والنہایۃ" کی روایات و بیانات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

مصر میں ایک پارٹی ایسی تھی جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بُغض تھا، وہ اُن کے خلاف ناروا باتیں کیا کرتے تھے، اور اُن پر سخت نکتہ چیں اور معترض تھے کہ انھوں نے بڑے بڑے صحابہ کو معزول کر دیا، اور ان کی موجودگی میں ایسے اشخاص کو گورنری اور عہدے دیئے جو والی بنائے جانے کے مستحق نہیں تھے، اہلِ مصر کو حضرت عمرو بن العاص کے بعد سب سے زیادہ نفرت

---

[1] العبقریات الاسلامیہ ۔ العقاد ص ۲۰۶

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح سے تھی، عبداللہ بن سعد حکومتِ مصر کی ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر مغرب، بلادِ بربر، اندلس اور افریقہ کے فتح کرنے میں مشغول رہے، اس دوران مصر میں صحابۂ کرام کی اولاد میں کچھ ایسے افراد ہوئے جنھوں نے ان سے جنگ کی ٹھان لی، اور لوگوں کو اُن کے خلاف ورغلاتے رہے کہ ان سے جنگ کی جائے، اور ان کے خلاف محاذ بنا لیا جائے، اُن میں بڑی تعداد کے لیڈر محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ تھے، اُن دونوں نے تقریباً چھ سو سوار تیار کئے کہ وہ رجب کے مہینہ میں عمرہ کرنے کی غرض سے جائیں اور مدینہ منورہ آکر حضرت عثمانؓ کے خلاف مظاہرہ کریں، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے حضرت عثمانؓ کو اطلاع کردی کہ یہ لوگ بظاہر عمرہ کرنے جارہے ہیں لیکن درحقیقت اس بھیس میں آپ کے خلاف ناپسندیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ جب یہ لوگ مدینہ منورہ کے قریب آئے تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ مدینہ سے باہر جا کر اُن لوگوں سے ملیں، اور ان کے مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کے اپنے ملک کو واپس کردیں، اور کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو اس کام کے لئے آمادہ کیا تو حضرت علیؓ (بطورِ خود) اس مہم کے لئے تیار ہوگئے، حضرت عثمانؓ نے اُن کو اس کے لئے مقرر کیا، اُن کے ساتھ معززین کی ایک جماعت بھی روانہ ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جحفہ کے مقام پر اُن لوگوں کو پالیا، یہ لوگ حضرت علیؓ کا بڑا احترام کرتے تھے، اور اُن کے معاملہ میں کچھ مبالغہ سے کام لیتے تھے، حضرت علیؓ نے اُن کو سخت سُست کہا اور لوٹا دیا، وہ لوگ آپس میں آپ اپنے اوپر ملامت کرنے لگے، اور حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کرکے کہا یہی ہیں، جن کی خاطر ہم امیر کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہیں، اور اُن کے بارے میں دلائل پیش کرتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کیا شکایت ہے، اُن لوگوں نے اپنے اعتراضات بیان کئے، حضرت علیؓ نے اُن کا جواب دیا، اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے ان باتوں کی تاویل کی

اور اسباب بنائے[1] اور اُن کو کسی طرح لوٹا دیا، وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اور ناکام اپنے ملک واپس گئے، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ کے پاس واپس آئے، اور ان کو بتایا کہ وہ لوگ واپس گئے، اس موقع پر حضرت علیؓ نے مصلحت کے تقاضوں کے مطابق مشورے بھی دیئے، حضرت عثمانؓ نے اُن کے مشوروں کو توجہ سے سُنا اور اُن کا خیر مقدم کیا۔

ادھر اہلِ مصر، اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ نے آپس میں خط و کتابت شروع کی اور مدینہ منورہ میں جو صحابہ تھے اُنکی طرف سے جعلی خطوط بھی بھیجے گئے[2]، اور جب شوال ۳۵ھ کا مہینہ آیا تو اہلِ مصر حاجیوں کی شکل میں حجاز کی طرف چلے، اور مدینہ منورہ پر ہجوم کیا، اور اسکو ہر طرف سے گھیر لیا، صحابہ کرامؓ ان شورش کرنے والوں کے پاس گئے، اور اُن کو بُرا بھلا کہا، اور واپس جانے کی ہدایت کی، یہانتک کہ حضرت علیؓ نے ان لوگوں سے کہا کہ جب تم واپس جا چکے تھے، تو پھر تم نے اپنی رائے کیوں بدل دی اور کیوں واپس آئے؟ ان لوگوں نے کہا کہ ایک ایلچی کے پاس سے ہم نے ایک خط برآمد کیا جس میں ہمیں قتل کر دیئے جانے کی ہدایت تھی، اہلِ بصرہ و کوفہ نے بھی یہی کہا، دوسرے شہروں کے باشندوں نے بھی کہا کہ ہم اپنے ساتھیوں کی مدد کیلئے آئے ہیں، صحابہ نے اُن سے کہا، تم کو یہ باتیں اپنے ساتھیوں سے کیسے معلوم ہوئیں، تم لوگ تو ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے، اور

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، ابن کثیر ج ۷، ص ۱۷۱-۱۷۱ [2] بہت سے محققین کا رجحان ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش پیدا کرنے اور جعلی خطوط بنانے میں عبداللہ بن سبا الصنعانی کا بڑا حصہ ہے، یہ شخص پہلے یہودی تھا، پھر اسلام لایا تھا، مزید تفصیل آئندہ صفحات (باب خلافت سیدنا علی رضی اللہ عنہ) میں آئے گی۔

ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری لکھتے ہیں:-

"جس وقت بصرہ اور کوفہ میں سخت ترین فتنے برپا تھے، ابن سبا مصر کے ایوان میں بیٹھا حاکم اور رعایا کے درمیان اختلافات پیدا کرنے اور اُن کے اُبھارنے کی سازشیں کر رہا تھا، اور انتہائی بے بنیاد اور دور از کار نظریات کو اسلامی فکر میں حلول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

(اثر اهل الكتاب فى الفتن والحروب الأهلية فى القرن الاول الهجرى ص ۲۵۸)

مزید لکھتے ہیں:-

"سبائیت بڑے بڑے شہروں کو اپنے پروپگنڈوں کا مرکز بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی، کیوں کہ اسلامی سلطنت کی فوجی اور مالی قوتیں انہی مقامات میں تھیں۔"

(ایضاً ص ۲۶۶)

تم لوگوں کے درمیان خاصہ فاصلہ تھا، بلاشبہ یہ سب تمھاری ایک متفقہ سازش اور اجتماعی منصوبہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مصری جب اپنے ملک واپس جا رہے تھے، راستہ میں اُن کو ایک ایلچی ملا، جو مصر جا رہا تھا، اس کو ان لوگوں نے پکڑ لیا اور تلاشی لی، اس کے پاس ایک چمڑے کا تھیلا ملا جس میں ایک خط تھا، جس میں حضرت عثمانؓ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر دیا جائے، اور کچھ لوگوں کو سُولی دی جائے اور چند لوگوں کے بارے میں تھا کہ اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، اور اس خط پر حضرت عثمانؓ کی مُہر کا نشان تھا، قاصد بھی حضرت عثمانؓ کے غلاموں میں سے تھا، اور جس اونٹ پر تھا وہ بھی حضرت عثمانؓ ہی کا تھا، جب یہ لوگ واپس آئے تو اس خط کو ساتھ لائے اور لوگوں میں اس کو گشت کرایا، لوگوں نے امیر المؤمنین سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا:۔

"یہ ہمارے خلاف ایک ثبوت ہے، مگر بخدا نہ میں نے یہ لکھا ہے نہ لکھایا ہے، اور نہ مجھے اس سلسلہ میں کچھ معلوم ہے، اور مُہر بھی کبھی جعلی بنائی جاتی ہے، کچھ لوگوں نے اُن کی بات کی تصدیق کی اور کچھ لوگوں نے تکذیب۔"

ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

"یہ خط حضرت عثمانؓ پر افترا ہے، انھوں نے نہ اس کا حکم دیا تھا، نہ اُنکو معلوم تھا" ابن جریر نے اپنی سند سے تاریخ میں لکھا ہے کہ مصر لوٹنے یہ خط ایک ایلچی سے برآمد کیا تھا، جو مصر کے گورنر کے نام تھا، اس میں کچھ لوگوں کے قتل کرنے، چند کو سولی دیئے جانے اور بعض لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹے جانے کا حکم تھا، یہ خط مروان بن الحکم نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے لکھا تھا، اور اس سلسلہ میں اسکی تاویل یہ آیت تھی:۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ	جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے لڑائی
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ	کریں، اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے
فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا	پھریں، اُن کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے

اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ	جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں، یا
وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ	اُن کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک
يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ	ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں
لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ	یا ملک سے نکال دیئے جائیں یہ تو دنیا میں
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ [۱]	اُن کی رسوائی ہے، اور آخرت میں اُن کے لئے
(سورۃ المائدہ۔۳۳)	بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

بلاشبہ وہ اس آیت کے مصداق تھے، مگر مروان کو اس کا حق نہیں تھا کہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے بغیر اُن کی اجازت کے فرضی حکم لکھے، اور اُن کی تحریر جعلی بنائے اور ناجائز مُہر استعمال کرکے اور پھر اُن ہی کے غلام کے ذریعہ خود اُن ہی کے اونٹ پر یہ پیغام بھیجے [۲]۔

چند محققین کا رُجحان اس طرف ہے کہ حضرت عثمانؓ کی طرف اس خط کی نسبت ایک طے شدہ سازش اور تخریبی اسکیم تھی "موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان" کی حسب ذیل عبارت سے یہی بات ثابت ہوتی ہے، (اسی طرح کی روایت طبری کے یہاں بھی ملتی ہے)

"موارد الظمآن" میں ہے:۔

"پھر مصری واپس ہوگئے، اثنائے سفر میں ایک سوار نے ان کا راستہ روکا پھر ان سے دور ہوگیا، پھر لوٹا اور پھر واپس ہوا، اور ان لوگوں کی شناخت کرلی، اُن لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ تم کو ہم جان کی امان دیتے ہیں، بتاؤ تم کس مہم پر

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ الامم والملوک" لابی جعفر محمد بن جریر الطبری ج ۵ ص ۱۰۴-۱۰۵

[۲] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۱۸۶

نکلے ہو؟ اس نے کہا: میں امیر المؤمنین کی طرف سے بھیجا ہوا، مصر کے گورنر کے پاس جا رہا ہوں، اُن لوگوں نے اُس کی تلاشی لی تو اُن کو ایک خط ملا جو حضرت عثمانؓ کی طرف سے تھا، اُس پر اُن کی مہر تھی، اور یہ خط حضرت عثمانؓ کے گورنر مصر کے نام تھا کہ اُن کو سولی دیدو یا اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دو، یہ لوگ پڑھے اور مدینہ واپس آئے اور علی رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا: آپ نے دیکھا عدوُّ اللہ (اللہ کے دشمن) نے ہمارے بارے میں ایسا ویسا لکھا ہے، واللہ اب اس کا خون ہمارے لئے حلال ہے، اس کے پاس ہمارے ساتھ چلئے، حضرت علیؓ نے کہا: واللہ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا، اُن لوگوں نے کہا: تو پھر ہمیں آپ نے لکھا کیوں تھا؟ حضرت علیؓ نے کہا: بخدا میں نے تم کو کوئی خط نہیں لکھا، اس پر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور اُن میں سے بعض لوگوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا: کیا ایسے شخص کے لئے تم جنگ کرتے ہو اور اس کے لئے تم برہمی کا اظہار کرتے ہو (جو تم سے ایسی بے تعلقی ظاہر کرتا ہے)؟[1]

مزید روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اُن لوگوں سے کہا:۔

"اے بصرہ والو! تم کو کیسے پتہ چلا کہ مصریوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ تم تو سفر کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے، پھر ہماری جانب آگئے، واللہ یہ تو ایسا منصوبہ ہے جو مدینہ ہی میں بنا لیا گیا تھا۔"[2]

---

[1] موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان، از حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی ص۵۳۲ (دار الکتب العلمیۃ)

[2] تاریخ الامم والملوک از ابی جعفر محمد بن جریر الطبری۔ ج ۵ ص۱۰۵

اس خط کو ایک اور حقیقت بھی مشکوک اور جعلی ثابت کرتی ہے، وہ یہ کہ یہ خط حضرت عثمانؓ کی جانب سے جاری ہوا تھا، اور یہ خط عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے نام تھا، جو اس وقت مصر کا گورنر تھا اور حضرت عثمانؓ اور مروان کو معلوم تھا کہ وہ اس وقت مصر میں نہیں ہے اس کو مدینہ آنے کی اجازت دی گئی تھی،

(باقی ص۲۱۸ پر)

امیر المؤمنین عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ اور اُن کی شہادت
حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کا اُن کی حمایت میں اعلیٰ ترین کردار

خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر اس کے بعد حملوں اور شورشوں کی بوچھار پڑ گئی، ایسی شورش جو کسی حال میں بھی خلافت اور خلیفہ کے معاملہ میں روا نہیں ہو سکتی، اور ایسے زمانہ میں جو عہد نبوی اور حضرات شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے اس قدر قریب ہو، مگر بقول العقّاد کے "یہ ناخدا ترس اور ہنگامہ پسند لوگوں کی شورشوں میں سے ایک شورش تھی، جن سے کچھ بھی بعید نہ تھا"۔

باغیوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو گھر کے اندر محصور کر دیا اور ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی اور گھر کو گھیر لیا، بہت سے صحابہ گھروں سے نکلے نہیں، صحابہ کرام کے صاحبزادوں کی ایک جماعت حضرت عثمانؓ کے گھر گئی جس میں حضرات حسن حسین، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم تھے، وہ سب حضرت عثمانؓ کی طرف سے باغیوں سے بحث کرتے سمجھاتے اور حضرت عثمانؓ کے لئے سینہ سپر تھے کہ کوئی ان کے مکان کے اندر نہ جانے پائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد میں آنا چھوڑ دیا، یہ محاصرہ آخر ذیقعدہ سے ۱۸ ذی الحجہ روز جمعہ تک ختم نہیں ہوا، اس سے ایک روز پہلے ان لوگوں سے جو اُن کے مکان پر موجود تھے، جن میں مہاجرین و انصار دونوں تھے، اور ان کی تعداد سات سو کے قریب تھی، اور جن میں حضرات عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، حسنؓ، حسینؓ، ابوہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ اور ان کے

(باقی صفحہ ۲۱۷ کا) ہے، اور اُن دونوں کو معلوم تھا کہ وہ مصر سے نکل چکا ہے (الطبری ۵: ۱۲۲) اس وقت الفسطاط (مصر) کی حکومت پر قابض محمد بن ابی حذیفہ تھے (حاشیہ کتاب "العواصم من القواصم" از قاضی ابی بکر (ابن العربی) صفحہ ۱۱۱)

غلاموں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو باغیوں کے روکنے کے لئے (اگر ان کو اجازت ہوتی) کافی تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس پر بھی میرا کوئی حق ہے، اس کو قسم دیتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اپنے گھر چلا جائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اعیانِ صحابہ اور ان کے صاحبزادوں کی بڑی جماعت تھی، انھوں نے اپنے غلاموں سے بھی کہا، جو تلوار میان میں کرلے وہ آزاد ہے، اور روایت ہے کہ آخری شخص جو حضرت عثمان غنی رضؓ کے پاس سے نکلا وہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ تھے[1]۔

البلاذری نے "انساب الاشراف" میں لکھا ہے کہ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تیر سے وار کیا جس سے حضرت حسن جو اس وقت ان کے دروازہ پر تھے، خون سے رنگین ہو گئے، اور حضرت علی رضؓ کے غلام قنبر زخمی ہو گئے۔

ابو محمد الانصاری سے روایت ہے کہ میں نے خود حضرت عثمان رضؓ کو گھر کے اندر اس حال میں دیکھا کہ باہر کھڑے ہوئے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اُن کی مدافعت کر رہے تھے، اور اس میں حضرت حسن رضؓ زخمی ہو گئے اور میں ان لوگوں میں ہوں جو ان کو زخمی حالت میں اٹھا کر لائے[2]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضؓ کی طرف سے مدافعت اور باغیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اجازت طلب کی تو حضرت عثمان رضؓ نے کہا: "میں خدا کا واسطہ اس شخص کو دیتا ہوں جو اللہ کو مانتا اور اس کو حق سمجھتا اور اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ میرا اس پر کوئی حق بھی ہے، ایک پچھنے کے لگانے بھر بھی میری خاطر خون نہ بہائے، حضرت علی رضؓ نے دوبارہ اجازت طلب کی اور انھوں نے دوبارہ یہی جواب دیا، پھر وہ (حضرت علی رضؓ) مسجد میں آئے، اذان ہوئی، لوگوں نے کہا: "ابا الحسن! آگے بڑھئے اور نماز پڑھائیے"! حضرت علی رضؓ نے جواب دیا:

---

[1] ابن کثیر ج ۷، ص ۱۸۱-۱۸۲ (باختصار) [2] انساب الاشراف ج ۵ ص ۹۵-۹۶ طبع جدید۔

"امام جب کہ خانہ قید ہے، میں نماز نہیں پڑھاؤں گا، لیکن میں تنہا اپنی نماز پڑھوں گا"
چنانچہ تنہا نماز پڑھ کر اپنے گھر واپس گئے۔[1]

حضرت عثمانؓ کی ناکہ بندی اور بھی سخت ہوگئی، اور اُن کے لئے باہر سے کسی قسم کا رابطہ رکھنے کا موقعہ نہیں دیا گیا، اُن کے پاس جو پانی تھا، وہ ختم ہوگیا، مسلمانوں سے انھوں نے پانی طلب کیا، حضرت علیؓ خود اپنی سواری پر گئے اور پانی کا ایک مشکیزہ لے کر اندر داخل ہوئے، بڑی مشقت سے وہاں پہونچ سکے، باغیوں نے اُن کو بُرا اور سخت وسست کہا اور اُن کی سواری کے جانور کو بھگا دیا۔[2]

البلاذری نے "انساب الاشراف" میں لکھا ہے :۔

"یہ بات جب حضرت علیؓ کو معلوم ہوئی تو آپ نے تین مشکیزے پانی سے بھرے ہوئے بھیجے، بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے متعدد موالی اُس کو پہنچانے میں زخمی ہوئے، ورنہ وہ پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔[3]

شیعی کتابوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً "ناسخ التواریخ" اور "الفوائد الرضویہ" مطبوعہ ایران وغیرہ۔

روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا: قبل اس کے کہ کوئی آپ پر حملہ آور ہو، میرے ساتھ شام نکل چلیے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوار (ہمسائگی) کو میں کسی قیمت پر نہیں دے سکتا، خواہ میری گردن کا تار تار کاٹ دیا جائے، حضرت معاویہؓ نے کہا تو پھر ایسا ہو سکتا ہے کہ میں شام سے ایک فوج بھیج دوں جو مدینہ میں آپ کی حفاظت کے لئے رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کیا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پڑوسیوں پر رزق تنگ کروں کہ باہر سے آئی ہوئی فوج ان کے ساتھ آ کر رہے (اور اہلِ مدینہ کی جو خدمت ہوتی ہے اس میں حصہ بٹائے) اور اہلِ ہجرت و نصرت کے لئے تنگی کا باعث ہو، حضرت معاویہؓ نے کہا،

---

[1] "عثمان بن عفان ذو النورین" (مصنفہ استاذ صادق عرجون) ص۲۱۸-۲۱۹

[2] ابن کثیر ج ۷ ص۱۸۷ [3] انساب الاشراف۔ ج ۵ ص۶۸-۶۹

واللہ اے امیر المؤمنین آپ میری بات نہیں مانتے تو آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اور یہ ظالم آپ کو چھوڑیں گے نہیں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا: "حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ"[1]

حضرت عثمانؓ کے مکان میں جو لوگ موجود تھے ان میں سے اور ناخدا ترس حملہ آوروں میں سے ایک جماعت قتل ہوگئی، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو کئی زخم لگے اور حضرت حسن بن علیؓ بھی گھائل ہوئے[2]۔

حملہ آوروں نے حضرت عثمانؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا: یہ تم لوگوں کا معاملہ ہے جس کو چاہو امیر بنالو' اور فرمایا رہا یہ کہ میں منصب خلافت سے دستبردار ہو جاؤں تو میں وہ خلعت (از خود) اُتارنے کے لئے تیار نہیں، جو اللہ نے مجھے پہنائی ہے[3]۔

یہ بات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق فرمائی تھی، آپؐ نے ان سے فرمایا تھا: "اے عثمان اللہ شاید تمھیں ایک خلعت پہنائے اگر لوگ تم سے اس کے اتارنے کا مطالبہ کریں تو نہ اتارنا"[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نائلہ کہتی ہیں، جس روز حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا اس دن وہ روزہ سے تھے[5]۔

حضرت نافع حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے صبح ہی لوگوں سے کہا تھا کہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا، اُسی روز وہ شہید ہوئے[6]، بوقتِ شہادت اُن کے سامنے مُصحف تھا، اور وہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے[7]۔

اُن کی شہادت جمعہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو واقع ہوئی۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک للطبری ج ۵ ص۱۰۱، [2] شرح نہج البلاغہ ۱/ ۲۸۶، [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص۱۸۴، [4] جامع ترمذی کتاب المناقب "باب فی مناقب عثمان" حدیث نمبر ۳۷۰۵ [5] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص۱۸۳ [6] ایضاً ص۱۸۲ [7] ایضاً ص۱۸۴-۱۸۵ (باقی ص۲۲۴)

الحافظ تقی الدین السُّبکی م ۷۵٦ھ نے کہا :۔

"ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امامِ برحق تھے، اور مظلوم شہید تھے، ان کے خون سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو محفوظ رکھا، ان کے قتل کا ذمّہ دار شیطان خبیث ہے، اس کا کوئی ثبوت ہم کو نہیں ملتا کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی اُن کے قتل کئے جانے کو پسند کیا ہو بلکہ جو بات پایۂ ثبوت تک پہنچی ہے، وہ یہی کہ ہر ایک نے اس کو ناپسند کیا۔[1]"

(باقی ص۲۲۱ کا) بعض معاصر مصنفوں کو یقین ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش میں یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کا ہاتھ بھی تھا، اور جیسا کہ لکھنے والوں کا خیال ہے ــــ خود کعب الاحبار اس میں ملوّث تھے، ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری اپنی کتاب (اثر اہل الکتاب) میں لکھتے ہیں :۔

"خلیفۂ ثالث حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں اُمّت جس ابتلاء کا شکار ہوئی وہ فتنے اور سازشیں تھیں، جن کا پلان بنانے میں یہود و نصاریٰ اور اسلامی سلطنت کے سب ہی دشمن شریک تھے۔" (ص۲۴۷)

مزید لکھتے ہیں :۔

"جب کعب نے مدینہ اور شام میں فضا تیار کر لی، عبداللہ بن سبا دشمن طاقتوں کے تعاون سے سازش کا جال بُننے میں سرگرم ہو گیا، چنانچہ اس نے مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے پروپگنڈہ کی ایک منظّم مہم چلائی اور چند ناخدا ترس (دل کے بیمار) افراد کو مسلم علاقوں میں بھیجا، جن کی دعوت قبول کرنے والے بصرہ، کوفہ اور مصر میں مل گئے۔" (ص۲۴۹)

[1] "التقریر والتحبیر شرح التحریر" از علامہ ابن امیر الحاج ۔ ج ۲ ص۲٦ طبع بولاق ۱۳۱٦ھ

حضرت عثمانؓ اور اُن کی سیرت میں عقیدہ کی گہرائی اور اسلام میں اُن کا بلند مقام

اس ناگوار، مسلمانوں کے لئے رسوا کن، اور تکلیف دہ واقعات پر مشتمل باب کو ہم استاذ عباس محمود العقّاد کے اس تبصرہ پر ختم کرتے ہیں، جو موصوف نے حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت اور اس فتنہ کے موقع پر اُن کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:۔

"خلیفہ عثمانؓ کی ذات میں عقیدہ کی گہرائی ایک فرد واحد کی حیثیت سے کہیں زیادہ واضح اور نمایاں ہے، بہ نسبت ان لوگوں کے جو دوسرے شہروں سے اُن کا محاسبہ ومناظرہ کرنے آئے تھے، عثمانؓ چند گنے چنے مستثنیٰ شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے حالات زمانۂ جاہلیت کے دیکھئے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ وہ کس درجہ اسلام میں بدل گئے تھے، اور اس بلند مقام کو پہونچ گئے تھے، جس کا تصوّر مشکل ہے۔

اپنی ذات کا محاسبہ اور ایسے کام جن سے کسی انسانی جان کو ضرر پہونچے اس سے غایت درجہ کی احتیاط، خواہ وہ اپنی ذات کی حفاظت کے لئے ہو یا قریب ترین شخص کی مدافعت کے لئے ہو، ایک بے نظیر ایمانی قوت اور استقامت کا نمونہ ہے، جس وقت اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ قتل کر دیئے جائیں گے، اس وقت انھوں نے اپنے گھر میں کسی کو نہیں رہنے دیا، تاکہ جو لوگ ان کو گھیرے ہوئے تھے، اور گھر میں اُن کو شہید کرنے کے لئے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے، ان سے کسی کو گزند نہ پہونچے، جب اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو انھوں نے دستبرداری سے انکار کر دیا، ان کا یہ انکار اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کے پاس کوئی دولت رکھی تھی، جس کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے تھے، اس لئے کہ زندگی سب سے

قیمتی شے ہے اور وہ خطرہ میں پڑ گئی تھی، بلکہ اس کے برعکس تمام مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ انھوں نے جب دنیا سے سفر اختیار کیا، اُس وقت اُن کے پاس اس سے بہت کم سرمایہ تھا جس قدر خلیفہ ہونے کے دن تھا، انھوں نے خلافت سے دستبرداری سے انکار اس وجہ سے کیا کہ ان کو معلوم تھا کہ اس کے بعد بڑے پیمانہ پر فساد و قتال شروع ہو جائے گا، جیسا کہ انھوں نے کئی مرتبہ اس کا اظہار کیا تھا، اور کہا کہ انھیں ڈر ہے کہ آج جو لوگ اُن کی زندگی سے اُکتانے کا اظہار کر رہے ہیں، ان کے بعد تمنا کریں گے کہ کاش اُن کا عہد ایک سو سال رہتا، لہٰذا وہ اپنی پسند سے اس دہشت ناک انجام کے ذمہ دار نہیں بن سکتے۔

اگر ہم حادثات کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کریں اور صرف ابتدائے اسلام کی تاریخ اس لحاظ سے دیکھیں کہ یہ اصولوں اور قدروں کی تاریخ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدہ اور اس کے نفسیاتی اثرات کا جائزہ لینے والے کے دماغ پر ایک چوٹ سی لگتی ہے (جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی خاطر حضرت عثمانؓ نے اتنی بڑی قربانی دی) لیکن اگر ہم ان حادثات کو معیاروں اور قدروں کی میزان پر تولیں تو محسوس ہوگا کہ تاریخ کبھی بھی کسی زمانہ میں بھی حوادث سے خالی نہیں رہی ہے، اختلاف کا ہونا سب سے بڑا فساد نہیں جس کا سابقہ انسانی ضمیروں کو پڑتا ہے، دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ اصول و اقدار کی حفاظت کے لئے کس قوتِ ایمانی اور استقامت کا ثبوت دیا گیا اور یہ حضرت عثمانؓ کے واقعۂ شہادت میں روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔[۱]"

استاذ عقاد "عبقریۃ عثمانؓ" کے آخر میں لکھتے ہیں:-

---

[۱] العبقریات الاسلامیہ ص ۸۰۷-۸۰۹

"اگرچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا خاتمہ ایک نقصانِ عظیم تھا، لیکن دوسرے عظیم نقصانات کی طرح ایک فائدہ بھی اپنے دامن میں پوشیدہ رکھتا تھا، جو مصیبت کی سیاہ گھڑیوں کے گزر جانے کے بعد کسی فرد یا جماعت کی زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔

حق پر ایمان لانے والے جن کا ایمان پختہ نہیں ہے اُن کو دکھا دیا گیا کہ وہ ایسے ولیِ امر (حاکمِ اعلیٰ) کا محاسبہ کر سکتے تھے، جس کے حدودِ سلطنت چین کی سرحدوں سے لے کر بحرِ ظلمات تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس حادثہ میں یہ سبق ہے کہ ایمانِ صادق جب اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو ایک نوّے سالہ بوڑھا شخص جس کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا اور گھر میں محصور کر دیا گیا ہے، وہ تنہا اور بے یار و مددگار رہتا ہے لیکن اپنے لئے کسی کی جان کو خطرہ میں نہیں ڈالتا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اس کے ہزاروں جانثار اس جگہ جہاں پانی کا ایک قطرہ ملنا دشوار ہو گیا تھا خون کی ندی بہا سکتے تھے۔"[1]

---

[1] ایضاً ص ۸۳
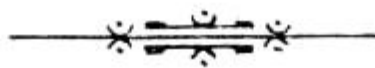
باب ششم

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اپنے دورِ خلافت میں

خلافتِ علیؓ کا زمانہ، پیچیدگیاں اور دشواریاں، واقعہ جمل وجنگ صفّین تحکیم، خوارج اور سبائی فرقوں کا ظہور

حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کئی روز تک اہلِ مدینہ اور اس کے حاکم و منتظم غافقی بن حرب کو انتظار رہا کہ مسلمانوں کی سربراہی کے لئے کون آگے بڑھتا ہے[1]، مصریوں کا حضرت علیؓ پر اصرار تھا، اور حضرت علیؓ کو اُس سے گریز تھا، وہ باغوں کی چہار دیواری میں روپوش ہو رہے تھے، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس مشکل کو حل کریں، حضرت علیؓ ہی سے بار بار رجوع کیا جا رہا تھا، ان کے اصرار پر آپ نے بیعت قبول کرلی، بیعت سے پہلے اہلِ مدینہ کی رائیں معلوم کرلی گئی تھیں، ہر شخص کہہ رہا تھا کہ علیؓ کے علاوہ کوئی اس منصب کے لائق نہیں ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس وقت اُمّتِ اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالنے والا، خلافتِ راشدہ کی نازک ذمّہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونے والا، اور اس کے لئے ہمہ گیر صلاحیتوں اور کمالات کا حامل ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بعد، علیِّ مرتضیٰؓ سے زیادہ کوئی نہ تھا۔

راوی کا بیان ہے:۔

"حضرت علیؓ مسجد میں آئے جسم پر چادر اور خز (بھیڑ کے اون کا بنا ہوا

---

[1] اس امر میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ کس روز پیش آیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ذی الحجہ کی انیسویں تاریخ تھی ان کے الفاظ میں "ذی الحجہ کی اٹھارہ راتیں گزر چکی تھیں" اور یہی بات عام طور پر مشہور ہے، دوسرے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ ایامِ تشریق میں پیش آیا، اس کو ابن جریر نے روایت کیا ہے، اور بعض نے کہا ہے جمعہ کا دن تھا اور ذی الحجہ کے تین روز گزر چکے تھے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ عین قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) یہ حادثہ پیش آیا جیسا کہ ابن عساکر نے لکھا ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۹۰

کپڑا) کا عمامہ تھا، ہاتھ میں اپنی جوتیاں لئے ہوئے تھے، اپنی کمان (قوس) پر ٹیک لگائے ہوئے منبر پر چڑھے، تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ واقعہ روز جمعہ ۲۴ر ذی الحجہ ۳۵ھ کا ہے"۔[1]

خلافت کے بعد حضرت سیدنا علیؓ کا پہلا خطبہ

جمعہ کا دن تھا، آپ منبر پر چڑھے، جن لوگوں نے اب تک بیعت نہیں کی تھی، انھوں نے بیعت کی، یہ جمعہ اس دن پڑا تھا، جب ماہ ذی الحجہ کو ختم ہونے میں پانچ روز رہ گئے تھے، خلافت کے بعد آپ کا یہ پہلا خطبہ تھا، حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو ہادی بنا کر بھیجا ہے جو خیر و شر کو وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے، لہذا خیر کو اختیار کیجیے اور شر سے کنارہ کش رہیے، اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کو حرمت کا درجہ دیا ہے، ان میں سب سے فائق حرمت مسلمان کی ہے، توحید و اخلاص کے ذریعہ مسلمانوں کے حقوق کو اللہ نے مضبوطی سے مربوط کر دیا ہے، مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام مسلمان محفوظ رہیں، اِلّا یہ کہ دین و احکامِ شریعت ہی کا یہ تقاضا ہو کہ مسلمان کا احتساب کیا جائے اور اس پر قانون شرعی جاری کیا جائے، کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو ایذا پہونچائے، اِلّا یہ کہ ایسا کرنا واجب ہو، عوام و خواص دونوں کے حقوق ادا کرنے میں عجلت سے کام لیجئے، لوگ آپ کے سامنے ہیں، اور پیچھے قیامت ہے، جو آگے بڑھ رہی ہے، اپنے آپ کو ہلکا پھلکا رکھئے کہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۲۶-۲۲۷ (باختصار)

منزل تک پہونچ سکیں، آخرت کی زندگی لوگوں کی منتظر ہے، خدا کے بندوں اور اُن کی سرزمین کے حقوق کی ادائگی کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرتے رہئے، بہائم اور زمین کے بارہ میں بھی (قیامت میں) آپ سے سوال ہوگا، پھر میں کہتا ہوں کہ اللہ کی اطاعت کیجئے، اور اس کی معصیت و نافرمانی سے بچئے، اگر آپ خیر کا کام دیکھیں اس کو اختیار کیجئے اور اگر شر دیکھیں تو اس کو چھوڑ دیں:۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝[1]	اور (اس وقت کو) یاد کرو جب تم زمین (مکہ) میں قلیل اور ضعیف سمجھے جاتے تھے، اور ڈرتے رہتے تھے، کہ لوگ تمھیں اُڑا (نہ) لے جائیں (یعنی بے جان و مال نہ کر دیں) تو اس نے تم کو جگہ دی، اور اپنی مدد سے تم کو تقویت بخشی اور پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں، تاکہ (اس کا) شکر ادا کرو۔

یہ خطبہ اپنے ٹھیک وقت پر اور مناسب ترین مقام پر دیا گیا، امیرالمؤمنین نے اپنے مخاطب لوگوں کی دکھتی رگ پکڑی اور نشانہ صحیح جگہ پر لگایا، تاریخ کے اس نازک مرحلہ میں مسلمان سب سے زیادہ جس ابتلاء سے گزر رہے تھے، وہ یہ تھا کہ حرمتِ مسلم کی کوئی اہمیت اُن کے سامنے نہیں رہ گئی تھی، خونِ مسلم کی ارزانی اور اس کے وجود کی بے وقعتی حد کو پہونچ گئی تھی، امیرالمؤمنین حضرت عثمانؓ بن عفان رضی اللہ عنہ اس فتنۂ شہر آشوب کا ہدف بنے،

---

[1] سورۃ الأنفال آیت ۲۶ ۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۲۷-۲۲۸

سارے مسلمانوں کی موجودگی میں اُن کی آنکھ کے سامنے، مدینۃ الرسول میں، اور روضۂ نبوی اور مسجد نبوی کے پہلو میں یہ حادثۂ جانکاہ پیش آیا، لہذا جو شخص اُن کے بعد خلافت کے منبر پر آیا تھا، اس کا فرض تھا کہ "حرمتِ مسلم" کے عنوان کو اپنے خُطبہ کا مرکزی مضمون بنائے، اللہ کا خوف دلائے، اللہ سے ڈرتے رہنے کی دعوت دے اور بتائے کہ اُس کے بندوں اور اُس کے عطا کئے ہوئے ممالک اور قوت و اقتدار کی کیا حُرمت و قیمت ہے، یہاں تک کہ اللہ کے بندوں پر جانوروں اور بے زبان زمین کا بھی حق ہے۔

آپ نے حکمت و بلاغت کے ساتھ اس امر کی طرف واضح اشارہ دیا کہ نئے عہدِ خلافت کا کیا اصولی کردار اور "منشور" ہو گا، آپ نے فرمایا: "اگر آپ خیر (حق و صداقت پر مبنی بات) دیکھیں اس کو اختیار کریں، اور جو شر (ناجائز اور غلط بات) دیکھیں اُس سے اعراض کریں، اس کے بعد آپ نے جو آیت تلاوت کی اس کا استحضار اُس وقت بہت ضروری تھا، تاکہ مسلمان اپنی پہلی حالت اور موجودہ حالت کا موازنہ کر سکیں، ایک وہ دن تھے، جب یہ مسلمان تعداد میں کم تھے، مادّی لحاظ سے کمزور تھے، معاشرت و تمدّن کے لحاظ سے پست تھے، دنیا میں کوئی اُن کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، جیسے گوشت کا پارچہ کسی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہو، اور اُس کو پرند جھپٹ کر لے اُڑیں، اور اب یہی وہ لوگ تھے جن کو قوت حاصل تھی، وسیع اراضی پر قابض تھے، امن و سلامتی حاصل تھی، خوشحالی اور فارغ البالی نصیب تھی، اللہ نے اُن کو قوت و اقتدار عطا فرمایا، اُن کا طوطی بولنے لگا، اور اُن کا عَلَم شوکت و اقبال بُلند ہوا، ہر طرح سے اللہ نے اُن کو نوازا، اُن کے جھنڈے برّ و بحر پر لہرا رہے تھے، اور دنیا اور اہلِ دنیا کے قلوب پر اُن کی ہیبت طاری تھی۔

حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ اور اس عہد کی پیچیدگیاں اور دشواریاں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت ایسے وقت میں ہوئی جو تاریخ کا انتہائی نازک وقت تھا، اور زیادہ سے زیادہ پیچیدگی اور مشکلات کا جو تصوّر کیا جا سکتا ہے، اس کا سامنا تھا، اور اُس کے لئے سخت امتحان تھا، جس کے ذمہ حکومت کی سربراہی اور معاشرے کی قیادت و سرپرستی کا بار آیا تھا۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت اس وقت کی جا رہی ہے جس وقت خلیفۂ سابق حضرت عثمان بن عفّانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا، اور وہ بھی انتہائی بدنمائی، بے رحمی اور وحشیانہ شکل میں، جس میں ناپسندیدگی اور نفرت کے عناصر کے ساتھ ساتھ ضمیر و احساس کو بھی اُبھارنے کے اسباب تھے، افواہیں پھیل رہی تھیں، قیاس آرائیوں کا زور تھا، لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے، آپس میں تبصرے کرتے، آگے کیا ہونے والا ہے؟ اس سے متعلق خواہشات وقیادت کا اظہار کرتے، رنگ برنگ کے مطالبات اور توقّعات ظاہر کی جا رہی تھیں، جس محفل میں جائیے جس مجلس میں بیٹھئے، جس سے ملئے یہی موضوع گفتگو تھا، اور اسی کا چرچا تھا۔

ان حالات میں قِصاص کے مطالبہ کی آواز اٹھتی ہے، اور بعض ایسے حلقوں سے اٹھتی ہے، جہاں حادثہ کے زمانہ میں کسی نے اس خونِ ناحق کے خلاف انگلی بھی نہیں ہلائی تھی، خون تو الگ رہا پسینہ کا قطرہ بھی نہیں بہایا تھا، یہ لوگ مصر و عراق کے باشندے اور دیہی (بدوی) قبائل کے افراد تھے۔

مختلف زمانوں اور ملکوں میں دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی انتشار انگیز غیر معمولی حادثہ پیش آتا ہے، تو معاشروں کا حال کچھ اسی قسم کا ہو جاتا ہے، جب بدامنی اور افراتفری کا دور ہوتا ہے، اور کوئی ایسی مُہم سامنے نہیں رہتی جو لوگوں کو یکجا کر کے اُن کی توجّہ کو ایک رُخ پر لگا دے

(مثلاً جنگ یا کسی نئے ملک کی فتحیابی اور دوسرے سنجیدہ تعمیری مقاصد جو قوم کی توجہات کا مرکز بن سکیں) مگر اس وقت اس طرح کی کوئی بات نہ تھی، ایک خلیفۂ وقت شہید ہو چکا تھا، اور نئے خلیفہ کی حکومت کا استحکام نہیں ہوا تھا، اسلامی معاشرہ ایک خلاء کے دور سے گزر رہا تھا، اور قوموں و معاشروں کی زندگی میں خلاء سے بڑھ کر کوئی چیز خطرناک اور مضرت رساں نہیں ہوتی، خاص طور پر جب مملکت یا معاشرہ خطرات سے گھرا ہوا ہو، اور بڑے بڑے دشمن اس کی گھات میں ہوں۔

استاذ عباس محمود العقاد نے اس کٹھن اور انتہائی پیچیدہ صورتِ حال پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے جس کا سامنا حضرت علی بن ابی طالبؓ کو مسلمانوں کے ایک خلیفہ اور ولیِ امر ہونے کی حیثیت سے کرنا پڑ رہا تھا، اگرچہ وہ (حضرت علیؓ) قطعاً بے گناہ تھے، اور اس حادثہ کی کوئی ذمہ داری ان پر نہ تھی، کیونکہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے دفاع میں جو کچھ کہا اور کیا وہ عمر رسیدہ صحابہ کے درمیان سب سے زیادہ تھا، اور ان کے صاحبزادے حسنؓ کا صحابہ کی نوجوان نسل میں حضرت عثمانؓ کے دفاع میں سب سے بڑا حصہ تھا۔

العقاد لکھتے ہیں :-

"حضرت علیؓ کی خلافت کے لئے بیعت اس حادثہ کے بعد کی گئی، جو تاریخ اسلام کے خونی حوادث میں سب سے زیادہ دردناک واقعہ تھا یعنی عثمان بن عفانؓ کی شہادت، اور وہ بھی اس وقت جب کہ وہ بڑھاپے کی آخری منزل میں تھے، اور جب کہ دشمنوں نے گھر کی چہار دیواری میں انھیں محصور کر دیا تھا، اور اگر قاتل چند دن اور تاخیر کرتے تو پیاس ہی سے ان کا کام تمام ہو جاتا۔

اس حادثہ کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ تھا کہ یہ ایک ایسی آزمائش اور

پیچیدہ صورتِ حال تھی جس کا مداوا اختیار سے باہر تھا، وہ ایک ایسا تقدیری امر تھا جس سے نمٹنے کا کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں تھا، اس حادثہ کی ذمّہ داری جن پر عائد ہوتی تھی، (قاتلانِ عثمان یا ان کے حامی) وہ کثیر التعداد اور منتشر تھے، مؤیّدین اور مخالفین کے بھی بڑے بڑے گروہ تھے، اگر ایک خاموش ہوتا تو دوسرا متحرّک و سرگرم ہوتا، اگر وہ مصیبت دور ہوتی جس پر اختیار تھا تو وہ مصیبت باقی رہتی جس پر اختیار نہیں تھا، حُسنِ نیت اور سوءِ نیّت دونوں برابر کی طاقتیں تھیں جو اپنا کام کر رہی تھیں، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض ایسی باتیں جو اس مصیبت کو عُجلت کے ساتھ سامنے لے آئیں، ان میں سے کچھ ایسے اقدامات تھے، جو خود حضرت عثمانؓ سے تعلق رکھتے تھے، ممکن ہے کہ انھوں نے وہ اقدامات سوچ سمجھ کر اور غور کرنے کے بعد کئے ہوں لیکن ان کا ردِّ عمل قدرتی تھا، اور نتائج میں مخالفین کی سرگرمیوں سے کم نہ تھا۔"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"حضرت علیؓ پر یہ ذمّہ داری آپڑی تھی کہ گھوڑے کی لگام اتنی مضبوطی سے پکڑیں کہ سرکنے نہ پائے، اور اس کے ساتھ ساتھ گھوڑے کے راستہ میں جو رکاوٹیں اور گھاٹیاں تھیں، ان کو بھی دور کریں تاکہ وہ اگر اپنی تیزی سے چلنا چاہے تو کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔"[2]

دوسری مشکل یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں جو لوگ مُلوّث تھے، اور جنھوں نے اس جُرم کا ارتکاب کیا تھا، اُن کی مکمل شناخت نہیں تھی کہ دیکھ کر یا شرعی شہادت کی بنیاد

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ صفحہ ۸۸۴   [2] ایضاً صفحہ ۸۸۵

پر ان کی گرفت کی جائے یا ان پر قصاص جاری کیا جائے، یہاں تک کہ خود حضرت عثمانؓ کی اہلیہ یقینی طور پر ان لوگوں کا تعیّن نہیں کر سکتی تھیں۔

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ صورتِ حال العقّاد کے بقول یہ تھی کہ:-

"امام (حضرت علیؓ) نے ایک بار قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لینے کی بات کی تو یکبارگی پوری فوج جس کی تعداد دس ہزار تھی، نیزہ اٹھا کر کھڑی ہو گئی، اور علانیہ پکار اٹھی کہ ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں، جو قصاص لینا چاہتا ہو وہ ہم سب سے قصاص لے[1]"

وہ مزید لکھتے ہیں:-

"امام (حضرت علیؓ) سے جو بھی حد قائم کرنے کا مطالبہ کرتا اس سے وہ کہتے: "جو تم جانتے ہو، اس سے میں ناواقف نہیں ہوں لیکن میں کس طرح ان لوگوں سے نمٹوں جو ہم پر قابو رکھتے ہیں، اور ہم ان پر قابو نہیں رکھتے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ تمہارے غلام بھی ہو گئے ہیں، اور جن سے آکر تمہارے اعراب (بدو) بھی مل گئے ہیں، اور وہ سب تمہارے سامنے ہیں، جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں، کیا تم لوگ اس بات کی گنجائش دیکھتے ہو کہ اس پر قابو پا لیا جائے اور تم لوگ جو چاہتے ہو وہ کیا جا سکے؟

حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے والے اگر صحیح اور قریب ترین اور سہل راستہ اختیار کرتے تو وہ یہ تھا کہ ولیِ امر (خلیفہ) کی تائید کرتے تاکہ وہ حدود قائم کرنے پر قادر ہو، اس کے بعد حق و انصاف کے ساتھ

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۹۲۴

حکم شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرتے"[1]

حافظ ابن حجر "الاصابہ" میں لکھتے ہیں:-

"حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ پہلے قصاص کے طالب ولیِ امر کی اطاعت کریں اس کے بعد خونِ عثمان کا وارث اپنا دعویٰ پیش کرے اس وقت شریعت مطہرہ کے مطابق حکم کا نفاذ کیا جائے گا، اُن کا مخالف گروہ یہ کہتا تھا کہ اُن کا پتہ چلایا جائے اور اُن کو قابو میں لاکر دھا دھند سب کو قتل کر دیا جائے، حضرت علیؓ کی رائے میں قصاص کا اجرا بغیر کسی دعویٰ اور بغیر کسی دلیل اور حجّت کے صحیح نہیں تھا، اور دونوں فریق مجتہد تھے"[2]

صحابۂ کرام میں کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو کسی کی طرف سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور حضرت عمارؓ کے قتل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اہلِ حق کا شروع میں کچھ اختلاف تھا لیکن الحمد للہ بعد میں سب اس پر متفق ہیں[3]۔

مرکزِ خلافت کا کوفہ[4] منتقل ہونا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کوفہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا (جو عراق میں ہے) اور

---

[1] العبقریات الاسلامیہ ص۹۲۴، [2] الاصابہ فی تمییز الصحابہ، از ابن حجر ص۵۰۸
استاذ محمد صالح احمد الغرسی اپنی کتاب "فصل الخطاب فی مواقف الاصحاب" میں لکھتے ہیں کہ "خود حضرت معاویہ کو جب مکمل اقتدار حاصل ہو گیا تو انھوں نے بھی وہی کیا جو حضرت علیؓ شروع میں کر رہے تھے، اور اُن کے لئے بھی کسی کو بغیر شرعی ثبوت کے قتل کرنا ممکن نہیں ہوا" (ص۱۲۳)

[3] الاصابہ فی تمییز الصحابہ لابن حجر العسقلانی ج ۲ ص۵۰۸، [4] یہ شہر جنگ قادسیہ کے بعد سعد بن وقاص نے آباد کیا تھا، اس شہر سے بہتیرے فقیہ، محدث اور باکمال علمائے نحو پیدا ہوئے، بصرہ کے ساتھ یہ شہر عربی ثقافت کا مرکز تھا، عباسیوں نے بغداد سے پہلے اسی کو دار الخلافہ بنایا تھا۔

یہی آپ کی تمام فوجی سرگرمیوں اور انتظامی و تربیتی نظام کا مرکز تھا، قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ امیر المؤمنین نے کوفہ کو اپنی اقامت کے لئے اور عالمی خلافتِ اسلامیہ کا پایۂ تخت بنانے کے لئے کیوں منتخب کیا، یہ حیثیت تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مدینہ منورہ کی تھی۔؟

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا صرف اس لئے کیا کہ مدینہ منورہ کو جو ان کا محبوب شہر تھا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دارالہجرت اور مدفن مبارک تھا، اس کو داخلی جنگوں اور فوجی تنازعات سے دور اور الگ تھلگ رکھیں، کیونکہ اندرونی خلفشار شروع ہو چکا تھا، اور حالات کے رخ سے پتہ چل رہا تھا کہ ایسا ہوگا، لہذا مسجد نبوی، حرم ثانی اور آرام گاہ رسول اکرم کے ادب کا تقاضہ تھا کہ وہ کسی قسم کے فتنہ کا مرکز نہ بنے، حضرت علیؓ جیسے شخص کو اس معاملہ میں ذکی الحس اور صاحبِ غیرت ہونا ہی چاہیئے تھا، اور عملاً وہی ہوا جس کا خطرہ تھا، چند برسوں بعد یزید کے عہد میں حرّہ کا واقعہ ہوا جس نے مسلمانوں کے احساسات کو بُری طرح مجروح کیا، اور مدینۃ الرسول کی بے ادبی اور وہاں کے باشندگان کی بے توقیری ہوئی، لیکن استاد عقاد نے اس کی جو توجیہہ کی ہے اس میں وہ جغرافیائی مصلحت اور انتظامی و ثقافتی ضرورت پر زور دیتے ہیں، لکھتے ہیں :-

"حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عالمی امامت کا مرکز کوفہ کو بنایا یا وہ مصلحت و ضرورت کے عین مطابق تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت اس وقت جس مرحلہ میں تھی، اس میں ضرورت تھی کہ مرکز ایسے مقام پر ہو جہاں تمام

توں آکر ملتی ہوں، اور ہند و فارس و یمن، عراق و شام کی باہمی تجارتوں کے لئے مشترکہ گزرگاہ ہو، چنانچہ کوفہ ثقافتی پایۂ تخت بھی تھا، جہاں کتابت، زبان، قراءت اور انساب اور فنون شعر و داستان گوئی اس زمانہ میں کمال کے درجہ میں تھا، یہ مقام اس وقت کے لحاظ سے دارالخلافہ بننے کی تمام خصوصیات رکھتا تھا[۱]۔"

اختلافات کی ابتداء اور جنگِ جمل

جب حضرت علیؓ کی بیعت قرار پاگئی، ان کے پاس طلحہؓ اور زبیرؓ اور دوسرے صحابہ کے سرگروہ آئے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ کے قتل کا بدلہ اور حدود قائم کرنے کا مطالبہ کیا، حضرت علیؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ یہ لوگ چند نفر نہیں ہیں، ان کے بہت سے مددگار اور پشت پناہ ہیں، اور یہ کام اسی دن انجام دینا ممکن نہیں ہے[۲]۔

ابن سعدؒ "الطبقات الکبریٰ" میں ان کبارِ صحابہ کے جنھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کی تھی، اور ان تمام صحابہ کے نام لینے کے بعد جو مدینہ منورہ میں موجود تھے لکھتے ہیں:۔

"وہ دونوں (یعنی طلحہؓ اور زبیرؓ) مکہ گئے جہاں حضرت عائشہؓ موجود تھیں[۳]، پھر مکہ سے دونوں چلے اور حضرت عائشہؓ کو ساتھ لئے بصرہ آئے اور حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگے، حضرت علیؓ کو یہ خبر ملی تو وہ

۱؎ العبقریات الاسلامیہ ص۹۵۲ ۲؎ البدایۃ والنہایۃ ۔ ج ۷، ص۲۲۸

۳؎ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حج کے لئے گئی ہوئی تھیں، اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ ۱۸ ذی الحجہ کو پیش آیا۔

مدینہ سے چل کر عراق آئے اور مدینہ میں سہل بن حُنیف[1] کو اپنا قائم مقام بنایا پھر اُن کو بھی لکھا کہ اُن کے پاس آجائیں، اور مدینہ پر ابوالحسن المازنی کو والی مقرر کیا، مقام "ذوقار" پر منزل کی اور عمار بن یاسر اور حسن بن علیؓ کو کوفہ والوں کے پاس بھیجا کہ وہ لوگ ان کے ساتھ نکلیں، وہ لوگ آگئے تو ان سب کو لے کر بصرہ آئے، وہاں انھوں نے طلحہؓ، زبیرؓ اور عائشہؓ اور اُن کے حامیوں سے جو بصرہ میں تھے، یوم الجمل کے دن مقابلہ کیا[2]۔

یہ واقعہ جمادی الآخرہ ۳۶ھ کو پیش آیا اور علیؓ نے ان سب پر غلبہ پایا، مقتولین کی تعداد تیرہ ہزار تک پہونچ گئی[3]، حضرت علیؓ نے بصرہ میں پندرہ[15] راتیں گزاریں اور پھر کوفہ واپس آئے[4]"

---

[1] "سہل بن حُنیف بن وہب الانصاری الاوسی" کی کنیت ابو سعد تھی، اوّلین صحابہ میں تھے، بدر میں شریک تھے، اُحد کی جنگ میں ثابت قدم رہے اور تمام غزوات میں حاضر رہے ایک روایت کے مطابق نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور حضرت علیؓ کے درمیان مؤاخاۃ قائم کی تھی، اور حضرت علیؓ نے بصرہ پر واقعۂ جمل کے بعد اپنا قائم مقام بنایا تھا، اور شام پر حضرت معاویہؓ کے بجائے ان کو والی مقرر کیا تھا، جنگِ صفین میں وہ شریک رہے، ۳۸ھ میں کوفہ میں وفات پائی، حضرت علیؓ نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی، حدیث کی کتابوں میں چالیس[40] حدیثوں کے راوی ہیں (الاعلام للزرکلی ج ۳ ط ۳ ۱۹۶۹ء بیروت)

[2] اس جنگ کا جنگِ جمل اس لئے نام پڑا کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ کے ہودج پر سوار تھیں۔

متعدد علماء و محققین کا کہنا ہے کہ حضرت عائشہؓ فریقین میں صلح کرانے کیلئے نکلی تھیں، لیکن دو قبائل بنو ضبہ اور بنو الأزد نے ایسا نہیں کرنے دیا، اور انھوں نے حضرت علیؓ سے جنگ شروع کر دی (ملاحظہ ہو عبد القاہر البغدادی متوفی ۴۲۹ھ کی کتاب "اصول الدین" مطبوعۂ استنبول ۱۳۴۶ھ) بعض مؤرخین کے نزدیک اس میں سبائیوں کا بھی ہاتھ تھا (البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۳۹) [3] کچھ لوگوں نے اس سے کم بتایا ہے، اور "البدایۃ والنہایۃ" میں دس ہزار لکھا ہے۔ [4] "الطبقات الکبریٰ" از ابن سعد ج ۳ ص ۳۱-۳۲

حضرت علیؓ کے حامیوں نے حضرت علیؓ سے مطالبہ کیا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ کے حامیوں کا مال غنیمت اُن کے درمیان تقسیم کیا جائے تو حضرت علیؓ نے اس مطالبہ کو رَد کیا، سبائیوں نے اعتراض کیا، کہا آپ کس طرح اُن کے خون کو حلال کرتے ہیں اور اُن کے مال کو ہمارے لئے حلال نہیں کرتے، جب یہ خبر حضرت علیؓ کو ملی تو انھوں نے کہا کہ تم میں کون ہے جو یہ پسند کرتا ہے کہ اُمّ المؤمنین اُس کے حصّہ میں آئیں، اس پر سب خاموش ہو گئے[۱]۔

جنگ کی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے نہیں ہوئی، انھوں نے اسی وقت قتال شروع کیا جب اہلِ جمل نے ابتدا کی۔

طحاوی نے اپنی سند سے زید بن وہب سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ وہاں پہنچے اور ذی قارہ میں اترے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو اہلِ کوفہ کے پاس بھیجا، انھوں نے اُن کی بات ماننے میں سستی دکھائی، پھر اُن کو حضرت عمارؓ نے بلایا تو وہ نکل پڑے، حضرت زید کہتے ہیں کہ نکلنے والوں میں میں بھی تھا، راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اور ان کے رفقاء سے جنگ کرنے میں پہل نہیں کی، جب اہلِ جمل نے قتال شروع کیا تو پھر ان لوگوں سے حضرت علیؓ نے قتال کیا[۲]۔

حضرت علیؓ کی جانب سے حضرت عائشہؓ کا اعزاز و احترام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پورے اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا۔

مؤرخوں کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو اس طرح رخصت

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۴۵ [۲] شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۱۰۲ کتاب السیر، مکتبہ رحیمیہ دیوبند۔

کیا کہ اُن کے ساتھ بہرہ داروں کی جماعت بھیجی اور بصرہ کی معزز چالیس[۴] خواتین کو اُن کی ہمراہی کے لئے منتخب کیا اور بارہ ہزار[۱۲۰۰۰] کی رقم پیش کی، اس کو عبداللہ بن جعفر (ابن ابی طالب) نے کم سمجھا اور بہت بڑی رقم ہمراہ کی، اور کہا کہ میں اس کا ذمہ دار ہوں، حضرت عائشہ رضؓ کو کوئی تکلیف سوائے اس کے نہیں پہونچی کہ تیر سے ہلکی سی خراش لگ گئی تھی جس روز انھوں نے سفر کیا حضرت علیؓ وہاں پہونچے اور کھڑے رہے اور لوگ بھی آئے حضرت عائشہ رضؓ نے سب کو رخصت کیا اور فرمایا کہ میرے بچو! ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کا گلہ شکایت نہ کرے، ہمارے اور علیؓ کے درمیان پچھلے دنوں اگر کچھ غلط فہمی یا شکوہ شکایت رہی ہے تو صرف اسی قدر جتنا ایک خاتون اور اس کے دیوروں کے درمیان کبھی کبھی ہو جایا کرتی ہے، اور وہ میری عزیزانہ شکایت یا تأثر کے باوجود صلحائے اُمّت میں ہیں، اس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ واللہ اُم المؤمنین نے سچ فرمایا، ہمارے اور اُن کے درمیان صرف اسی قدر بات تھی، اور وہ تمھارے نبی کی دنیا و آخرت میں زوجہ ہیں، حضرت علیؓ ان کو رخصت کرنے اور اُن کے ساتھ مشائعت کرنے میلوں گئے، اور اُس دن جتنا وقت تھا، اُن کی خدمت میں گزارا، یہ واقعہ روز شنبہ یکم رجب ۳۶ھ کا ہے[۱]۔

تواتر کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ ندامت کا اظہار کرتی تھیں، اور کہا کرتی تھیں "کاش میں یوم الجمل سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئی ہوتی" وہ جب بھی اس دن کو یاد کرتیں تو اس قدر روتیں کہ اُن کا دوپٹہ تر ہو جاتا[۲]۔

جب یہ معرکہ ختم ہو گیا تو حضرت علیؓ نے مقتولین کی لاشوں کا معائنہ کیا، اہل بصرہ

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۴۶-۲۴۷ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت عائشہ رضؓ" از علامہ سید سلیمان ندوی جو اس موضوع پر سب سے بہتر کتاب ہے۔

میں سے کسی مقتول کی ایسی لاش دیکھتے جس کو وہ پہچانتے تو کہتے کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو لوگ اس جنگ میں شریک ہیں، وہ ناسمجھ اور غوغائی لوگ ہیں، مگر دیکھو یہ لاش فلاں کی ہے، اور یہ میت فلاں شخص کی ہے، اُس کے بعد آپ نے تمام مقتولین کی نماز جنازہ پڑھی اور ایک ساتھ دفن کرنے کا حکم دیا۔[1]

حضرت زبیرؓ جنگِ جمل سے واپس آئے تو راستہ میں ایک وادی پڑی وہاں اُتر گئے اس کا نام وادی السباع تھا، اُن کا پیچھا ایک شخص نے کیا جس کا نام عمرو بن جرموز تھا، وہ اس وقت پہونچا جب کہ حضرت زبیرؓ سو رہے تھے، اُس نے اُن کو اچانک قتل کر دیا، حضرت طلحہؓ کو معرکہ میں ایک سخت تیر لگا، (کہا جاتا ہے کہ جس نے ان پر تیر چلایا وہ مروان بن حکم تھا) اُن کے جسم سے خون بہنے لگا وہ بصرہ کے ایک گھر میں آئے، جہاں اُن کا آخری وقت آگیا،[2] یہ بھی روایت ہے کہ حضرت طلحہؓ معرکہ میں مارے گئے، اور حضرت علیؓ جب مقتولین کی طرف سے گزرے تو دیکھا کہ خاک و خون میں لتھڑے پڑے ہیں، حضرت علیؓ ان کے چہرہ سے گرد و غبار صاف کرنے لگے اور فرمایا: "اللہ کی رحمت ہو تم پر اے ابو محمد، میرے لئے یہ انتہائی دردناک بات ہے کہ تم کو آسمان کے تاروں کے نیچے پڑا ہوا پاؤں، پھر فرمایا کہ میں اللہ ہی سے فریاد کرتا ہوں اپنی ذرا ذرا باتوں کے بارے میں تمنا کرتا ہوں کہ کاش میں بیس سال پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا"[3]

حضرت زبیرؓ کو عمرو بن جرموز نے شہید کیا اور ان کا سر تن سے جدا کیا اور اس کو لے کر حضرت علیؓ کے پاس پہونچا، اس کو توقع تھی کہ یہ اس کا کارنامہ سمجھا جائے گا، اور

---

[1] "محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ" (الدولۃ الامویۃ) از استاذ الخضری بک ج ۲ ص ۵۸

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۴۳ [3] ایضاً ج ۷، ص ۲۴۵

حضرت علی رضؓ کے یہاں وہ مرتبہ پائے گا، لیکن جب اس شخص نے اجازت طلب کی تو حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ اس کو اندر آنے کی اجازت مت دو اور اُس کو جہنم کی "خوش خبری" سناؤ، ایک روایت میں یہ بھی نقل ہے کہ حضرت علی رضؓ نے کہا کہ "میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ" ابن صفیہ (زبیرؓ) کا قاتل جہنمی ہوگا، اس کو جہنم کی خبر دیدو۔"[1]

صحابۂ کرام کے باہمی اختلافات اور خانہ جنگیوں پر ایک نظر

ضرورت ہے کہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے ان اختلافات کا مطالعہ کیا جائے، جو صحابہ کرام کے درمیان پیش آئے اور جن میں سے بعض اختلافات اتنے بڑھے کہ جنگ کی نوبت آگئی، جن لوگوں کو ان حالات کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے ان پر جلد بازی میں کوئی حکم لگا دینا اور بے دھڑک ان کو زیغ وضلال میں مبتلا، دنیا پرست، جاہ ومال کا طالب اور بدنیت کہہ دینا مناسب نہیں ہے یہ تاریخی تجربات کا تقاضا ہے نیز خالص علمی انداز میں ان حوادث کا ایجابی انداز میں تجزیہ کرنا چاہئے، وہ لوگ جو براہ راست ان حالات سے گزرے اور جنگ وجدال تک کی نوبت آگئی، ان کے گرد وپیش جو حالات تھے، جس پیچیدہ قسم کے معاشرہ سے ان کا سابقہ تھا، اور اس وقت کا جو ماحول بن گیا تھا، بغیر ان سب کا مطالعہ کئے ہوئے عجلت اور جذباتیت میں کسی کے خلاف کوئی بات طے کرلینا صحیح نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ زمانۂ قریب میں جو حوادث پیش آتے ہیں ان کے سمجھنے میں بھی غلطی ہوجاتی ہے کیونکہ ہم حالات اور ماحول کا صحیح اور متوازن اندازہ نہیں کرسکتے، لہذا اُس دور کے حوادث جن پر ایک زمانہ گزر چکا ہے، اور وہ ہمارے ماحول سے بہت مختلف ماحول میں پیش آئے،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، صفحہ ۲۵

اس وقت کے کیا مُحرکات تھے اور جو افراد ان سے دوچار تھے ان کے لئے کیا دواعی وجذبات تھے جب تک ان کو اچھی طرح سمجھا نہ جائے' ان کے مقاصد' حالات کے صحیح پس منظر، خود ان کے دینی رجحانات' سابقہ خدمات' ان سب کو ایک ساتھ رکھ کر اور ایک کو دوسرے سے مربوط کر کے مطالعہ نہ کیا جائے' انصاف وعدل کی راہ کا پالینا دشوار ہوگا، جنگ جمل کے معاملہ میں یہی صورتِ حال تھی، ایک گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ طلب کر رہا تھا، دوسرا گروہ اپنے آپ کو اس سے عاجز پا رہا تھا، جو حضرت علیؓ کا موقف تھا، اور حضرت علیؓ ہی کی ذات اس جنگ واختلاف کا نشانہ بنی۔

ابوبکر، ابوالبختری سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے جنگ جمل میں ان کا مقابلہ کرنے والوں کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ:۔

۔ کیا وہ سب مشرک تھے؟

فرمایا: شرک سے تو وہ فرار اختیار کر چکے تھے۔

۔ تو کیا وہ منافق تھے؟

فرمایا: منافق اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

۔ تو پھر وہ کیا تھے؟

فرمایا: میرے ہی بھائی تھے، میرے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔

اور مزید فرمایا: میں دعا کرتا ہوں کہ ہم اور وہ، سب ان لوگوں میں شامل ہوں جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:۔

"وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ"

بڑی تعداد میں لوگوں نے اس طرح کی روایتیں نقل کی ہیں کہ جنگ جمل میں شریک

ہونے والے اپنی رائے سے رجوع کر چکے تھے، اور انھیں اس پر افسوس تھا، خود اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح کی روایت ہے، جیسا کہ ابوبکر اور ان کے علاوہ متعدد راویوں کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرت زبیرؓ سے سنا، اور الحاکم نے ثور بن مجزاۃ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے جنگ جمل کے موقع پر حضرت طلحہؓ کو اس حال میں دیکھا کہ اُن کی سانس اکھڑ رہی تھی، انھوں نے پوچھا تم کس گروہ سے ہو؟ انھوں نے کہا کہ علیؓ کے لوگوں میں ہوں، اپنا ہاتھ بڑھاؤ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرلوں، میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا، انھوں نے بیعت کی، اور اسی لمحہ جان جاں آفریں کے سُپرد کردی، میں نے حضرت علیؓ کو آکر یہ ماجرا سنایا، فرمایا: اللہ اکبر! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد صحیح ثابت ہوا، اللہ کو پسند نہیں تھا کہ طلحہ میری بیعت کے بغیر جنت میں داخل ہوں[1]۔

اس معرکہ کے بارے میں فلسفۂ تاریخ کے ماہر علامہ ابن خلدون نے بہت ہی وسیع النظری کے ساتھ بڑی عادلانہ اور جچی تُلی بات کہی ہے، وہ اپنے مشہور مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

"خبردار اپنے دل میں ان لوگوں کے بارے میں کوئی بُرا خیال نہ لانا اور زبان سے ایک لفظ ان کے خلاف نہ کہنا، جہاں تک ممکن ہو ہر فریق کے لئے خیر کا پہلو تلاش کرنا چاہئے، یہ سب حُسنِ ظن کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، ان کا اختلاف دلیل کی بنا پر تھا، ان کی جنگ حق کے لئے تھی، ان میں جو لوگ قاتل تھے یا مقتول سب جہاد کے راستہ پر تھے اور ہر ایک کا مقصد حق کی حمایت تھا، بلکہ میرا خیال ہے کہ ان کے اختلافات بعد میں آنے والوں کے لئے رحمت کا سبب تھے، تاکہ ہر شخص ان میں سے جس کو چاہے اپنا ہادی، امام اور رہنما سمجھے، اس بات کو

---

[1] ازالۃ الخفاء، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (المقصد الثانی) ص۲۸۰

ذہن نشین کرلو اور خلق و کائنات کے بارے میں اللہ کی حکمت سمجھنے کی کوشش کرو۔"[1]

علامہ ابن خلدون مزید لکھتے ہیں :۔

"(حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد) فتنہ کا دروازہ کھل گیا جس فریق نے جو بھی کیا اس کا جواز اس کے پاس تھا، اور سب ہی جویائے حق اور دین کے لئے کوشاں تھے، دینی امور کو کوئی بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اس (اصل اصول یعنی دین کی سربلندی) کے بعد انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اجتہاد کیا، اللہ ان کے احوال سے واقف اور ان کی قلبی کیفیات سے مطلع ہے، ہم سب ہی سے حُسنِ ظن رکھتے ہیں، جیسا کہ ان کے حالات گواہ ہیں اور ان میں سچے افراد کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے۔"[2]

ابن خلدون مزید لکھتے ہیں :۔

"ہر چند کہ ان اختلافات میں حضرت علیؓ برحق تھے مگر حضرت معاویہؓ کی نیت بھی باطل نہ تھی، انھوں نے (حضرت معاویہؓ) ارادہ حق ہی کا کیا مگر ان سے غلطی ہوگئی، اور تمام لوگ اپنے مقاصد کے لحاظ سے حق پر تھے مگر سلطنت کی خاصیت یہی ہے، کہ آدمی تنہا اپنے لئے اس کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کو اپنے لئے محفوظ رکھنا چاہتا ہے، حضرت معاویہ کے اختیار میں نہ تھا کہ اس خاصیت کو اپنی ذات اور اپنی قوم سے الگ کردیتے، یہ ایک قدرتی امر ہے، اور یہ خاندانی حمایت و تائید کی ضرورت کا تقاضا بھی ہے، جو اپنے ہی قبیلہ سے حاصل ہوسکتی تھی۔"[3]

جنگ جمل کی مثال ایک ایسے پانی کی ہے جس میں اُبال آیا اور ختم ہوگیا، لیکن جو جنگ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان تھی، وہ دو متوازی اصول کی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص۱۷۲ (دارالفکر، قاہرہ) [2] ایضاً ص۱۷۱ [3] ایضاً ص۱۶۲

جنگ تھی[1]، دو عظیم لشکروں اور جنگی طاقتوں کا ٹکراؤ تھا، اس اضطراری اور طویل کہانی کو (دل پر ہاتھ رکھ کر) ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان

۳۶ھ کا سال ایسے وقت میں شروع ہوا جب امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؓ نے خلافت کی زمامِ کار سنبھال لی تھی، اور ہر شہر پر اپنی طرف سے حاکم مقرر کر دیا تھا؛ اور شام پر سہل بن حُنیفؓ کو حضرت معاویہؓ کی جگہ پر مقرر کیا تھا، حضرت سہل بن حنیفؓ مدینہ سے روانہ ہو کر تبوک پہونچے تھے کہ معاویہؓ کے سواران سے ملے، انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا: حاکم، پوچھا کس علاقہ پر؟ جواب دیا: شام پر، ان لوگوں نے کہا کہ اگر تمھیں عثمانؓ نے بھیجا ہے تو ہم تمھارا استقبال کرتے ہیں، اور اگر اُن کے علاوہ کسی نے بھیجا ہے تو واپس جاؤ، حضرت سہل بن حُنیف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے، اس فوجی دستہ کے لوگوں نے جواب دیا ہاں ہمیں سب کچھ معلوم ہے، چنانچہ وہ حضرت علیؓ کے پاس واپس گئے۔

حضرت معاویہؓ نے ایک لمبا سا کاغذ دے کر ایک آدمی کے ہاتھ بھیجا وہ حضرت علیؓ کے پاس آیا، حضرت علیؓ نے پوچھا کہ کیسے آئے؟ اس نے کہا کہ میں ایسے لوگوں کے پاس سے آرہا ہوں جو صرف قصاص چاہتے ہیں، اور سب کے سب جذبۂ انتقام سے چور ہیں، میں نے ستر ہزار شیوخ کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ قمیص عثمانؓ کے نیچے رو رہے ہیں، اور وہ قمیص دمشق کے منبر پر رکھ دی گئی ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: "اے اللہ یہ تیرے علم میں ہے کہ میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں"۔

---

[1] ان دونوں نظاموں یا اصولوں کے درمیان اختلاف اور اُن کے نتائج پر باب ہفتم میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

حضرت علیؓ نے اہلِ شام سے جنگ کا فیصلہ کرلیا اور لوگوں کے سامنے ایک تقریر کی جس میں ان کو اس پر آمادہ کیا، اور تیاری کا ارادہ فرمایا، اور مدینہ سے نکلے اور مدینہ پر اپنی جگہ پر حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، اور عزم کرلیا کہ اپنے حامیوں اور مؤیدین کے ساتھ مخالفین سے اور جو اُن کے حریف کا ساتھ دے گا اُس سے جنگ کریں گے۔ حضرت علیؓ کے پاس ان کے صاحبزادے حسنؓ بن علیؓ آئے اور عرض کیا کہ ابّا جان اس جنگ کا ارادہ ترک فرمائیے، کیونکہ اس سے مسلمانوں کا (بڑے پیمانہ پر) خون بہے گا، اور اُن کے درمیان بڑی خلیج پڑ جائے گی، حضرت علیؓ نے ان کی رائے قبول نہیں کی اور جنگ کا پختہ ارادہ کرلیا، اور فوج کو منظم اور تیار کیا[1]، اور مدینہ کا والی قثم بن عباسؓ کو مقرر کردیا، اور صرف یہ بات رہ گئی تھی کہ مدینہ سے نکل کر شام کا رُخ کریں کہ اتنے میں ایسا مسئلہ سامنے آگیا جس کی وجہ سے انھوں نے اس ارادہ کو ترک کرکے عنانِ عزیمت دوسری طرف موڑ دی[2]۔

یہ تبدیلی جنگ جمل کی بنا پر تھی جس کا تذکرہ اسی باب میں گزر چکا ہے۔

حضرت علیؓ واقعۂ جمل سے نمٹ کر بصرہ آئے، اُم المؤمنین عائشہؓ چونکہ مکہ واپس آنا چاہتی تھیں، آپ نے اُن کی کچھ دور تک مشایعت کی، اور بصرہ سے چل کر ۱۲ رجب ۳۶ھ کو دوشنبہ کے دن کوفہ تشریف لائے، اُن سے کہا گیا کہ القصر الأبیض[3] میں اتریں فرمایا نہیں حضرت عمرؓ نے یہاں اُترنا

---

[1] حضرت علیؓ کا موقف خلافت کی طرف سے دفاع کرنا اور اس کے مقام اور عزت کو محفوظ رکھنا تھا، یہ بعینہٖ وہی موقف ہے جو حضرت عثمانؓ نے محاصرہ کے وقت اختیار کیا تھا اور خلافت سے دستبرداری قبول نہیں کی تھی، اگر ہر خلیفہ مسلمانوں کی سونپی ہوئی ذمہ داری سے اختلاف یا خطرہ کی بنا پر دستبردار ہوجاتا اور مسلمانوں کے اس اعتماد کو ٹھکرا دیتا جس کا انھوں نے اس کو اہل سمجھا تو خلافت باغیوں اور غیر ذمہ داروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن جاتی۔

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۲۹-۲۳۰ [3] شاہانِ ایران کا بنایا ہوا سفید محل۔

پسند نہیں کیا تھا، میں بھی اس کو پسند نہیں کرتا، آپ ایک میدان میں اترے اور شہر کی بڑی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی، لوگوں کے سامنے تقریر کی جس میں خیر کی ترغیب دی، اور برائی سے روکا، اور ایک خط حضرت معاویہؓ کو حضرت جریر بن عبداللہؓ کے ہاتھ بھیجا جس میں تحریر فرمایا:

"مجھ سے اُن لوگوں نے بیعت کی ہے، جن لوگوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) سے بیعت کی تھی، اور انھیں باتوں پر بیعت کی ہے جن پر اُن حضرات سے بیعت کی تھی، لہذا جو لوگ موجود ہیں، ان کے لئے سوائے اس طرز عمل کے چارۂ کار نہیں ہے، اور جو سامنے نہیں ہیں، اُن کو رد کرنے کا اختیار نہیں ہے، شوریٰ کا حق صرف مہاجرین وانصار کو ہے، اگر یہ حضرات کسی ایک پر متفق ہو کر اپنا امام بنالیں تو اسی میں اللہ کی رضا ہے، اور اگر ان کے طے شدہ امر سے کسی اعتراض یا بدعت کی وجہ سے کوئی نکلتا ہے تو جہاں سے وہ نکلا ہے، واپس کر دیا جائے گا، اور اگر انکار کرتا ہے تو اس سے عام مسلمانوں کا راستہ چھوڑ دینے کی بنا پر جنگ کی جائیگی پھر اللہ تعالےٰ اس سے سمجھ لے گا۔"[1]

جنگِ صفّین

امیر المؤمنین حضرت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کوفہ سے شام کے ارادہ سے نکلے، اُدھر حضرت معاویہؓ کو اطلاع ملی کہ علیؓ خود چل پڑے ہیں، انھوں نے اپنی شامی فوجوں کو لکھ کر بلایا، اور وہ یکجا ہو گئیں، اور والیوں کے جھنڈے اور عَلَم باندھے گئے،

---

[1] یہ خط "نہج البلاغۃ" کے اس حصہ میں مذکور ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکاتیب ہیں، (نہج البلاغۃ ص ۳۶۶ - ۳۶۷ طبع دار الکتاب اللبنانی بیروت) اس خط کا نہج اور اُسلوب بتا رہا ہے کہ یہ امیر المؤمنین کے مکتوبات میں سے ہو سکتا ہے، اور یہی مضمون تاریخ کی دوسری کتابوں میں بھی ہے۔

اہلِ شام تیار اور جنگ کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے، وہ بھی فرات کی طرف صفّین[1] کے علاقہ کی طرف بڑھے، جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے آنے کا راستہ تھا، حضرت علیؓ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھے، اور اُشتر نخعیؓ کو سپہ سالار مقرر کرکے بھیجا اور اُن کو حکم دیا کہ جب تک اہلِ شام خود جنگ کی ابتدا نہ کریں یہ پہل نہ کریں، بلکہ اُن کو بیعت کی بار بار ہدایت کریں، اگر وہ بیعت نہ کریں جب بھی خود جنگ کی ابتدا نہ کریں، اور جو آمادۂ جنگ ہے، اُس کے قریب نہ جائیں، اور اس قدر دور بھی نہ رہیں جس قدر ایک ڈرا سہما ہوا آدمی دور رہتا ہے، صبر و ضبط سے کام لیں اور نظام قائم رکھیں، یہاں تک کہ میں خود آجاؤں، اور میں انشاء اللہ تیز چلتا ہوا وہاں پہونچتا ہوں۔

جب اُشتر النخعیؓ فوج کے کمانڈر کی حیثیت سے وہاں پہونچ گئے تو انھوں نے امیر المؤمنین کے حکم کی تعمیل کی، اور اُن کے مقابل حضرت معاویہؓ کا سپہ سالارِ فوج بھی کھڑا رہا، اور دونوں فوجیں آمنے سامنے رہیں، جب شام ہو گئی تو ملک شام والے واپس گئے، دوسرے روز بھی دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف بستہ رہیں اور دونوں نے ضبطِ نفس سے کام لیا، معمولی سی چھیڑ چھاڑ رہی مگر باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی، اور دوسرے روز بھی بغیر جنگ کے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کے بعد واپس گئے، جب تیسرے روز کی صبح ہوئی تو حضرت علیؓ اپنی فوجوں کے ساتھ آگے بڑھے اور معاویہؓ اپنی فوج کے ساتھ محاذ آراء ہوئے، دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے رُوبرو آئیں اور ان کے درمیان مُڈبھیڑ ہوئی اور

---

[1] صفّین، فرات کے مغربی ساحل پر "رقّہ" سے قریب مقام ہے، کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ مقام فرات کے مشرقی ساحل سے قریب تھا، یہی وہ مقام ہے، جہاں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ ہوئی (مراصد الاطلاع علی اسماء الأمکنۃ والبقاع از صفی الدین البغدادی ج ۲ ص ۸۴۶)

سخت جنگ ہوتی رہی، اہلِ عراق پانی کے ذخیروں کو کھولنے کا شامیوں سے مطالبہ کر رہے تھے، کیونکہ شامیوں نے اُن پر قبضہ کر لیا تھا، اور عراقیوں کو پانی نہیں پینے دے رہے تھے، پھر بعد میں دونوں نے اس بات پر صلح کر لی کہ کوئی کسی کا پانی نہ روکے، حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ اہلِ شام پر پانی نہ بند کیا جائے، لہٰذا دونوں پانی لیتے رہے۔

حضرت علیؓ نے اپنے بعض اصحاب کو بلا کر کہا کہ معاویہؓ کے پاس جاؤ اور اُن کو طاعتِ امیر اور جماعت کا ساتھ دینے کی دعوت دو اور سنو وہ کیا کہتے ہیں۔

ادھر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے کی ٹھان لی، اس پر جنگ چل پڑی اور دونوں طرف کے فوجی ایک دوسرے پر پل پڑے بسا اوقات ایک دن میں دو دو بار میدان کارزار گرم ہوا اور جب ذی الحجہ کا مہینہ ختم ہو گیا، اور محرم کا مہینہ آگیا تو لوگوں نے جنگ بندی کے لئے آواز لگائی کہ شاید اس طرح اللہ ان دونوں میں صلح کرا دے اور مسلمانوں کی خونریزی نہ ہو۔

اس درمیان پیغام رساں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان آتے جاتے رہے، اور لوگ جنگ سے رُکے رہے، یہاں تک کہ اس سال کے محرم کا مہینہ ختم ہو گیا اور اُن دونوں کے درمیان صلح نہ ہو سکی، معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ پھر کمربستہ ہوئے، اور جنگ کا میمنہ اور میسرہ تیار کیا، ادھر حضرت علیؓ بھی اپنی فوج کا میمنہ میسرہ تیار کرتے رہے، اور لوگوں کو ہدایت کی کہ جب تک اہلِ شام ابتداء نہ کریں کوئی جنگی اقدام نہ کرے (جنگ ہو تو) کسی زخمی کا کام تمام نہ کیا جائے کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کوئی کسی عورت کی بے حرمتی نہ کرے اور نہ اُس کی توہین کرے، خواہ وہ اُمّت کے امراء اور صالحین کو گالیاں دے۔

دونوں گروہوں میں سخت جنگ ہوئی جب شام کو حملوں سے رُکے تو اندازہ ہوا کہ

معاملہ نتیجۂ جنگ کے لحاظ سے برابر کا ہے، دو روز تک یہی ہوتا رہا، تیسرے روز بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، اور لوگ عشاء تک مصروف پیکار رہے، اور اسی طرح چوتھے دن، پانچویں دن بھی جنگ ہوتی رہی کوئی کسی پر غالب نہیں ہوا، جب ساتواں دن آیا اور جنگ بغیر غالب و مغلوب کے جاری تھی، اور اہلِ شام معاویہؓ سے موت پر بیعت کر چکے تھے، (یعنی وہ اُن کی خاطر جان دینے پر تیار ہیں) اور امیر المؤمنین نے لوگوں کو صبر و ثبات اور جہاد کی ترغیب دی، اور اشتر نخعیؒ نے بڑی بہادری سے حملہ کیا، اور اُن پانچ صفوں میں گھس گئے جو معاویہؓ کے گرد جمع تھیں اور جنھوں نے قسم کھائی تھی کہ فرار نہیں اختیار کریں گے، اہلِ عراق لوٹے اور انھوں نے اپنا جتھہ مضبوط کیا، اور جنگ کی چکی گھومتی رہی، شامیوں نے عراقیوں کی فوج کے اندر گھس کر بھرپور وار کیا، حضرت عمار بن یاسرؓ کو اہلِ شام نے قتل کیا، اور اسی سے بقول ابن کثیر کے، یہ بات واضح ہو گئی کہ علیؓ حق پر تھے۔[1]

یہ سلسلہ چلتا رہا کہ جمعہ کی صبح آ گئی، اور جنگ جاری رہی، صبح کی نماز صلاۃ الخوف کی طرح ادا کی گئی، اور لوگ جنگ میں مشغول رہے، یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگا، اور اہلِ عراق کو شامیوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے لگی، اور قریب تھا کہ شامی پوری طرح شکست خوردہ ہو جائیں، اتنے میں شامیوں نے نیزوں پر قرآن اُٹھایا، اور کہا کہ ہمارے تمھارے درمیان قتال کا یہ کتاب فیصلہ کرنے والی ہے،[2] لوگ فنا ہو رہے ہیں تو اسلامی سلطنت کے حدود کی حفاظت

---

[1] علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ حدیث تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، اور اس پر تمام مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ وہ صفّین کے موقع پر حضرت علیؓ کی فوج میں تھے، اور اسی میں شہید ہوئے (" الاصابہ فی تمییز الصحابۃ" ج ۲ ص ۵۱۳)

شیخ الاسلام حافظ احمد بن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

"کتاب و سنت اور اجماعِ سلف سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ سب مؤمن و مسلم تھے، لیکن سیدنا علی بن ابی طالبؓ اور جو لوگ انکے ساتھ تھے، وہ ان لوگوں کی بہ نسبت جنھوں نے ان سے جنگ کی، زیادہ حق پر تھے۔ واللہ اعلم" (مجموعۂ فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ ج ۴ ص ۴۳۳)

[2] ابن جریر اور دوسرے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ تحکیم کی تجویز پیش کرنے والے عمرو بن العاصؓ تھے۔

کون کرے گا، کون جہاد کرے گا، کون مشرکوں اور کفار سے مقابلہ کرے گا؟ اس وقت جب کہ مصاحف کو نیزوں پر بلند کیا گیا، تو عراقیوں نے کہا ہم اللہ کی کتاب کو قبول کرتے ہیں، اور اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، اس وقت مسعر بن فدکی التمیمی، زید بن حصین الطائی ثم السبائی نے ایک گروہ کے ساتھ مل کر کہا (جن میں وہ قرّاء بھی ساتھ ہو گئے جو بعد میں خوارج کے گروہ میں شامل ہوئے) اے علیؓ! اللہ کی کتاب کی طرف جب بلایا جا رہا ہو تو اس کو قبول کرنا چاہیئے، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو ہم تمھیں دشمنوں کے حوالہ کر دیں گے، یا وہ کریں گے جو ابن عفّان کے ساتھ کیا ہے، حضرت علیؓ نے کہا کہ میری بات یاد رکھنا کہ میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں اور جو تم کہہ رہے ہو اس کو بھی یاد رکھنا، اگر تم میری بات مانتے ہو تو جنگ جاری رکھو، اگر تم نافرمانی ہی پر آمادہ ہو تو جو چاہو کرو، اشتر النخعیؓ نے اُن کو نصیحت کی اور اُن سے بحث کی، مگر وہ لوگ نہیں مانے، اکثر عراقی اور تمام شامی مصالحت اور جنگ بندی پر مائل ہو گئے، اور جنگ رُک گئی اور دونوں فریقوں کے درمیان مذاکرات اور مکاتبات کے طویل سلسلے کے بعد "تحکیم" پر اتفاق ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ دونوں امیر و قائد علیؓ اور معاویہؓ اپنی جانب سے ایک ایک شخص کو متعیّن کر دیں، اور یہ دونوں حَکَم اس بات کو طے کر دیں جس میں مسلمانوں کا فائدہ ہو، معاویہؓ نے عمرو بن العاصؓ کو وکیل بنایا اور حضرت علیؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ کو وکیل بنانا چاہا لیکن قرّاء (علماء و حفّاظ) آڑے آ گئے اور کہنے لگے ہم صرف ابو موسیٰ الأشعری کو مان سکتے ہیں۔

تحکیم

پیغام رساں حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس گئے اور وہ عزلت نشین تھے، اُن سے جب کہا گیا کہ لوگوں نے صلح کر لی ہے تو بولے الحمد للہ! پھر کہا گیا کہ آپ کو حَکَم بنایا گیا ہے تو فرمایا:

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن" پھر اُن کو حضرت علیؓ کے پاس لایا گیا، اور ایک دستاویز[1] تیار ہوئی جس پر دونوں حکم حضرات نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ، اور دونوں کی فوجوں سے معاہدہ اور اقرار لے لیا کہ اُن دونوں کی جانیں اور اُن کے خاندان کی جانیں مامون رہیں گی، اور دونوں جو بھی فیصلہ کریں گے اُمّت اس میں اُن کی مدد اور تائید کرے گی۔

خوارج کا ظہور

بنی تمیم کے لوگوں کے سامنے اشعث بن قیس نے یہ معاہدہ پڑھ کے سنایا تو عُروہ بن اُذینہ کھڑا ہوا اور بولا: "أتُحَكِّمُونَ فِي دِينِ اللهِ الرِّجَالَ؟" (کیا اللہ کے دین میں تم لوگوں کو حکم بناتے ہو) اس شخص کی یہ بات حضرت علیؓ کے حمایتیوں میں سے قرّاء کے کئی گروہوں نے مان لی، اور کہنے لگے "لاحکم إلّا لِلّٰہ" یہ خوارج کے ظہور کا آغاز تھا، یہیں سے اس فرقہ کی بنیاد پڑی جس کا شعار و عقیدہ یہی جملہ تھا۔

حضرت علیؓ کوفہ کی طرف واپس چلے، جب شہر میں داخل ہونے کے قریب ہوئے تو اُن کی فوج سے تقریبًا بارہ ہزار ۱۲۰۰۰ لوگوں نے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا، اور یہی خوارج ہیں، یہ لوگ ایک جگہ اترے جس کا نام حروراء[2] ہے، حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اُن کے پاس بھیجا، انھوں نے اُن کے ساتھ افہام تفہیم سے کام لیا، جس کے نتیجہ میں اُن کی بڑی تعداد نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا، اور باقی اپنی ضد پر قائم رہے، اور آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے رہیں گے، انھوں نے حضرت علیؓ سے اپنی ناراضگی کا برملا اظہار کیا کہ انھوں نے اللہ کے دین میں کسی کو ثالث بنایا، جب کہ حکم صرف اللہ کا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۷۷

[2] اسی شہر کی طرف خارجیوں کی نسبت ہے اور اسی لئے خارجیوں کو حَروری کہا جاتا ہے۔

ابن جریر نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ ایک روز خطبہ دے رہے تھے کہ ایک خارجی کھڑا ہوا اور کہا اے علیؓ! آپ نے اللہ کے دین میں لوگوں کو شریک کیا حالانکہ حکم صرف اللہ کا ہے، اس پر ہر طرف سے "لاحکم إلّا لِلّٰه لاحکم إلّا لِلّٰه" کا نعرہ لگنے لگا، حضرت علیؓ فرماتے رہے:

"ھذہ کلمۃ حق یراد بھا باطل" (یہ بات حق ہے مگر اس سے جو مطلب لیا جا رہا ہے اور کہنے والوں کی جو نیت ہے وہ باطل ہے) اس کے بعد وہ لوگ بالکلیہ کوفہ سے نکل گئے اور نہروان میں سمٹ آئے۔

"لاحُکمَ اِلّا لِلّٰه" کے نعرہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تنقید ان کی حکیمانہ بصیرت اور فراستِ ایمانی کا بہترین نمونہ ہے، آپ نے فرمایا:-

"بات سچ ہے مگر اس کا مطلب غلط لیا جا رہا ہے، ہاں یہ بالکل سچ ہے کہ حکم صرف اللہ ہی کا ہے، مگر ان لوگوں کا مطلب ہے کہ "لا إمارۃ اِلّا لِلّٰه" یعنی اللہ کے علاوہ کسی کی قیادت نہیں ہے، حالانکہ لوگوں کے لئے ایک امیر کا ہونا ضروری ہے، اچھا ہو یا بُرا، تاکہ اس کی سربراہی میں اہلِ ایمان کام کریں، کافر (اپنے حقوق سے) مستفید ہوں، ہر معاملہ کے لئے ایک ضابطہ اور وقت طے ہو، اس کی سربراہی میں مالِ غنیمت جمع ہو، دشمن سے جنگ کی جا سکے، وہ راستوں کو پُرامن بنائے، جو کمزور کا حق طاقتور سے دلائے اور باغی و فاجر سے نجات پائے اور نجات دلائے"۔[1]

دونوں حَکَم ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص دومۃ الجندل میں آکر ملے، یہ رمضان کا زمانہ تھا، دونوں نے مسلمانوں کی مصلحت اور حالات کے رُخ کو پیشِ نظر رکھا، اور یہ طے کیا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کریں اور فیصلہ مسلمانوں کے مشورہ پر چھوڑ دیں، تاکہ وہ لوگ جس کو

---

[1] تلبیس ابلیس ابن الجوزی ص ۹۳ والمبرّد الکامل، ج ۲ ص ۱۱۷

بہتر سمجھیں اس کو خلیفہ منتخب کریں، عمرو بن العاصؓ نے ابوموسیٰؓ پر یہ دباؤ ڈالا کہ تنہا معاویہؓ کو ولایت سونپ دی جائے لیکن ابوموسیٰؓ نے یہ بات نہیں مانی پھر دونوں نے اس بات پر صلح کرلی کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول قرار دیا جائے اور حکومت کا فیصلہ لوگوں کے مشورہ سے طے ہو، وہ جس کو چاہیں اپنا والی مقرر کرلیں۔

اس کے بعد یہ دونوں عوام کے مجمع کے سامنے آئے عمرو بن العاصؓ نے ابوموسیٰؓ سے کہا کہ ابوموسیٰؓ اُٹھئے اور لوگوں کو وہ فیصلہ سنا دیجئے جس پر ہم دونوں متفق ہوئے ہیں، چنانچہ ابوموسیٰؓ نے تقریر کی، اللہ کی حمد و ثناء بیان کرنے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلاۃ و سلام بھیجنے کے بعد کہا کہ حضرات! ہم نے اس اُمّت کے معاملہ پر غور کیا تو ہم نے اس سے زیادہ مناسب اور اُمّت کے شیرازہ کو باقی رکھنے والی بات اس سے بہتر نہیں پائی کہ ہم اور عمرو اس بات پر متفق ہیں کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کردیں اور معاملہ شوریٰ کے سپرد کردیں اور اُمّت اس بات کو قبول کرلے، پھر یہ اصحابِ شوریٰ جس کو چاہیں اپنا والی بنالیں اور میں نے اپنی طرف سے علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کیا، یہ کہہ کر ابوموسیٰؓ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور اُن کی جگہ پر عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے اللہ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد کہا کہ ابوموسیٰؓ نے جو کچھ کہا آپ نے سُن لیا اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنے ساتھی کو معزول قرار دیا، اور جس طرح انھوں نے اپنے ساتھی (علی رضی اللہ عنہ) کو معزول قرار دیا میں بھی اُن کو معزول قرار دیتا ہوں اور اپنے دوست معاویہؓ کو متعیّن کرتا ہوں کیوں کہ وہ عثمان بن عفّان کے رشتہ دار اور اُن کے قصاص کے طالب ہیں، اور اُن کے قائم مقام ہونے کے سب سے زیادہ حقدار ہیں، کہا جاتا ہے کہ ابوموسیٰؓ نے اُن کے ساتھ دُرشت انداز میں بات کی اور عمرو بن العاص نے اسی طرح جواب دیا، ابوموسیٰؓ کو حضرت علیؓ سے ایسی شرم آئی کہ وہ وہاں سے

سیدھے مکّہ چلے گئے۔[1]

ادھر خارجیوں کا زور بندھا اور انھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف غصّہ کا اظہار کرنے میں اتنا مبالغہ کیا کہ اُن کے کفر کا اعلان کر دیا، اور ایک خارجی لیڈر نے یہاں تک کہا کہ اے علیؓ! اگر اللہ کی کتاب کے معاملہ میں لوگوں کو حَکَم بنانا نہیں چھوڑا تو ہم تم سے جنگ کریں گے، اور اس جنگ کو اللہ کے قُرب اور رضامندی کا ذریعہ سمجھیں گے، خوارج عبداللہ بن وہب الرّاسبی کے مکان میں جمع ہوئے جس نے ایک بلیغ خطبہ دیا، اس دنیا کے بارے میں اُن کو زُہد کی تلقین اور جنّت و آخرت کی رغبت دلائی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر اُبھارا اور کہا کہ اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اپنے بھائیوں کو نکال لو اور پہاڑ کی کسی کھوہ میں رہ پڑو یا مدائن میں سے کسی جگہ، اور یہ بات طے کر کے مدائن کی طرف چلنے کی تیاری کی، تاکہ اس پر قابض ہوں اور قلعہ بند ہو جائیں، اور اپنی ساری رشتہ داریاں، قرابتیں اور تعلقات چھوڑ کر نکل پڑے اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ بات اللہ کو راضی کرنے والی ہے۔[2]

حضرت علیؓ کا تحکیم قبول کرنا اور خوارج کا اُن کے حق میں ظلم

قبل اس کے کہ ہم خوارج پر گفتگو کریں اور اُن کے نفسیات اور اُن کے انتہا پسندانہ عقیدے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۷۶-۲۸۷ مختصراً۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے اس روایت کی نفی کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ثقہ ائمۂ رواۃ کے بیان کے مطابق روایت کا صرف اتنا حصہ صحیح ہے کہ جب یہ دونوں اس لئے جمع ہوئے کہ بہتر اور افضل شخص کو منتخب کریں تو ابو موسیٰؓ نے علی کو اور عمرو بن العاصؓ نے معاویہؓ کو معزول قرار دیا، اور فیصلہ ان چند لوگوں پر چھوڑا جن سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آخری ایام تک راضی رہے تاکہ وہ دوبارہ غور کر کے کسی کو خلیفہ بنائیں" (العواصم من القواصم" ص ۱۷۲-۱۸۰ مختصراً)

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۲۷۶-۲۸۷

کا جائزہ لیں اور تاریخی اعتبار سے نقد و تجزیہ کریں، العقّاد کی کتاب "العبقریات الاسلامیۃ" کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، جن سے حضرت علیؓ کی پوزیشن اور اُن کی دشواریوں پر روشنی پڑتی ہے۔ العقّاد لکھتے ہیں :-

"جو لوگ اُن پر (یعنی علیؓ پر) تحکیم قبول کرنے کی وجہ سے ملامت کرتے ہیں، میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ انھوں نے اس ملامت کرنے میں جس درجہ عُجلت سے کام لیا اسی عُجلت و شدّت سے وہ حضرت علیؓ کا محاسبہ اور اُن پر اعتراض و تنقید کرتے اگر وہ تحکیم کا انکار کر دیتے، اور اس پر اصرار کرتے کیونکہ انھوں نے تحکیم خوش دلی سے قبول نہیں کی تھی، بلکہ ایسی حالت میں قبول کی تھی کہ اُس کے بغیر چارۂ کار ہی نہ تھا، انھوں نے اس وقت اس کو قبول کیا جب کہ اُن کی فوج جنگ سے انکار کر رہی تھی، اور قریب تھا کہ اُن کی فوج آپس ہی میں دو گروہوں میں بٹ جائے اور تحکیم قبول کرنے والوں اور نہ قبول کرنے والوں کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہو جائے۔

وہ مؤرخ جو تحکیم کے بارے میں ان کی رائے کے مؤید ہیں اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو وکیل بنانے کے معاملے میں اُن کی تائید نہیں کرتے اس لئے کہ حضرت علیؓ کو اُن کی کمزوری اور ہچکچاہٹ معلوم تھی وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعریؓ بھی اُن پر اسی طرح عائد کر دیئے گئے تھے، جس طرح تحکیم یک لخت عائد کر دی گئی تھی، اور اس سے بھی زیادہ یہ اہم بات نظر انداز کی جا رہی ہے کہ حضرت علیؓ کی طرف سے وکیل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہوتے یا اُن کی نیابت (اُن کے مخلص و وفادار ساتھی) اشتر نخعیؒ کرتے یا (برادر عم زاد) عبداللہ بن عباسؓ کرتے کسی حال میں بھی عمرو بن العاصؓ معاویہؓ کو معزول کرنے پر راضی نہ ہوتے اور علیؓ کی خلافت کا

اقرار نہ کرتے اور نتیجہ یہی ہوتا کہ دونوں حکم اپنی اپنی رائے پر اڑے رہتے، اور بات وہیں پہنچتی جہاں پہونچی ہے، لہذا تنقیدی نگاہ سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے حضرت علیؓ نے جو کچھ کیا اس سے زیادہ صحیح راستہ ممکن نہ تھا، خواہ وہ اس فیصلہ پر اس کی غلطی کو سمجھتے ہوئے راضی ہوئے ہوں یا اس لئے راضی ہوئے ہوں کہ دونوں کا حاصل ایک ہوگا۔[1]

خوارج اور سبائیہ

اس باب میں خوارج اور سبائی فرقہ کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہ وہ دو فرقے ہیں، جن کے ہاتھوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اور کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا، اس کی حکمت اللہ ہی بہتر جانتا ہے، شاید یہ زکوٰۃ تھی، ان خصوصیات، کارناموں اور عبقریت کی جس سے اللہ تعالےٰ نے حضرت علیؓ کو نوازا تھا۔

خوارج

خوارج کے اندر مزاجی اعتبار سے لفظی سطحیت،[2] لکیر کا فقیر ہونا، سلبی[3] نقطۂ نظر، انتہائی غلو اور تضاد و تناقض اس درجہ رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا، جتنا ماضی کے کسی قدیم مذہب میں یا اسلام کے بعد کسی فرقہ میں (جن کا ذکر مذاہب اور فرقوں کی تاریخ

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۹۲۵-۹۲۶

[2] اسی کو عربی میں "حرفیت" کہتے ہیں (یعنی لکیر کا فقیر ہونا) جس کا ترجمہ لفظی سطحیت سے کیا گیا ہے۔

[3] اسی مفہوم کی طرف لفظ سلبیت سے اشارہ کیا گیا ہے۔

نویسوں نے کیا ہے) نہ ہوگا۔

اصلاً یہ لوگ حضرت علیؓ کے لشکر میں تھے، اور قبیلۂ تمیم سے ان میں سے اکثر لوگوں کا تعلق تھا، یہ لوگ حضرت علیؓ سے اس بنیاد پر باغی ہوئے کہ کوئی شخص کتاب اللہ کے بارے میں کسی کو کیوں حَکم قرار دے؟ اور اُن کا یہ عقیدہ ہوگیا کہ تحکیم گناہ ہے، کیونکہ اللہ کا حکم تمام معاملات میں عیاں اور واضح ہے، اور تحکیم کے اندر یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ دو متحارب فرقوں میں شک کیا جائے کہ کون حق پر ہے، اُن کے دلوں کی اس اُلجھن کو کسی شخص نے اس جملہ میں ڈھال دیا کہ "لاحُکمَ اِلاّ لِلّٰہِ" کہ فیصلہ کا حق صرف اللہ ہی کو ہے، یہ جملہ اس عقیدہ رکھنے والوں کے اندر بجلی بن کر سرایت کر گیا اور گوشہ گوشہ سے اس کی قبولیت کے نعرے لگنے لگے، اور اس فرقہ کا یہ شعار بن گیا، ان لوگوں کو "الشُّراۃ" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں اللہ کے ہاتھ بیچ دی ہیں، یہ لفظ اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" (لوگوں میں کچھ وہ ہیں جو اپنی جان کو اللہ کی مرضیات کے حصول میں بیچ دیتے ہیں) حضرت علیؓ نے نہروان کے مقام پر اُن سے جنگ کی اور اُن کو شکست دی اور ان میں سے خاصی تعداد کو قتل کیا، لیکن وہ فنا نہیں ہوئے اور نہ اُن کا عقیدہ ختم ہوا بلکہ اس ہزیمت کی وجہ سے خوارج کے اندر حضرت علیؓ سے بیزاری کا جوش بڑھ گیا یہاں تک کہ انھوں نے حضرت علیؓ کے قتل کی سازش کی اور بالآخر عبدالرحمن بن مُلجم الخارجی نے اُن کو شہید کر دیا، خوارج کا مذہب بعض موالی کے داخل ہونے کی وجہ سے یدویانہ رنگ رکھتا تھا، اپنی بعض خوبیوں کے اعتبار سے بھی اور بعض بُرائیوں کے اعتبار سے بھی، وہ اپنے سربراہوں سے اکثر اختلاف کرتے، گروہ بندی اور تفرقہ میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے، اور بڑے کوتاہ بیں تھے، اپنے مخالفوں کے بارے میں اُن کا نظریہ بہت تنگ ہوتا تھا،

لیکن اس کے ساتھ ساتھ انتہا درجہ کے پارسا بھی تھے، اپنے اعمال اور اپنے اقوال میں بہت صاف گو اور کھرے ہوتے تھے، اپنے عقیدہ کے لئے جان دے دینا ان کے لئے بہت آسان تھا، کھجور کے درخت سے ٹپکا ہوا ایک دانہ بھی بغیر اس کی مالک کی اجازت کے اُٹھانے میں احتیاط کرتے اور اس کو منھ سے نکال کر پھینک دیتے، دوسری طرف مسلمانوں کا خون بہانے میں بے باک تھے، اور کسی بے گناہ کو جو ان کا عقیدہ نہ رکھتا ہو قتل کرنے میں ان کو ذرا بھی تردّد نہیں ہوتا تھا[1]، عبدالرحمٰن بن ملجم حضرت علیؓ کو شہید کرتا ہے، پھر قرآن بھی پڑھتا رہتا ہے، جب اس کی زبان کاٹنے کا ارادہ کیا گیا تو گھبرا گیا، اس سے کہا گیا کہ اب کیوں گھبراتا ہے؟ تو جواب دیتا ہے کہ دنیا میں (قرآن شریف نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے) مُردار بن کر رہنا پسند نہیں کرتا اور جیسا کہ اُن کے اوصاف بیان کرنے والے ایک واقف کار[2] نے کہا ہے کہ :۔

"یہ وہ نوجوان ہیں جو بجز اپنی جوانی میں بوڑھے معلوم ہوتے ہیں، شر کے سامنے اُن کی نگاہیں نیچی ہوتی ہیں، باطل کی طرف بڑھنے میں اُن کے قدم بھاری ہوتے ہیں، کثرتِ عبادت کی وجہ سے دبلے پتلے اور شب بیداری کی وجہ سے سوکھے سا کھے[3]"

سبائی

العقّاد لکھتے ہیں :۔

"سبائی" عبداللہ بن سبا کے پیرو ہیں جو ابن سوداء کے نام سے مشہور تھا، اصلاً وہ یہودی تھا، اور اس کی ماں ایک زنجی (حبشیہ) عورت تھی ملک یمن میں پیدا ہوا، اس کا مذہب جس سے وہ مشہور ہے "مذہب رجعت" کہا جاتا تھا، یہ مذہب

---

[1] یہ تضاد کی مثال ہے۔ [2] یعنی ابو حمزہ خارجی۔ [3] الکامل ج ۲ ص ۱۳۶

چند عقیدوں کا مجموعہ تھا، ایک عنصر اس یہودی عقیدہ کا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد میں ایک نجات دہندہ پیدا ہوگا، اور دوسری بنیاد اہلِ ہند کے عقیدہ پر تھی، کہ خدا انسان کے جسم میں ظہور و حلول کرتا ہے اور اس کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور تیسرا عنصر نصاریٰ (عیسائیوں) کا یہ عقیدہ کہ حضرت مسیح ظاہر ہوں گے، اور چوتھا عنصر اہلِ فارس کا عقیدہ تھا کہ ملوک اور امراء کی اولاد تقدیس کی مستحق ہے[1]"۔

الاستاذ العقاد مزید لکھتے ہیں:۔

"سبائیت یمن میں پیدا ہوئی، گزشتہ زمانہ میں اس کے ماننے والوں کی حکومت بھی رہ چکی ہے، یہ سبائی فرقہ حضرت علی رض کی محبت میں غلو کرتا ہے یہاں تک کہ ان کے لئے "مرتبۂ تقدیس" کا قائل ہے، اور مصر و ایران پر اس سے شیعۂ فاطمیہ اور امامیہ کے بیج پھیلے اور ان ملکوں کی زمینوں میں پرورش پاتے رہے پھر کئی نسلوں کے بعد اُن کی کونپلیں ظاہر ہوئیں[2]"۔

شیعہ اسماء الرجال کی ایک معتبر کتاب "رجال کشی" ہے، اس میں عبداللہ بن سبا کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی رض کی امامت فرض ہونے کا اعلان کیا، اور اُن کے دشمنوں سے براءت کا اعلان کیا اور علانیہ اُن کی دشمنی کی اور اُن کو کافر ٹھہرایا، شیعوں کے مخالفین جو یہ کہتے ہیں کہ شیعیت کا ماخذ اور سرچشمہ یہودیت ہے، اس کی اصل یہی ہے[3]"۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں عبداللہ بن سبا اور اس کے ماننے والوں نے بہت زیادہ غلو سے کام لیا، انھوں نے ان کو نبی مانا، پھر اس سے بھی زیادہ غلو پر اُتر آئے، اور اُن کو الٰہ بنا دیا، اور اس کی دعوت بھی دینا شروع کر دی، کوفہ کے لوگوں کو بھی دعوت دی، حضرت علی رض کو

---

[1] العبقریات الاسلامیہ ص ۹۶۷ [2] ایضاً ص ۹۶۲ [3] رجال کشی ص ۷۱

خبر ملی تو انھوں نے اُن کو دو گڈھوں میں نذر آتش کیے جانے کا حکم دیا، پھر خیال ہوا کہ اگر بقیہ کو بھی جلا کر ختم کر دیا تو یہ بات قابلِ اعتراض و تنقید ٹھیرے گی، لہذا ابن سبا کو جلا وطن کر کے ساباط المدائن بھیج دیا، جب حضرت علیؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو ابن سبا نے کہا کہ علیؓ مقتول ہو ہی نہیں سکتے، وہ حضرت عیسیٰ کی طرح آسمان پر چلے گئے ہیں بعض سبائیوں کا عقیدہ تھا کہ علیؓ بادلوں میں چھپے ہیں، اور بجلی جو کڑکتی ہے وہ انہی کی آواز ہے، لہذا جب یہ لوگ بجلی کی کڑک سنتے تو کہتے "السلام علیک یا امیر المؤمنین" جب ابن سبا سے کہا گیا کہ علیؓ کو شہید کر دیا گیا تو اس نے کہا کہ اگر تم اُن کا دماغ بھی ایک تھیلے میں لا کر دکھا دو جب بھی ہم اُن کی موت کا یقین نہیں کریں گے، اور وہ جب تک کہ آسمان سے نزول نہ کریں مر ہی نہیں سکتے، اور مرنے سے پہلے سارے عالم پر ان کی حکومت ہو گی"[1]

جہاں تک مصنّف کے تاریخی مطالعہ اور واقفیت کا تعلق ہے، اُسے کسی ایسی سازشی تحریک کا علم نہیں جو اس درجہ کامیاب ہو گئی ہو، اور اس کے بوئے ہوئے بیج اس درجہ برگ و بار لائے ہوں۔

عبد اللہ بن سبا کے فکری اور عملی سانچے کو بنانے میں متعدد عوامل کارفرما ہیں، خاندانی، نفسیاتی اور مذہبی عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں، اس کے ماننے والوں میں سہل انگیزی کے بجائے دشوار پسندی ہے، صراحت و وضاحت کے مقابلہ میں روپوشی اور پوشیدگی کا انداز غالب ہے، قرآن کریم نے قوم سبا کی نفسیات اور طریقِ فکر کا ذکر اسی انداز میں کیا ہے، انھوں نے کہا "رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا" (پروردگار (ایسے آسان اور پُر راحت اور باوسائل سفر

---

[1] "دائرۃ معارف القرن العشرین" از محمد فرید وجدی (دار المعرفۃ، بیروت طبع سوم ۱۹۷۱ء)

میں کچھ مزہ نہیں) ہمارے سفر کی منزلوں کو دور اور دشوار بنا دے (کہ کچھ سفر کا مزہ آئے)[1]۔

یہ عبداللہ بن سبا کا خاندانی موروثی مزاج ہے نسل اور خاندان کا اثر بہت گہرا اور پائدار ہوتا ہے، اس کے نفسیاتی عنصر میں احساس کمتری کو بڑا دخل ہے، ابن سبا کی ماں ایک حبشیہ زنجیہ تھی، اسی لئے اس کو ابن السوداء کہا جاتا تھا، دینی و مذہبی عنصر جو اس مذہب کے مزاج کا آئینہ ہے، وہ یہودی ذہنیت ہے، جس سے اس کو لوگ پہچانتے تھے، اور تاریخ کے ہر دور میں تخریبی رجحان، معاشروں میں فساد پیدا کرنا، اور ادب و ثقافت میں ایک طرح کی آلودگی و پیچیدگی، اخلاق اور انسانی رجحانات میں سازشی ذہنیت، معاشروں اور انسانی جماعتوں میں بے چینی اور شورش و بغاوت کا رجحان پیدا کرنا یہودیت کی روایت و تاریخ رہی ہے، یہ سب عناصر اجتماعی طور پر اس فرقہ کے اندر ملتے ہیں[2]۔

اسی ذہنیت اور تاریخی ورثہ نے عبداللہ بن سبا کی صورت میں ایک تحریک و دعوت کی تشکل اختیار کر لی، یہ تمام عناصر انار کی، انتہا پسندی اور تقدیس کی حد تک غلو اور خدائی صفات کا حامل بنانا، اس دعوت و تحریک کے خط و خال ہیں، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی والاشان و مظلوم شخصیت، اس سازش، مخفی و زیر زمین (UNDERGROUND) تحریک کا نشانہ بنی، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اُن کے خونی رشتہ، قریبی تعلق، عظمت و عبقریت کے اسباب کے مجتمع ہونے کی وجہ سے اس دعوت کو برگ و بار لانے اور اپنے ہمنوا پیدا کرنے میں مدد ملی۔

مشہور مصنف ڈاکٹر احمد امین بک اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فجر الاسلام" میں لکھتے ہیں :-

---

[1] ملاحظہ ہو قوم سبا کا قصہ قرآن مجید کی سورۂ سبا کی تفسیر میں۔

[2] نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو "بروتوکولات حکماء صہیون" (عربی)

"جن لوگوں نے ایسی قوموں کی تاریخ پڑھی ہے جو کسی زمانہ میں دنیا کے ایک وسیع علاقے پر حکمراں رہ چکے ہیں، اور نخوت، احساس برتری اور تفاخر جن کے خمیر میں داخل ہو چکا ہو، اور جن کو اپنی سربلندی کا زعم اس حد تک رہا ہو کہ وہ خود کو حکومت و جہانبانی کا تنہا حقدار سمجھتی ہوں، اور پھر اُن سے اُن کی موروثی اور اُن کے طبقہ کے لئے مخصوص حکومت چھین لی گئی ہو، اور اس کی جگہ ایسی حکومت قائم ہو گئی ہو جس کی اساس ایک عقیدہ و نظریہ پر ہو، اور ان لوگوں کے پاس کوئی فوجی قوت بھی نہ رہ گئی ہو جس سے اپنی حکومت واپس لے سکیں، جن لوگوں نے ان اقوام کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ اس طرح کی طاقت سے محروم قومیں تخریبی کاموں میں مشغول ہو جاتی ہیں، لاقانونیت پھیلانا، اختلافات کو اُبھارنا، ان کا کام ہوتا ہے، اور جب موقع ملتا ہے سازشوں اور تخریبی کاموں کی پلاننگ میں اور مقامی سطح پر فتنوں کے اُبھارنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔

المقریزی نے لکھا ہے:-

معلوم ہونا چاہیئے کہ اکثر و بیشتر وہ لوگ جو اسلام سے نکل گئے ہیں ان کے نکلنے کا سبب یہ ہے کہ اہل فارس ایک زمانہ میں بڑی سلطنتوں کے مالک تھے، اور ان کو دوسری قوموں پر بالادستی حاصل تھی، اور خود اُن کے غرور و پندار کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو آقا اور دوسروں کو غلام سمجھتے تھے، اور جب اسلام نے ان کے ہاتھوں سے زمام کار چھین لی تو اُن کی نخوت کو زیادہ دھچکہ لگا کیونکہ وہ عربوں کو کبھی

خاطر میں نہ لاتے تھے، اس لئے اسلام کا فاتح ہونا اُن کے لئے اور بھی جاں گسل ثابت ہوا یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں آگے رہے لیکن ہر بار اللہ نے حق کو فتح دی، اس لئے انھوں نے سوچا کہ کوئی اور چال چلیں، لہذا اپنے ہم وطن مسلمانوں کو باور کرایا کہ وہ مسلمان ہیں اور اہلِ تشیع کو بتایا کہ وہ اہلِ بیت سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے ہیں، اور اُن کا حق مارنے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس طرح وہ اُن کو راہِ حق سے نکال کر دوسری راہوں پر لے گئے۔[1]"

اُن دو متضاد فرقوں کا وجود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی کی تصدیق تھی متعدد راویوں نے حارث بن حُصیرہؓ سے اور انھوں نے ابو صادقؓ سے اور انھوں نے ربیعہ بن الناجدؓ سے روایت کی ہے کہ :۔

"حضرت علیؓ نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار بُلا کر فرمایا کہ تم عیسیٰ ابن مریمؑ کا نمونہ ہو، اُن سے یہود نے اس درجہ بُغض بڑھایا کہ ان کی والدہ پر بُہتان لگا دیا، اور نصاریٰ نے اُن سے محبت کی تو اس منزل پر پہونچا دیا جو اُن کی نہیں تھی، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ سُن لو میری ذات کے بارہ میں افراط و تفریط کی وجہ سے دو طبقے ہلاک ہوں گے، محبت کرنے والے ثنا خوانی میں غلو کرنے والے، جو میری ایسی تعریف کریں گے جو مجھ میں نہیں ہے، اور ایسے بُغض کرنے والے جن کی دشمنی اُن کو مجھ پر بُہتان لگانے پر مائل کرے گی، سن لو کہ میں نہ تو پیغمبر ہوں اور نہ مجھ پر وحی آتی ہے لیکن میں اپنے مقدور بھر کتاب و سنت پر عمل کرتا ہوں، اللہ کی اطاعت کے لئے جو میں تمھیں حکم دوں اس میں میری اطاعت تم پر واجب ہے، خواہ پسند کرو یا ناپسند۔[2]"

---

[1] فجر الاسلام از ڈاکٹر احمد امین ص ۲۷۷ بحوالہ مقریزی ص ۳۶۲ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۳۵۶

حالت اضطراری جس سے یہ اُمّت کبھی گزر سکتی ہے۔ سیّدنا علیؓ کا اُسوہ

خدائے دانا و بینا کو معلوم تھا کہ یہ اُمّت جس کے کاندھوں پر سارے عالم کی تولیت TRUSTEESHIP کا بار ڈالا گیا ہے اور جس کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ دنیا کا دینی و اخلاقی احتساب اور اقوام و ملل کی قیادت کرے، اس کو ضرور ایسے حالات سے بھی گزرنا ہوگا جس میں کبھی طاعت و فرمانبرداری کا مظاہرہ ہوگا اور کبھی بغاوت و نافرمانی کا، بیرونی حملے بھی ہوں گے اور اندرونی سازشیں بھی ہوں گی کہ یہی فطرتِ انسانی ہے، لہٰذا ہر موقع کے لئے خاص احکام بتا دیئے، اور اس طرح کے مختلف مواقع کے لئے ایسے رہنما اور سربراہ بھی پیدا کر دیئے، جنھوں نے اپنے عملی کردار سے مثالی نمونے قائم کر دیئے کہ ایسی صورت ہو تو یوں کرو، اور اگر یہ صورت پیش آجائے تو اس طرح پیش آؤ، ان لوگوں نے اُمّت کے لئے ہر صورت حال کے لئے ایک مثال چھوڑ دی تاکہ اُمّت جب اس طرح کے حالات سے گزرے تو اس کے سامنے تاریکی نہ رہے۔

لہٰذا جس طرح اللہ کی راہ میں جہاد، بُت پرستوں اور اہلِ کتاب سے معرکہ آرائی، باغی مرتد افراد سے قتال ضروری تھا، اسی طرح خواہ یہ بات دل کو کتنی ہی بُری لگے مگر امرِ واقعہ ہے کہ خود اہلِ قبلہ کے درمیان آپس میں اختلاف ہونا اور خود مسلمانوں کی صف میں رخنہ پڑ جانا اور امامِ وقت کے ساتھ بغاوت کا ابھرنا قدرتی بات ہے، لہٰذا ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے خیر القرون کا ایک اُسوہ درکار تھا اور ایسے امام وقت کا اُسوہ جس کی اقتداء کی جاسکے، اور جس کو نمونہ بنایا جاسکے۔

حضرت سفیان بن عُیینہ رحمۃ اللہ علیہ جو ایک بڑے تابعی بزرگ ہیں، انھوں نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کو چار[۱] قسم کی تلواریں عطا کی تھیں۔

ایک تلوار تو وہ تھی جس سے آپؐ نے خود صنم پرستوں سے مقابلہ کیا، دوسری تلوار وہ تھی جس سے حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتد قبیلہ سے جنگ کی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ" (سورۃ الفتح۔ ۱۶)

اور ایک تلوار وہ تھی جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجوسیوں اور اہلِ کتاب سے معرکہ سر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ.... الآیۃ۔ (سورۃ التوبۃ۔ ۲۹)

اور ایک تلوار وہ تھی جس سے علی رضی اللہ عنہ نے صف شکن، قاطع بیعت اور حدود حق سے تجاوز کرنے والوں سے قتال کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللّٰهِ۔ (سورۃ الحجرات۔ ۹)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:۔

ما قاتل أحدٌ علیاً إلا وعلیٌّ أولیٰ بالحق منہ، ولولا ما سار علیٌّ فیھم ما علم أحدٌ کیف السیرۃ فی المسلمین[۲]۔	حضرت علیؓ سے جس نے بھی جنگ کی اس میں حق پر علیؓ ہی تھے اور اگر حضرت علیؓ ان سے اس طرح کا معاملہ نہ کرتے تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں جب اختلاف ہو تو کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔

---

[۱] المبسوط للامام السرخسی ج۔۱ ص۲ [۲] مناقب الامام الأعظم از صدر الأئمۃ موفق ابن احمد المکی۔ ج ۲ ص۳۵ طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد الہند ۱۳۲۱ھ

باب ہفتم

حضرت علیؓ خوارج اور اہل شام کے مقابلے میں

شہادت کا حادثہ، آپ کی حکمت و بلاغت اور طنز و عتاب کا منفرد ادبی اسلوب

اہل عراق اور اہلِ شام کے درمیان طبائع کا فرق

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بہ یک وقت دو طرفہ عظیم مشکلات کا سامنا تھا ایک طرف شام کی ریشہ دوانیاں تھیں جن سے جنگ کے بغیر چارۂ کار نہ تھا، دوسری طرف اُن کے احباب و انصار تھے، جن کے اندر اس سرگرمی اور جوش کا فقدان تھا، جو اہلِ شام کے اندر پایا جاتا تھا، دونوں ملکوں (شام و عراق) کے متضاد نفسیاتی و تاریخی مزاج و خصوصیات اور دونوں صف آرا گروہوں (انصارِ علیؓ اور انصارِ معاویہؓ) کی جبلّی صلاحیتوں کا اس صورتِ حال کے پیدا ہونے میں خاص دخل تھا۔

اُن دونوں ملکوں پر تاریخی اثرات مختلف انداز کے پڑے تھے، وہ گہرے بھی تھے اور طاقتور بھی۔

حضرت معاویہؓ کے پردادا اُمیّہ ہاشم سے اختلاف اور مقابلہ کی بنا پر مکہ سے شام چلے گئے تھے، اور عرصۂ دراز تک اسی کو اپنا وطن بنائے رکھا، ان کے پوتے ابوسفیان کو "اللّواء" کا منصب حاصل ہوا، جس کی ذمّہ داریوں اور فرائض میں سے شام کی طرف جانے والے تجارتی قافلوں کی حفاظت بھی تھی، اس طرح ان کا بار بار شام جانا ہوتا تھا، اور اُن کے وہاں کے قبائل اور باشندوں سے اچھا تعارف و تعلق ہوگیا تھا۔

حضرت معاویہؓ کے شام پر اثرات اور قدیم تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "اللّواء" (فوجی طاقت اور قافلوں کی حفاظت) کا منصب بنو اُمیّہ کے حصہ میں آیا تھا، اس کا تقاضہ اور نتیجہ یہ تھا کہ حجاز کے جو تجارتی قافلے شام و یمن آتے جاتے تھے، ان کی حفاظت و نگرانی صاحب اللواء کو (جو اپنے وقت میں ابوسفیان تھے) کرنی پڑتی تھی، اور اس تقریب سے ابوسفیان کو بار بار شام آنے جانے کا اتفاق ہوتا تھا، اس کی وجہ سے اہلِ شام اور وہاں کے حکّام ابوسفیان اور ان کے خاندان سے

پہلے سے واقف و متعارف تھے۔

اسی بنا پر جب شہنشاہ روم ہرقل کو ایک ایسے قریشی حجازی کی ضرورت پیش آئی جس سے وہ خط بھیجنے والی اور اس کو اسلام کی دعوت دینے والی شخصیت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرے تو اس کام کے لئے ابوسفیان ہی کی خدمات (اس وقت شام میں ہونے کی وجہ سے) آسانی سے حاصل ہو گئیں، اور ان سے اس کا وہ مکالمہ ہوا جو صحیح بخاری کے حوالہ سے سیرت کی کتابوں میں نقل ہوا ہے، اور اس کتاب میں بھی اس کا اشارہ آیا ہے۔

اس کے علاوہ عرصۂ دراز تک شام پر یزید بن ابی سفیان اور اُن کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان رضؓ حکمراں رہ چکے تھے، اور اسلامی دور سے پہلے یہ ملک بازنطینی شہنشاہیت کے تابع تھا، یہاں سیاست اور نظم و نسق میں استقرار ہر دور میں قائم رہا[1] حضرت معاویہ رضؓ اپنے طبقہ میں، اور اپنی نسل کے لوگوں میں تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں میں ممتاز تھے، ان کے اندر شخصی اخلاق و مدارات اور سیاسی حکمتِ عملی اور حاکمانہ رکھ رکھاؤ دونوں تھے، وہ عوام کو حاکمانہ رُعب و داب، اور فیاضانہ داد و دہش دونوں سے کام لے کر مطمئن رکھتے تھے، اور حالات و مواقع کے مطابق کام کا اُسلوب جانتے تھے۔[2]

عراق کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ایران کے ساسانی و کیانی فرمانرواؤں کی غلامی میں صدیوں سے چلا آ رہا تھا، یہاں کبھی طویل عرصہ کے لئے نظم و ضبط اور سیاسی استقرار نہیں رہا، بادشاہت آئے دن بدلتی رہی مختصر سی مدت میں کئی کئی بادشاہ ایران کے تخت پر آئے اور گئے، کسریٰ نوشیرواں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو استاد عباس محمود العقاد کی کتاب "معاویہؓ" عنوان "تمہیدات الحوادث" ! ص ۱۸-۱۹

[2] حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے وقت حضرت معاویہؓ کو شام پر بیس سال تک بغیر کسی اختلاف و انتشار کے حکومت کا موقع ملا تھا۔

(۵۳۱ - ۵۷۹ء) کی جگہ کسریٰ پرویز (۵۹۰ - ۶۲۸ء) نے لی جس کو شہنشاہ ہرقل نے شکست دی اور سائرس اور شیرویہ نے ۶۲۸ء میں بادشاہت سے معزول کر کے قتل کر دیا، اس طرح ۶۲۸ء سے لے کر ۶۳۲ء تک (جب تک یزدگرد سوم نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں نہیں لی) ایران انتشار و طوائف الملوکی کی نذر رہا، اور بے نظمی و بدامنی کا شکار، پرویز کے تخت پر اس کا فرزند قباذ (جس کا شیرویہ لقب تھا) بیٹھا، شیرویہ بھی چھ ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہا، اور ساسانی تخت پر چار سال کی مدت میں دس بادشاہ آئے گئے، حکومت ڈانواں ڈول رہی، یہاں تک کہ لوگوں نے یزدگرد سوم کو اپنا بادشاہ مان کر بادشاہت کا تاج اس کے سر پر رکھا جو بنی ساسان کا آخری حکمراں ہوا ہے، بدانتظامی اور افراتفری سے نوبت یہاں تک پہونچی کہ ہرمز کی بیٹی پوران کو بھی تختِ حکومت پر بیٹھنے کا موقعہ ملا، حالانکہ شاہی خاندان کی روایات کے خلاف یہ بات تھی کہ کوئی عورت حکمراں ہو، ایک سال چار ماہ وہ بھی تخت نشین رہی۔

عراقی اور شامی باشندوں میں فرق اُن عرب قبائل کے مزاج و اُفتادِ طبع کے باعث بھی تھا، جنھوں نے ایک طرف شام کو فتح کر کے اس کو اپنا وطن بنایا تھا، دوسری طرف وہ قبائل جنھوں نے عراق کو فتح کر کے وہاں کا قیام اختیار کیا تھا، شام کو فتح کرنے والے قبائل اکثر و بیشتر جزیرۃ العرب کے مغربی و شمالی حصہ کے باشندے تھے، اُن کے اندر ایک نظام کے تحت زندگی گذارنے کی خو تھی، اور عراق کو فتح کرنے والے جزیرۃ العرب کے مشرقی علاقہ کے لوگ تھے، جن کی سرشت میں بے چینی، ہر نظام و انتظام سے ناراضگی اور ذہنی انتشار داخل تھا، جس کا نتیجہ ارتداد اور زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی شکل میں ظاہر ہوا، اگرچہ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اس سب کے ساتھ ان کے اندر شجاعت اور "فروسیتِ عربیہ" کا جوہر بھی تھا، اور اس طرح کی دوسری قبائلی و قومی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر احمد امین کہتے ہیں:-

"زمانۂ قدیم سے عراق مختلف قسم کے مذاہب اور نت نئے عقائد کی آماجگاہ رہا ہے، پہلے زمانہ میں اُن کے یہاں مانی، مزدک اور ابن دیصان کے افکار و تخیّلات کارفرما رہ چکے ہیں، انہی میں عیسائی اور یہودی بھی تھے، جنھوں نے مختلف مذاہب کی باتیں سُن رکھی تھیں، جن میں یہ بھی تھا کہ اللہ بعض افراد کے اندر حلول کر جاتا ہے۔"[1]

احمد حسن زیّات لکھتے ہیں :۔

"عراق میں جو عرب آئے وہ یمنی اور نزاری عصبیت اپنے ساتھ لے کر آئے، الجزیرۃ الفراتیہ میں یا تو نصرانیت تھی یا خارجیت، کیونکہ یہ ربیعہ کے قبائل کا مسکن تھا، جو بقول اصمعی ہر فتنہ کی جڑ تھا۔"[2]

استاذ عباس محمود العقّاد نے بڑی بلاغت اور نکتہ رسی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکروں میں کیا فرق تھا، وہ کہتے ہیں :۔

"یہ ایک حیرت انگیز تاریخی حقیقت ہے کہ دونوں لشکر (جیشِ عراقی و جیشِ شامی) ایک دوسرے کی ضد تھے، ایک طرف اجتماعی نظم و ضبط کی پسندیدگی اور اس کو باقی رکھنے بلکہ مضبوط کرنے کی خواہش تھی، دوسری طرف اجتماعی نظم سے چڑھ، نفرت اور نظم و ضبط کے ڈھانچے کو توڑنے اور اس کے رُخ بدلنے کے محرکات و دواعی جمع تھے۔"

عقّاد مزید لکھتے ہیں :۔

"پہلی قسم، جو نظم و ضبط کی خواہاں تھی، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی تھی، جو شام اور اس کے اطراف میں تھی، دوسری قسم، جس کے اندر اجتماعی نظم و ضبط

---

[1] فجر الاسلام ص۲۳۲ (مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، القاہرہ، ط ۳، ۱۹۳۵ء)

[2] "تاریخ الادب العربی" للزیّات ص۲۰۱ (مطبعۃ الرسالۃ، القاہرہ۔ ط ۱۱)

سے گریز اور نفور تھا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی تھی، اس گروہ کا جغرافیائی و نسلی تعلق جزیرۃ العرب کے مختلف حصّوں سے تھا۔[۱]

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے شام پر حملہ کا ارادہ کیا مگر خوارج راضی نہیں ہوئے، حضرت علیؓ کوفہ سے نخیلہ تک ایک فوج کثیر لے کر پہنچے، امیر المؤمنین نے ایک مؤثر تقریر کی لوگوں کو جہاد کی تلقین کی، دشمنوں سے مقابلہ کے وقت صبر و ہمّت سے کام لے کر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دی، شام کی طرف لشکر کا رُخ ہو چکا تھا کہ اُن کو اطلاع ملی کہ خوارج نے ملک میں فساد پھیلا رکھا ہے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، راستے کاٹ دیئے گئے ہیں، ممنوعات و محرّمات کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے ایک شخص کو اپنی طرف سے بھیجا، وہ جب وہاں پہونچا تو اس کو ان لوگوں نے بات کرنے کی مہلت بھی نہیں دی اور قتل کر دیا، جب حضرت علیؓ کو یہ اطلاع ملی تو اہلِ شام سے پہلے ان لوگوں سے نمٹنا ضروری سمجھا، امیر المؤمنین وہاں پہونچے، لوگوں کو نصیحت کی، ڈرایا، دھمکایا اور فرمایا کہ "تم لوگوں نے میرے ایسے حکم کی (مسئلۂ تحکیم کی) نافرمانی کی جس کی دعوت تم ہی نے دی تھی، پہلے میں نے تم کو اس سے روکا تھا مگر تم نے قبول نہیں کیا تھا، مگر خوارج امیر المؤمنین کے اس وعظ و نصیحت سے متأثر ہونے کے بجائے اُن کے خلاف صف بستہ ہو گئے، اور نعرے لگانے لگے "لا حکم الّا للّٰہ، الرواح الرواح إلی الجنۃ" (یعنی فیصلہ صرف اللہ کا ہے، جنّت کی طرف بڑھے چلو بڑھے چلو) اور کچھ لوگ تیر اور نیزے لے کر مقابلہ پر اتر آئے، اس کے جواب میں حضرت علیؓ کی فوج نے اُن پر حملہ کر کے پسپا کر دیا، اور وہ گھوڑوں کے قدموں کے نیچے پامال ہو گئے، یہ واقعہ ۳۷ھ کا ہے۔[۲]

---

[۱] العبقریات الاسلامیۃ ص۶۹۰ [۲] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص۲۸۸-۲۸۹، ابن جریر اور اکثر سیرت نگاروں اور مؤرخوں کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ ۳۸ھ کا ہے۔

شام کی طرف روانگی کا عزم اور جنگ سے عراقیوں کی بہانہ بازیاں

مقام نہروان (جہاں خارجیوں کا صفایا کیا گیا) سے حضرت علیؓ واپس آئے تو لوگوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی، آپ نے حمد و ثنا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام کے بعد فرمایا: "اللہ تعالےٰ نے تمھیں فتح مندی سے اعزاز بخشا، لہٰذا ابھی بلا کسی وقفہ کے اپنے شامی حریفوں سے نمٹ لو" عراقی اس کے جواب میں کھڑے ہو کر کہنے لگے: اے امیر المؤمنین! ہمارے تیر سب ختم ہو چکے ہیں، تلواریں کُند ہو چکی ہیں، نیزے کے سرے برچھیوں سے نکل گئے ہیں، ہمیں اپنے گھر واپس لے چلیے تاکہ ہم اچھی طرح سے تیاری کر کے اور تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں۔[1]

عراقیوں کا ہمیشہ یہی وتیرہ رہا ہے، ابن جریر نے لکھا ہے جب حضرت علیؓ نے عراقیوں کی سرد مہری دیکھی اور جنگ سے وہ روگرداں ہوئے تو اُن کے سامنے تقریریں کیں جن میں اُن کو ملامت بھی کی اور انجام کار سے ڈرایا بھی، جہاد پر راغب کرنے والی آیات پڑھ کر سنائیں، اور دشمنوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا، مگر وہ جگہ سے نہیں ہلے، حضرت علیؓ کی مخالفت ہی کرتے رہے، اور اپنے شہروں میں حسبِ معمول سمٹے رہے، کچھ لوگ اِدھر اُدھر نکل گئے، مجبوراً حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے۔

پھر ۳۹ھ آ گیا معاویہؓ بن ابی سفیانؓ نے ایک بڑی فوج ترتیب دی اور جن علاقوں پر حضرت علیؓ کی حکومت تھی، وہاں اس فوج کے دستے پھیلا دیئے، کیونکہ معاویہؓ کو معلوم تھا کہ اہلِ عراق بہت سے معاملات میں حضرت علیؓ کی فرمانبرداری نہیں کرتے، چنانچہ معاویہؓ کی فوج نے عین التمر، الانبار، تیماء اور تدمر پر حملے کر دیئے، عراقیوں اور حضرت علیؓ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷ ص ۳۰۵

کے انصار میں لسپت ہمتی، بُزدلی اور کمزوری نمایاں ہوئی۔

عراقیوں کے اس کمزور اور بُزدلانہ موقف اور اُن کی بہانہ بازی اور حیلہ جوئی کی تصویر حضرت سیدنا علیؓ کی اس تقریر میں نظر آتی ہے، جب انھوں نے اس صورتِ حال سے دل گرفتہ ہو کر ایک تاریخی خطبہ دیا ہے، حضرت علیؓ کو جب معلوم ہوا کہ معاویہؓ کی فوج نے الانبار پر حملہ کر کے اس کے گورنر حسّان بن حسّان کو قتل کر دیا ہے تو وہ انتہائی غم و غصہ کی حالت میں گھر سے نکلے، آپ کی چادر کا کنارا زمین سے لگ رہا تھا، آپ اس کو سنبھالتے ہوئے "نخیلہ"[1] آئے لوگ آپ کے پیچھے پیچھے تھے، آپ نے ایک اونچے ٹیلہ پر چڑھ کر ایک خطبہ دیا، پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام پڑھ کر تقریر شروع کی، یہ تقریر (خطبہ) ایک اہم ترین تاریخی تقریر ہے، جو ایک زخم خوردہ قائد کی زبان سے نکلی ہے، اس تقریر میں ایک طرف اپنی قوم پر عتاب ہے، دوسری طرف اپنے موقف کے صحیح ہونے کا یقین نمایاں ہے، ادب و بلاغت کا یہ شاہکار، عَلوی ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، جس کی بلندی کو کوئی بڑے سے بڑا ادیب اور بہتر سے بہتر مقرر نہیں پہنچ سکتا۔

آپ نے فرمایا:-

"امّا بعد! جہاد جنّت کا ایک دروازہ ہے، جس نے اس در سے روگردانی کی اللہ نے اُس کو رُسوائی اور ذلّت کا پیراہن پہنا دیا، نکبت اور ذلّت اس کا مقدّر بنی، میں نے تم کو اے لوگو! رات دن، علانیہ اور رازدارانہ طریقوں پر طرح طرح سے اُن لوگوں کے خلاف جنگ پر اُبھارا، میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اُن کے حملہ آور ہونے سے پہلے تم خود بڑھ کر اُن پر حملہ کر دو، اور قسم ہے، اس ذات کی جس کے

---

[1] نخیلہ بادیہ کی ایک جگہ کا نام ہے۔

قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، قاعدہ یہی ہے کہ جس قوم پر اس کے گھر پر
چڑھائی کر کے حملہ کیا جاتا ہے، وہی ہمیشہ رُسوا ہوتی ہے، مگر تم نے پست ہمتی
دکھائی، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے، میری بات تم پر گراں گزری، اور
اس کو پسِ پشت ڈال دیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تم پر حملے پر حملے کئے گئے، اس
قبیلۂ غامد کے آدمی کی فوج نے الانبار پر چڑھائی کی اس کے گورنر حسّان بن
حسّان کو قتل کر دیا، اُن کے ساتھ بہتیرے مردوں اور عورتوں کو ہلاک کیا،
ایک سپاہی گھر میں گھس کر مسلمان خاتون یا ذمّی[1] خاندان کی عورت کے کان سے
اُس کی بالیاں اور پیروں سے اُس کے پازیب اُتار کر اطمینان سے چلا جاتا ہے،
اور یہ سب فوجی لوٹ کے مال بھرے ہوئے اس طرح واپس جاتے ہیں کہ کسی کو
ایک خراش بھی نہیں لگتی، اگر کوئی صاحبِ غیرت مسلمان اس صورتِ حال کو دیکھ کر
غم سے گھُٹ کر مر جائے تو میرے نزدیک ملامت کا مستحق نہ ہوگا بلکہ سزاوارِ تحسین
ہوگا، حیرت بالائے حیرت ہے، ایسی حیرت جو دل کو مردہ اور عقل کو بیکار کر دے،
اور رنج و غم کو دوبالا کر دے کہ باطل پر یہ لوگ اس درجہ آپس میں متحد ہوں اور
تم حق پر ہوتے ہوئے انتشار و بے ہمتی کا شکار ہو، تم نشانہ بنائے گئے ہو اور تم پر تیر چلائے
جاتے ہیں مگر تم تیر نہیں چلاتے، تم پر حملہ کیا جاتا ہے، اور تم اس کا جواب
نہیں دیتے، کھُلے بندوں اللہ کی تمہارے سامنے نافرمانی ہوتی ہے، اور تم مطمئن ہو،
اگر تم سے کہتا ہوں کہ جاڑوں میں اُن پر حملہ کرو تو کہتے ہو ابھی تو جِلّہ کی سردی

---

[1] اسلامی مملکت کی غیر مسلم آبادی جس کو امن اور شہری زندگی کے (شریعت اسلامی کے
مطابق) حقوق دیئے جاتے ہیں، اور حکومت اُن کی حفاظت کی بھی ذمہ دار ہے۔

پڑ رہی ہے، اگر کبھی کہا کہ موسم گرما میں اپنے دشمن پر حملہ کرو تو کہتے ہو یہ تو آگ برسنے کا زمانہ ہے، ذرا مہلت دیجئے کہ اس شدت کی گرمی کا زمانہ گزر جائے، واللہ اگر تم جاڑے اور گرمی سے بھاگتے ہو تو تلوار سے کہیں زیادہ (خوفزدہ ہو کر) بھاگو گے۔

اے مرد نما لوگو! جن میں مردانگی نام کو نہیں، اے خواب و خیال کی پرچھائیوں! اے پازیب پہننے والیوں کی جیسی عقل رکھنے والو! خدا تم نے اپنی نافرمانیوں سے میری ساری سیاست پر پانی پھیر دیا، غصہ و غم سے مجھے بھر دیا، بات یہاں تک پہنچ گئی کہ قریش کہتے ہیں کہ ابو طالب کا فرزند ہے تو بہادر مگر جنگ کی حکمت نہیں جانتا، کیا خوب! کون ہے، وہ جو فن جنگ سے مجھ سے زیادہ واقف اور اس کا مرد میدان ہوگا، خدا گواہ ہے، میں جنگ میں اس وقت آیا ہوں جب میری عمر بیس سال سے بھی کم تھی، اور آج ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہو چکی ہے، لیکن جس کی بات نہ مانی جائے اس کی کوئی حکمت نہیں چلتی اور وہ ہزار صائب الرائے ہو کوئی مانتا نہیں "ولکن لارای لمن لایطاع" (آخری جملہ آپ نے تین بار فرمایا۔)[1]

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت

علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:۔

"امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو حالات نے بہت مکدر کر دیا تھا، ان کی فوج میں بے راہ روی تھی، اہل عراق نے اُن کی مخالفت شروع کر دی تھی،

---

[1] الکامل للمبرد، ج ۱ صفحہ ۳۰-۳۱ (طبع مؤسسۃ الرسالۃ۔ القاہرہ)

اُن کے ساتھ تعاون سے کترا رہے تھے، ادھر شامیوں کی قوت زور پکڑ چکی تھی، اب وہ دائیں بائیں حملے کرتے اور لوٹ مار مچا رہے تھے، عراق کے امیر علی بن ابی طالبؓ اس عصر میں روئے زمین پر بسنے والے انسانوں میں سب سے اعلیٰ وافضل انسان تھے، سب سے زیادہ اللہ کے عبادت گزار، سب سے زیادہ دنیا سے بے غرض اور بے رغبت، سب سے زیادہ علم وفضل کے حامل، سب سے زیادہ خوف خدا رکھنے والے انسان تھے، پھر بھی لوگوں نے اُن کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا، ان سے کنارہ کش ہو گئے، یہاں تک کہ خود امیر المؤمنین اپنی زندگی سے اُکتا گئے، اور موت کی تمنا کرنے لگے، کہتے تھے: "یہ (اپنی ریش مبارک کی طرف اشارہ کر کے) اس کے (اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے) خون سے رنگ دی جائے گی" اور بالآخر یہی ہو کر رہا۔[۱]

شہادت کے واقعۂ فاجعہ کی تفصیل یہ ہے کہ تین[۲] خارجی اکٹھا ہوئے جن کے نام یہ ہیں: عبدالرحمٰن ابن عمرو عرف ابن ملجم الحِمیری ثم الکندی، بُرَک بن عبداللہ التیمی اور عمرو بن بکر التیمی، ان سبھوں نے اپنے ہم مشرب اہلِ نہروان کے بارے میں باتیں کیں، جن کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے قتل کیا تھا، اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی، اُس کے بعد ان لوگوں نے کہا: اگر ہم اپنی جان بیچ کر بھی گمراہوں کے سربراہوں کو قتل کر دیں تو ملک کو ان سے نجات مل جائے گی، اور اس طرح ہم اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لے لیں گے، اس پر ابن ملجم نے کہا: علیؓ کو ختم کرنے کی ذمّہ داری میں لیتا ہوں، بُرَک نے کہا، معاویہؓ کا صفایا کرنا میرے ذمہ ہے، عمرو بن بکر نے کہا، عمرو بن العاص کو میں دیکھ لوں گا، ان تینوں نے آپس میں عہد وپیمان کئے، اور ایک دوسرے سے قسم لی کہ کوئی اس معاہدہ کو نہیں توڑے گا،

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۳۲۴ (مختصرًا)

یہاں تک کہ جس کے قتل کی ذمہ داری لی ہے، اس کو قتل نہ کردے یا خود ہلاک نہ ہوجائے، ان لوگوں نے اپنی اپنی تلواریں سنبھالیں اور ان کو زہر میں بجھایا اور طے کیا کہ ۱۷ رمضان کو ہر شخص اس شہر میں رات گزارے جہاں اس کو اپنا کام کرنا ہے۔

ابن ملجم کوفہ پہنچ گیا، اور اپنے ساتھیوں (خوارج) سے بھی اپنے ارادہ کا اظہار نہیں کیا، شب جمعہ ۱۷ رمضان کو اس دروازہ کے پیچھے کے نیچے آکر بیٹھ گیا، جس سے حضرت علیؓ نماز کے لئے نکلا کرتے تھے، جس وقت آپ نماز فجر کے لئے نکلے اور لوگوں کو بیدار کر رہے تھے، نماز نماز کہہ رہے تھے، اور لوگ نیند سے بیدار ہوکر نماز کے لئے اُٹھ رہے تھے کہ ابن ملجم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سر کے اگلے حصہ پر وار کیا، سر کے خون سے ریش مبارک رنگین ہوگئی، جب اس نے وار کیا اس وقت نعرہ بھی لگایا "لاحکم الا للہ، لیس لک ولا صحابک یا علی" (یعنی حکومت صرف اللہ کی ہے، علی! تمہاری یا تمہارے ساتھیوں کی نہیں ہے) حضرت علیؓ نے آواز دی اس کو پکڑو، ابن ملجم پکڑا گیا، جعدہ بن ہبیرہ بن ابی وہب کو آگے بڑھایا جنھوں نے نماز فجر پڑھائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گھر لایا گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں مرجاؤں تو اس کو قتل کر دینا، اور اگر زندہ رہ گیا تو مجھے معلوم ہے کہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے،[1] جب وہ شخص حضرت علیؓ کے سامنے حاضر کیا گیا تو فرمایا: اس کو گرفتار رکھو، اور قید میں حسن سلوک کا معاملہ کرو، اگر زندہ رہا تو سوچوں گا کہ کیا کروں، معاف کروں یا قصاص لوں، اور اگر مرجاؤں تو ایک جان کا بدلہ ایک ہی جان سے لیا جائے، اور اس کا "مُثلہ" نہ کیا جائے۔[2]

اپنے صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ایک طویل وصیت کی جس کے آخر میں فرمایا:

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷، ص ۳۲۸ (مختصراً) [2] الجوہرۃ فی نسب النبیؐ واصحابہ العشرۃ۔ ج ۲ ص ۲۷۴

"مُثلہ" کا مطلب ہے ناک کان کاٹنا اور الگ الگ اعضاء کو زخمی کرنا۔

"اے عبدالمطلب کے فرزندو! مسلمانوں کا بے تکلف خون نہ بہانا تم کہو گے امیرالمؤمنین قتل کر دیئے گئے، مگر خبردار سوائے میرے قاتل کے کسی اور کو قتل نہ کرنا، دیکھو اگر میں اس کے وار سے مر جاتا ہوں تو اس پر بھی ایک ہی وار کرنا، اُس کا مُثلہ نہ کرنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے، خبردار کسی ذی روح کو مار کر اُس کا مُثلہ نہ کیا جائے، خواہ وہ بھونکنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو[۱]"

جُندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے امیرالمؤمنین اگر آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو کیا آپ کی جگہ ہم لوگ حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں؟ فرمایا: نہ میں اس کا تم کو حکم دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی زبان سے جو آخری لفظ نکالے وہ یہ آیت تھی: "فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ۞ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۞" (سورۃ الزلزال ۔ ۷، ۸) آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو خوفِ خدا اور حسنِ عمل کی وصیّت کی، اور وصیت نامہ میں اس کو تحریر فرما دیا۔[۲]

ابن مُلجم نے کہا:۔

"میں نے اُن (حضرت علیؓ) پر ایسا وار کیا ہے کہ اگر پورے شہر والوں پر یہ وار پڑتا تو سب کے سب مر جاتے، واللہ میں نے اپنی تلوار کو ایک مہینہ تک زہر میں بجھایا، ایک ہزار میں یہ تلوار لی تھی، اور ایک ہزار خرچ کر کے اس کو زہر آلود کیا۔"

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، جمعہ کے روز شہید[۳] ہوئے[۴] سحر کا وقت تھا، رمضان کے سترہ[۱] روز

---

[۱] الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ ج ۲ ص ۲۳۸ [۲] ملاحظہ ہو۔ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۲۸ ۔ ۳۲۹

[۳] مولانا رومی کا ایک شعر حسب حال ہے ؎

در بشر روپوش گشتہ آفتاب فہم کن واللہ اعلم بالصواب (مترجم)

[۴] حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے ساتھ جو پیش آیا اور جس طرح وہ اس سازش سے بچ کر نکل گئے اس کی تفصیل "البدایۃ والنہایۃ" ج ۷ ص ۳۳۰ میں ملاحظہ ہو۔

ہو چکے تھے، صحیح روایت کے بموجب حضرت علیؓ نے ۱۷ رمضان کو صبح صادق کے وقت ۴۰ھ میں ۶۳ تریسٹھ سال کی عمر میں سفرِ آخرت اختیار کیا، آپ کی خلافت کی مدت ۴ چار سال ۹ نو ماہ ہے، آپ کے جنازہ کی نماز آپ کے صاحبزادہ حضرت حسنؓ نے پڑھائی، کوفہ کے دارالامارہ میں دفن ہوئے، کیونکہ خوارج سے خوف تھا کہ کہیں آپ کے جسدِ مبارک کو کھود کر نکال نہ لیں[1]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آل اولاد

حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علیؓ کے ۲ دو صاحبزادے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے، اور کہا جاتا ہے کہ ایک صاحبزادہ محسن تھے، جو صغر سنی میں وفات پا گئے تھے، صاحبزادیوں میں حضرت زینب الکبریٰؓ اور اُمِّ کلثومؓ تھیں، اُمِّ کلثومؓ سے حضرت عمر فاروقؓ نے نکاح کیا تھا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

حضرت سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دوسری ازواج سے حضرت علیؓ کی اولاد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ام البنین بنت حذام سے حسب ذیل اولاد ہوئیں، عباس، جعفر، عبداللہ اور عثمان۔

لیلیٰ بنت مسعود سے عبید اللہ اور ابو بکر پیدا ہوئے۔

اسماء بنت عمیس سے محمد اصغر و یحییٰ پیدا ہوئے۔

صہباء بنت ربیعہ (جاریہ) سے ایک فرزند عمر، اور ایک دختر رقیہ۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷ ص ۳۳۰-۳۳۱، ان روایات کو ابن کثیر نے مشتبہ قرار دیا ہے، جس میں کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کا جسدِ مبارک کسی اور جگہ لے جا کر دفن کیا گیا، ان روایات کی صحت بہت مشتبہ ہے۔

امامہ بنت ابی العاص (بنت زینب بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم)
سے ایک فرزند، محمد اوسط۔

خولہ بنت جعفر سے ایک فرزند محمد اکبر جو محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔
سعید بنت عروہ سے اُم الحسن اور رملۃ الکبریٰ، اور ام کلثوم تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔
من جملہ اولاد نرینہ کے صرف پانچ بیٹوں امام حسن، امام حسین، محمد بن الحنفیہ،
عباس اور عمر سے آپ کا سلسلۂ نسل جاری ہے[1]۔

آپ کے صاحبزادہ محمد الاکبر (جو ابن الحنفیہ کے نام سے مشہور ہیں) سر برآوردہ
اور ممتاز قائدین اور بزرگوں میں اُن کا شمار ہے، بہت ہی شجاع اور صاحبِ قوت تھے،
فصاحت بیان میں ممتاز تھے، کتاب اللہ اور سنّتِ نبوی کے بڑے عالم تھے حضرت ابوبکر اور
عمر (رضی اللہ عنہما) کی افضلیت کے قائل تھے، حضرت عثمانؓ کی تعریف کرتے تھے، طائف
میں ۸۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا، اس وقت آپ کی عمر ۶۵ سال تھی[2]۔

ابن خلکان کہتے ہیں کہ محمد بہت ہی پرہیزگار عالم جلیل تھے، جسمانی لحاظ سے بھی
قوی تھے، جنگ جمل میں میں نے ان کو دیکھا تھا، اپنے والد کا جھنڈا وہی اٹھائے ہوئے تھے،
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دو سال پہلے ان کی ولادت ہوئی، وفات محرم
۸۱ھ میں ہوئی، وفات کی تاریخ سے متعلق اختلاف بھی ہے، بقیع میں مدفون ہیں[3]۔

حضرت محمد بن حنفیہؒ کی اولاد میں جلیل القدر علماء، مشائخ وصوفیاء اور مصلح
ومجاہد افراد پیدا ہوئے، ہندوستان کے مختلف مقامات میں یہ خاندان موجود ہے،
تذکرہ اور تراجم کی کتابوں میں اور سلاسلِ تصوف کے سلسلہ میں ان کے نام آتے ہیں،

---

[1] ابن الاثیر والوالفداء [2] الجوہرۃ۔ ج ۲ ص ۲۲۹ [3] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۳۱-۳۱۲

عام طور پر اس خاندان کے افراد "علوی" کہلاتے اور لکھے جاتے ہیں۔

ابن جریر کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کی کُل اولاد چودہ[۱۴] لڑکے اور سترہ[۱۷] لڑکیاں تھیں، واقدی کا بیان ہے کہ آپ کی نسل پانچ[۵] افراد سے باقی رہی، اُن کے نام یہ ہیں: حسن، حسین، محمد بن الحنفیہ، عبّاس اور عمر رضی اللہ عنہم۔

آپ کی حکمت و بلاغت

قبل اس کے کہ ہم سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حکمت آموز اقوال جو ضرب المثل بن گئے ہیں، اور آپ کی بلاغت کے نمونے پیش کریں، اور دکھائیں کہ آپ کے بعض اقوالِ زرّیں ایسے ہیں، جن کی نظیر دوسری زبانوں کی ادبیات میں بھی ملنا مشکل ہے، مناسب ہوگا کہ نامور ادیب و نقّاد الاستاذ احمد حسن الزّیات کی "تاریخ الادب العربی" سے ایک پیراگراف نقل کر دیں جس میں وہ لکھتے ہیں:—

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد گزشتہ زمانوں میں یا بعد کی آنے والی نسلوں میں کوئی بھی علیؓ سے زیادہ فصیح البیان ہمیں نظر نہیں آیا، خطابت میں بھی ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا، جو ایسا زبان آور اور قادر الکلام ہو، وہ حکیم تھے، حکمت کے سوتے ان کے بیان سے پھوٹتے تھے، وہ خطیب تھے، بلاغت کا دریا ان کی زبان سے رواں تھا، واعظ تھے، قلب و نگاہ پر چھا جانے والے، رواں و شاداب قلم جن کے دلائل بڑے قوی و عمیق ہوتے تھے، کلام و بیان پر اس درجہ قدرت تھی کہ جس بات کو چاہتے اور جس طرح چاہتے ادا کرتے، اس پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے کہ آپ

مسلمانوں کے سب سے بڑے خطیب اور انشاپردازوں کے امام تھے"[1]

یہاں ہم عباس محمود العقاّد کی رائے کا اضافہ کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :۔

"امام سے جو پُرشکوہ کلام مروی ہے، وہ ایک ایسا طرز ہے جس سے بلند کوئی دوسرا طرز نہیں ہو سکتا، اس میں ضرب المثل فقروں کی حکمت کارفرما ہے، اور ایک سے بڑھ کر ایک تعبیر ہے کہ عقل کو فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کونسی تعبیر زیادہ افضل اور زیادہ طاقتور ہے، معانی میں صداقت، ادا میں بلاغت کی تعریف کی جائے یا فنّی خوبیوں کو شمار کیا جائے"[2]

ان پُرحکمت کلمات، وصیتوں اور امثال کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت ہی واضح اور روشن طریقہ پر بتا رہے ہیں کہ یہ سب سلامتِ فکر، قوتِ مشاہدہ اور باریک بینی، زندگی کے گہرے مطالعہ اور لوگوں کی فطرت شناسی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام اور تحریریں، گہرے اور طویل تجربات کا نچوڑ ہیں، جو نفسیاتِ انسانی کے عمیق مطالعہ، اسرارِ حیات سے واقفیت اور قوموں کی صحیح نبض شناسی کا نتیجہ ہیں۔

اِن اقوالِ زرّیں میں سے صرف چند اقوال یعنی صرف بیس[۲۰] جملے اور حکیمانہ اقوال پیش کئے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے ان کے شہرۂ آفاق مجموعۂ خُطب و مکاتیب "نہج البلاغہ" پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

"نہج البلاغہ" جس کو الشریف الرضی (۳۵۹ - ۴۰۴ھ) نے جمع کیا ہے، یہ وہ مجموعہ ہے جس میں امیر المؤمنین کے خطبات، مکتوبات و رسائل اور حکیمانہ اقوال و امثال جمع کئے گئے ہیں، اس کے بارہ میں تاریخ ادب عربی کے ایک مشہور مؤرخ و ناقد کی رائے لکھی جاتی ہے۔

---

[1] تاریخ الادب العربی للزیّات ص۱۷۴ [2] العبقریات الاسلامیہ ص۹۷۳-۹۷۴

استاذ احمد حسن الزیّات لکھتے ہیں :-

"کچھ لوگوں کا رجحان اس طرف ہے کہ اس مجموعہ کا بڑا حصہ الشریف الرضی کی تصنیف ہے کیونکہ اُس میں صحابۂ کرام پر طنز و تعریض ہے، اور ان کے حق میں نامناسب الفاظ آ گئے ہیں، اور اس لئے بھی کہ اس میں فلسفۂ اخلاق اور علم الاجتماع کی ایسی باتیں بھی ہیں جو بعد کی پیداوار ہیں، اور بہت باریکی کے ساتھ کسی چیز کا وصف اور صنائع و بدائع کا تکلف پایا جاتا ہے جو اس زمانہ کی چیز نہیں تھی، اور وہ اس زمانہ کے لوگوں کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا، ظاہر ہے کہ اس مجموعہ میں بہت کچھ حضرت علیؓ کا کلام ہے، اور زیادہ حصہ اُن سے منسوب کیا گیا ہے[1]"

لیکن ایک صاحبِ بصیرت ناقد جس کو اُس عصر کی زبان و اُسلوب سے واقفیت اور اُس کا ذوق ہے، وہ جانتا ہے کہ حضرت علیؓ کو استثنائی طور پر کیا وہبی صلاحیتیں اللہ نے عطا کی تھیں اور انسانی نفوس کے کیا تجربات اُن کو حاصل تھے، زندگی کے سرد و گرم کا انھیں کس درجہ تجربہ تھا، جس کو یہ معلوم ہے، وہ بہ آسانی تمیز کر سکتا ہے کہ کون سا کلام اُن کے شایانِ شان ہے، اور کون سا نہیں، اور ان باتوں کو بآسانی تمیز کر سکتا ہے جو اُن کی جانب منسوب ہیں، انہی خطبات و رسائل میں سے جو واقعی انھیں کا کلام ہو سکتا ہے، ہم نے اپنی کتاب میں استشہاد کیا ہے، متعدد مستند ادبی مجموعات مثلاً "الکامل" از المبرّد، "العقد الفرید" از ابن عبد ربہ، اور جاحظ کی "البیان والتبیین" میں بھی یہ عبارتیں آئی ہیں۔

"نہج البلاغہ" کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن کی تعداد پچاس[5] سے زیادہ ہے،

---

[1] تاریخ الادب العربی۔ از الزیّات صنہ ۲۳ طبع القاہرہ۔

ان میں امام بیہقی، امام فخر الدین الرازی کی شروح بھی ہیں، عزّ الدین بن ابی الحدید المدائنی نے اس کی سب سے مفصّل اور صحیح شرح لکھی ہے، جس کو دار الفکر بیروت نے بیسؔ جلدوں میں شائع کیا ہے، علمائے متأخرین میں سے شیخ محمد عبدہ نے بھی "نہج البلاغہ" کی شرح لکھی، اور ادبی و تعلیمی حلقوں کو اس کی اہمیت اور اس سے استفادہ کی طرف خصوصی توجہ دلائی، اس سے اس کے ساتھ اعتنا اور اہتمام بڑھ گیا۔

۱۔ قیمة كل امرئ مایحسنه۔	ہر انسان کی قیمت اس کام سے لگائی جاتی ہے جس کو وہ (دوسروں کے مقابلہ میں، اور اپنے دوسرے کاموں کے مقابلہ میں) بہتر طریقہ پر انجام دیتا ہے (انسان کی قیمت اس کے خاص ہنر سے لگائی جاتی ہے)
۲۔ كلّموا الناس على قدر عقولهم، أتحبّون أن يكذّب الله ورسوله	لوگوں سے اُن کی ذہنی سطح اور فہم کے مطابق بات کرو، کیا تمھیں پسند ہے کہ کوئی (اپنے فہم و ادراک سے بالا ہونے کی وجہ سے) اللہ اور اُس کے رسولؐ کو جھٹلائے۔
۳۔ احذروا صولة الكريم إذا جاع، وصولة اللئيم إذا شبع۔	ایک شریف آدمی اس وقت بے قابو ہوتا ہے جب بھوکا ہو اور ایک پست فطرت انسان اس وقت بے قابو اور جامہ سے باہر ہوتا ہے، جب شکم سیر ہو (اور اُس کو

کسی کی ضرورت نہ ہو۔)

۴۔ أجموا هذه القلوب والتمسوا لها طرف الحكمة فإنها تمل كما تمل الأبدان.

اُن دلوں کو بھی آرام دو، اُن کے لئے حکمت آمیز لطیفے تلاش کرو، کیونکہ جسموں کی طرح دل بھی تھکتے اور اُکتا جایا کرتے ہیں۔

۵۔ النفس مؤثرة للهوى، آخذة بالهوينى، جامحة إلى اللهو، أمّارة بالسوء، مستوطنة للفجور، طالبة للرّاحة، نافرة عن العمل، فإن أكرهتها أنضيتها، وإن أهملتها أرديتها.

نفس خواہشات کو ترجیح دیتا ہے، سہل اور سست راہ اختیار کرتا ہے، تفریحات کی طرف لپکتا ہے، بُرائیوں پر اُبھارتا ہے، بدی اس کے اندر جاگزیں رہتی ہے، راحت پسند ہے، کام چور ہے، اگر اس کو مجبور کروگے، تو لاغر ہو جائے گا، اور اگر چھوڑ دوگے تو ہلاک ہو جائے گا۔

۶۔ ألا لا يرجونّ أحدكم إلّا ربّه، ولا يخافنّ إلا ذنبه، ولا يستحي أحدكم إذا لم يعلم أن يتعلّم، وإذا سُئل عمّا لا يعلم أن يقول لا أعلم.

خبردار و ہوشیار! اللہ کے سوا قطعاً تم میں سے کوئی کسی سے امید نہ قائم کرے، اپنے گناہوں کے سوا کسی بات سے نہ ڈرے، اگر کوئی چیز نہ آتی ہو تو سیکھنے سے شرم نہ محسوس کرے، اور اگر اس سے کوئی ایسی بات دریافت کی جائے جس کو نہ جانتا ہو تو کہدے مجھے معلوم نہیں۔

۷۔ الفقر یُخرس الفَطِن عن حجتہ، والمقلُّ غـریب فی بلدتہ۔	غربت ذہانت کو کند کردیتی ہے، ایک غریب آدمی اپنے وطن میں رہ کر بھی پردیسی ہوتا ہے۔
۸۔ العجز آفة، والصبر شجاعة، والزھد ثروة، والورع جُنّة	ناکارگی آفت ہے، صبر بہادری ہے، زُہد خزانہ ہے، خوفِ خدا ڈھال ہے۔
۹۔ الآداب حُلَل مجــدّدة، والفکر مرآة صافیة۔	اخلاق و آداب ایسے جوڑے ہیں جو باربار نئے پہنے جاتے ہیں، ذہن ایک صاف و شفاف آئینہ ہے۔
۱۰۔ إذا اقبلت الدنیـا علی أحد اعارتہ محاسن غیرہٖ وإذا ادبرت عنہ سلبتہ محاسن نفسہ۔	جب کسی کا اقبال ہوتا ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی اس سے منسوب کردی جاتی ہیں اور جب زوال آتا ہے تو اس سے اس کی ذاتی خوبیوں کا بھی انکار کردیا جاتا ہے۔
۱۱۔ ما أضمر أحد شیئاً إلا ظھر فی فلتات لسانہ وصفحات وجھہ۔	جب کوئی بات آدمی دل میں پوشیدہ رکھتا ہے تو زبان سے اس کے اشارے مل جاتے ہیں، چہرہ کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہو جاتا ہے۔
۱۲۔ لاتکن عبد غیرك وقـد جعلك اللہ حُرّا۔	کسی دوسرے کے غلام مت بنو، جب کہ اللہ نے تم کو آزاد پیدا کیا ہے۔

۱۳۔ ایّاك والاتّکال علی المُنیٰ فإنها بضائع النّوکی۔
جھوٹی تمنّاؤں پر بھروسہ کرنے سے بچتے رہو تمنّائیں بیوقوفوں کا سرمایہ ہیں۔

۱۴۔ ألا أُنبّئکم بالعالِم کل العالِم من لم یزیّن لعباد اللہ معاصی اللہ، ولم یؤمنهم مکرہ، ولم یؤیّس من رَوحہ۔
تم کو بتاؤں کہ سب سے بڑا عالم کون ہے؟ وہ جو بندگانِ خدا کو معصیت کی باتیں حسین بنا کر نہ دکھائے اور خدا کی کارروائی سے بےخطر نہ رکھے، اور اس کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے۔

۱۵۔ الناس نیام، إذا ماتوا انتبهوا۔
لوگ محوِ خواب ہیں جب مریں گے تو ہوش آجائے گا۔

۱۶۔ الناس اعداء ما جهلوا۔
لوگ جن باتوں کو نہیں جانتے اُن کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

۱۷۔ الناس بزمانهم أشبه منهم بآبائهم۔
لوگ اپنے آباء واجداد سے زیادہ اپنے زمانہ کے مشابہ ہوتے ہیں (یعنی لوگوں پر وقت اور ماحول کا اثر زیادہ پڑتا ہے۔)

۱۸۔ المرء مخبوءٌ تحت لسانہ۔
انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے، (یعنی جب تک آدمی بولے نہیں اس کی علمیت اور حقیقت پوشیدہ رہتی ہے۔ (بقول شیخ سعدیؒ

نامردسخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد)

۱۹۔ ماھلك امرء عرف قدرہ ۔	جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس کے لئے کوئی بڑا خطرہ یا دھوکہ کا اندیشہ نہیں۔
۲۰۔ رُبّ کلمۃ سلبت نعمۃ ۔	کبھی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ نعمتوں کو چھین لیتا ہے۔

حضرت علیؓ کے اشعار

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے اشعار کا دیوان بہت مشہور ہے، بہت سے لوگ اُن اشعار سے مثالیں پیش کرتے ہیں، لیکن ناقدوں کو اُس کے اکثر حصہ کے بارے میں شک ہے بعض اشعار اُن کے معیار سے کم درجہ کے ہیں۔

"معجم الأدباء" میں لکھا ہے :۔

"میں نے "کتاب التہذیب" میں ابو منصور محمد بن احمد الازہری اللغوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر پڑھی ہے کہ ابوعثمان المازنی نے کہا کہ یہ بات ہمارے نزدیک مسلّم نہیں ہے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام نے سوائے ان دو۲ شعروں کے اور اشعار کہے ہوں ؎

تلکم قریش تمنانی لتقتلنی
ولا وجدّك ما برّوا ولا ظفروا

فإن هلکتُ فرهنی ذمتی لهم
بذات روقین لا یعفولها أثر[1]

(قریش کے یہ لوگ مجھ کو قتل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں، تمہاری عظمت کی قسم ایسا نہیں ہوگا، اپنی قسم نہ پوری کر سکتے ہیں نہ کامیاب ہو سکتے ہیں، اور اگر میں ہلاک ہوا تو میری جان اُن کے ذمہ دَین ہوگی، ایسی عظیم طاقتور تلوار کے ذریعہ جس کا نشان نہیں مٹ سکتا۔)

ابن ہشام نے "السیرۃ النبویہ" میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار مختلف مقامات پر نقل کئے ہیں لیکن اُن کے حضرت علیؓ کے کلام ہونے کی نسبت میں شک ظاہر کیا ہے۔

طنز و عتاب کا منفرد اُسلوب

اس درد انگیز باب کو ختم کرنے سے پہلے ہم سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے کلام سے طنز و عتاب کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں، جو اس کے مستحق ہیں کہ اذیتِ قلبی اور تلخیٔ احساس کے نتیجہ میں نکلے ہوئے تیر و نشتر کے ذخیرہ میں جس کو دعوتوں، تحریکوں اور ادبیات و اجتماعیات کی تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، ان کو خصوصی مقام دیا جائے، اس ادب کے وجود میں آنے میں اہلِ عراق کے تکلیف دہ رویّہ کا بنیادی حصّہ ہے، اور ان لوگوں کا بھی حصہ ہے، جو بظاہر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت کا دم بھرتے، اور آپ کی جانبداری میں جوش و سرگرمی کا اظہار کرتے تھے، لیکن اُن کا عمل اس کے برعکس تھا، ان جملوں میں حضرت علیؓ کی بلاغت نہ صرف اپنے زمانہ کی حد تک بلکہ ادب و بلاغت کے بین الاقوامی ذخیرہ (رکارڈ) اور

---

[1] معجم الادباء لیاقوت الحموی ۱۴/۴۳ (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی۔ بیروت)

تاریخ ادب کے مختلف ادوار کے لحاظ سے بھی ایک جُداگانہ شان رکھتی ہے۔

اپنے ساتھیوں اور فوجیوں پر طنز و عتاب اس طرح کرتے ہیں :-

"میں کب تک تم کو اس طرح سنبھالتا رہوں، جیسے ان نوعمر اونٹوں کو سنبھالا جاتا ہے، جن کے کوہان اندر سے زخمی ہیں اور ظاہری جسم توانا ہے، یا وہ کپڑے جو جا بجا پھٹ گئے ہیں، اور جتنا سنبھال کر پہنو پھٹتے ہی جاتے ہیں، اگر ایک جگہ سے سی دیئے گئے تو دوسری جگہ سے چاک ہو جاتے ہیں، جب بھی اہلِ شام کا کوئی ہراول دستہ پہنچتا ہے، تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کے در بند کر لیتا ہے، اور ایسا چھپتا ہے، جیسے گوہ اپنے سوراخ میں اور بجّو اپنے بھٹ میں روپوش ہو جاتے ہیں۔

بخدا ذلیل وہ ہے جس کی تم مدد کے لئے اٹھو، تم کو اگر کسی نے تیر بنا کر دشمن پر پھینکا تو گویا اس نے ایسے تیر پھینکے جن کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے، (تفریحی اور بے خطر) میدانوں میں تمھارا ہجوم نظر آتا ہے، اور جنگ کے جھنڈوں کے نیچے نہایت قلیل تعداد میں دکھائی دیتے ہو، میں خوب جانتا ہوں کہ تمھاری اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے، اور کیا چیز تمھاری کمر سیدھی کر سکتی ہے، مگر واللہ میں تمھاری اصلاح کے لئے اپنے آپ کو نہیں بگاڑ سکتا۔

خدا تم سے سمجھے اور تم کو ذلیل کرے! تم کو حق کی اتنی پہچان نہیں جس قدر باطل کو تم پہچانتے ہو، اور باطل کی ایسی مخالفت نہیں کرتے جتنی حق کی مخالفت کرتے ہو۔

اے عراقیو! تم اُس حاملہ عورت کی طرح ہو جس نے جب اس کی حمل کی مدت

پوری ہوئی تو اسقاط ہو گیا، اور اس کا شوہر مر گیا وہ عرصۂ دراز تک بیوگی کی زندگی گزارتی رہی اور اس کا وارث وہ بنا جو سب سے دور کی قرابت رکھتا تھا۔

اور سنو! میں اس ذات پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ یہ (دشمن) قوم تم پر غالب آجائے گی اس لئے نہیں کہ وہ تم سے زیادہ حق پرست ہے، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے باطل پر تیز گام ہے، اور تم میرے حق میں سست گام اور کوتاہ خرام ہو، تو میں اپنے حکام کے ظلم سے ڈرتی ہیں اور میرا حال یہ ہے کہ اپنی رعیت کے ظلم سے ڈرتا ہوں۔

میں نے جہاد پر تم کو اُبھارا مگر تم اپنی جگہ سے ہلے نہیں، تم کو سنانا چاہا تم نے سنا نہیں، تم کو رازدارانہ انداز میں بلایا، علانیہ دعوت دی، مگر تم میں ذرا حرکت نہیں ہوئی، نصیحت کی مگر تمھارے کانوں پر جوں نہ رینگی۔

دیکھنے میں حاضر ہو مگر درحقیقت غائب ہو، غلام ہو مگر آقا بنے ہوئے ہو، تم کو حکمت کی باتیں سناتا ہوں تم بدکتے ہو، تم کو بلیغ انداز میں وعظ و نصیحت کرتا ہوں اور تم اِدھر اُدھر بھاگتے ہو، تم کو باغیوں سے مقابلہ کرنے پر اُبھارتا ہوں مگر اپنی تقریر ختم بھی نہیں کرتا کہ دیکھتا ہوں کہ تم قوم سبا کی طرح منتشر ہو جاتے ہو[1] اپنی مجلسوں میں واپس جاتے ہو، اپنے رائے مشورے میں تمھارے دل لگتے ہیں، میں تم کو صبح کو سیدھا کرتا ہوں اور شام کو تم میرے پاس

---

[1] عربی متن میں ہے "أراكم تتفرقون أيادي سبا" أيادي: فوج، سبا: قوم یمن جو عذاب آنے پر اس طرح بکھر گئی کہ پھر کبھی جمع نہیں ہوئی "ایادی سبا" ضرب المثل ہے اس مجمع کے لئے جو منتشر اور پراگندہ ہو اور اس کے جمع ہونے کی امید نہ ہو۔ (مترجم)

ٹیڑھی کمان کی طرح لوٹتے ہو، سیدھا کرنے والا تنگ آگیا اور جن کو سیدھا کرنا مقصود ہے وہ اکڑ گئے (جن کو سیدھا کیا ہی نہیں جا سکتا۔)

اے لوگو! جو جسم سے حاضر ہیں، مگر اُن کی عقلیں غائب ہیں، جن کی خواہشات جُدا جُدا ہیں، جن سے اُن کے حُکّام آزمائش میں ہیں، اُن کا ساتھی (بہ معنی آقا، رہنما، لیڈر) اللہ کا اطاعت گزار ہے، اور تم اس کی نافرمانی کرتے ہو، شام کا رہنما اللہ کی معصیت کرتا ہے مگر اس کی قوم اس کے ساتھ ہے، بخدا اگر معاویہ مجھ سے صرّافوں کا معاملہ کریں جو دینار کے بدلہ درہم دیا کرتے ہیں تو مجھ سے دس عراقی لے کر ایک شامی دے دیں تو مجھے منظور ہوگا، یہ لوگ حق کے معاملہ میں متفرق، جنگوں سے ہمت ہارے ہوئے، اُن کے جسم یکجا، مگر خواہشات منتشر، ہر جا عہد و پیمانِ خداوندی کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، لیکن ان کے اندر حمیّت بیدار نہیں ہوتی، یہ عرب کے چوٹی کے لوگ اور قوم کے باعزّت و ممتاز افراد ہیں لیکن اُن کی کثرتِ تعداد سے کچھ فائدہ نہیں، اس لئے کہ اُن کے دل مشکل سے کسی امر پر مجتمع ہوتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ تم کو اپنے زخم کا مرہم بناؤں اور تم ہی میرے زخم ہو، جیسے کوئی جسم میں چبھ کر ٹوٹ جانے والے کانٹے کو کانٹے ہی سے نکالنا چاہے، اور وہ جانتا ہے کہ وہ کانٹا اس پہلے کانٹے ہی کا ساتھ دے گا (اور ٹوٹ کر اور مصیبت بن جائے گا۔)

میں تمھیں دیکھتا ہوں کہ تم گوہ کی طرح ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہو، نہ تو حق کو ہاتھ میں لیتے ہو، نہ ظلم و زیادتی کو روکتے ہو، نہ جنگ و مقابلہ کے موقع پر جم کر لڑنے والے، نہ امن و سکون کے زمانہ میں قابلِ اعتبار رفیق و معاون، میں تمھاری صحبت سے بیزار ہوں، اور تمھارے ہوتے ہوئے اور کثرتِ تعداد کے باوجود تنہائی محسوس کرتا ہوں۔

اے وہ لوگو! جن کے جسم مجتمع ہیں، اور خواہشات مختلف، تمہاری گفتگو پتھروں کو نرم کردیتی ہے، اور تمہارا طرز عمل دشمنوں کو حملہ پر اُبھارتا ہے، جو تمھیں بلائے اور پکارے اس کو مایوسی ہو، اور جس کا تم سے واسطہ پڑے وہ کبھی اطمینان کی سانس نہ لے سکے، باتیں بنانا اور فریب میں رکھنا تمہارا دستور ہے، تم نے مجھ سے مہلت مانگی جیسے وہ مقروض مہلت مانگتا ہے، جس پر مدّت سے قرض چڑھا ہوا ہے، کس وطن و دیار کی تم حفاظت کروگے، جب اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکے، اور میرے بعد کس امیر و قائد کی حمایت و معیّت میں تم جہاد کروگے؟ حقیقی فریب خوردہ وہ ہے جس کو تم نے دھوکہ دیا، جس کے حصّہ میں تم آئے، اس کے حصّہ میں ایک خطا کرنے والا اور نشانہ پر نہ لگنے والا تیر حصّہ میں آیا۔"[1]

---

[1] "نہج البلاغہ" سے ماخوذ اقتباسات۔

باب ہشتم

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ خلافت کے بعد

آپ کی سیرت پر اجمالی نظر، دنیا سے بے رغبتی اور خشیت الہٰی، امام مربّی و مصلح، طرز حکومت کے بارے میں آپ کے فیصلے اور اقدامات اور اس سلسلے میں منصفانہ قول، حضرت معاویہؓ اور ان کے عہد کا اسلامی معاشرہ،

اپنے دورِ خلافت میں آپ کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد شاید ہی کسی عظیم تاریخی شخصیت کی ایسی قلمی تصویر کھینچی گئی ہو گی جو احساسات، حالات، رجحانات و تصورات اور انسان کے فطری ذوق و وجدان کی عکاس ہو جیسی کہ ضرار بن ضمرہ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک رفیق) نے حضرت علی رضؓ کے متعلق اپنے مشاہدات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

حضرت معاویہؓ کی فرمائش پر اور اُن کی مجلس میں، اور اُن کے سامنے انھوں نے جو کہا اس میں جہاں محبت واحترام کی جھلک ہے وہیں شہادت کی وہ صداقت بھی نمایاں ہے، جو صرف اللہ ہی کے لئے ممدوح کی غیر موجودگی میں دی جاتی ہے، وقت و ماحول کی نزاکت اور مکمل احساس ذمہ داری اور جرأت کے ساتھ بیان کئے ہوئے یہ جملے ایک بہترین ادبی مرقع بن گئے ہیں۔

ابو صالح سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے ضرار بن ضمرہ سے کہا کہ بتاؤ علی (رضی اللہ عنہ) کیسے تھے؟ ضرار نے کہا اگر آپ مجھے معاف رکھیں تو بہتر ہو گا، انھوں نے کہا، نہیں، بیان کرو، کہنے لگے، کیا آپ مجھے اس خدمت سے معاف نہیں کریں گے؟ کہا: نہیں، نہیں، کہنا ہو گا، اس پر وہ بولے: اچھا تو سنئے!

"اُن کی نظر انتہائی دُور رس تھی، اُن کے قُویٰ انتہائی مضبوط تھے، بات دو ٹوک اور صاف صاف کہتے، اور فیصلے پورے عدل وانصاف کے ساتھ کرتے، اُن کی شخصیت سے علم کے چشمے اُبلتے تھے، دنیا اور دنیا کی دل آویزیوں سے متوحش رہتے، رات اور اس کی تاریکی سے دل لگاتے تھے، خدا گواہ ہے کہ (راتوں کو

عبادت میں) اُن کے آنسو تھمتے نہ تھے، دیر دیر تک فکر مند اور سوچتے رہتے، اپنے کفِ دست کو اُلٹتے پلٹتے اور اپنے آپ باتیں کرتے، موٹا جھوٹا پہنتے، رُوکھا سُوکھا کھاتے، بخُدا بالکل اپنے ہی ساتھیوں اور بے تکلف لوگوں کی طرح رہتے، جب کچھ پوچھا جاتا جواب دیتے، جب اُن کے پاس جاتے تو خود دیڑھ کر بات شروع کرتے، جب بلاتے تو حسبِ وعدہ آجاتے لیکن ہم لوگوں کو (باوجود اس قربت اور رفاقت اور اُن کی سادگی کے اُن کا رُعب ایسا تھا کہ) ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہ ہوتی اور نہ کوئی گفتگو چھیڑتے، اگر وہ مسکراتے تو آپ کے دندان ایسے نظر آتے جیسے سفید موتیوں کی لڑی ہو، دینداروں کی توقیر کرتے، مساکین سے محبت کرتے کسی طاقتور انسان کی یہ جُرأت نہ تھی کہ اُن سے باطل کی تائید میں توقع رکھتا اور کوئی کمزور اُن کے عدل و انصاف سے مایوس نہ ہوتا۔

اور میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اُن کی راتوں کے چند مناظر دیکھے ہیں کہ رات نے اپنی سیاہ چادر پھیلا دی ہے، تارے ڈوبنے لگے ہیں، اور علی محراب مسجد میں اپنی داڑھی ہاتھ سے پکڑے درد بھرے شخص کی طرح رو رہے ہیں اور اس طرح تڑپ رہے ہیں، جیسے کوئی ایسا شخص تڑپے جس کو کسی زہریلے سانپ بچھو نے ڈس لیا ہو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی آواز اب بھی سنائی دے رہی ہے، اور وہ کہہ رہے ہیں۔

"اے دنیا کیا تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے یا مجھ سے کوئی امید رکھتی ہے؟ مجھ سے کچھ اُمید نہ رکھ، میرے علاوہ کسی اور کو فریب دے، میں تو تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں جس کے بعد تیری طرف رجعت کی گنجائش ہی نہیں، تیری عمر کوتاہ،

تیری دی ہوئی کامرانی حقیر، تیرے خطرات بھیانک اور بڑے، آہ! زادراہ کتنا کم ہے، سفر کتنا طویل ہے، اور راستہ کس درجہ سنسان ہے"۔

"راوی کہتے ہیں: یہ سن کر معاویہؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور اس کے قطرے ان کی داڑھی پر گرنے لگے، اپنی آستین سے وہ آنسو پونچھنے، اور رونے سے آواز حلق میں گھٹنے لگی، پھر معاویہؓ نے کہا: اللہ ابوالحسن پر رحم فرمائے، واقعی اُن کا یہی حال تھا ضرار! تم اپنا حال کہو اُن کی جدائی سے کیا محسوس کرتے ہو؟ کہا: مجھے ایسا غم ہے جیسا اس عورت کو ہوگا جس کا بچہ اس کی گود میں ذبح کر دیا گیا ہو، اور نہ اس کے آنسو تھمتے ہوں، نہ غم ہلکا ہوتا ہو"[1]۔

دنیا سے بے رغبتی اور خشیتِ الٰہی

حضرت علیؓ کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، اور وہ بات جو اُن کی علامت اور پہچان بن گئی تھی، وہ اُن کی دنیا سے ایسی حالت میں بے رغبتی و بے نیازی تھی، جب کہ عیش و آرام کے تمام اسباب اُن کے قدموں پر تھے، اور حکومت کے پورے اختیارات اور فراغت و دولت کے سارے وسائل و اسباب آپ کو حاصل تھے، لوگوں کی طرف سے تعظیم و تکریم میں کمی نہ تھی، کوئی اُن پر نقد نہیں کر سکتا تھا، اور نہ محاسبہ کر سکتا تھا۔

یحییٰ بن معین علی بن جعد سے روایت کرتے ہیں، اور وہ حسن بن صالح سے نقل کرتے ہیں کہ "حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس[2] میں ایک بار زہاد (دنیا سے بے رغبتی میں ممتاز افراد)

---

[1] "صفۃ الصفوۃ" از ابن الجوزی ج ۱ ص ۱۲۱-۱۲۲ (دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، ط ۱ ۱۳۵۵ھ)

[2] حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خود بھی بڑے زاہدوں میں تھے، (ملاحظہ ہو سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن الجوزی)

کا ذکر چھڑا تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کہا کہ "أزهد الناس فی الدنیا علی بن أبی طالب" دنیا میں سب سے زیادہ زاہد علی بن ابی طالب تھے[1]

ابو عبیدہ عنترہ کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ انھوں نے کہا: "میں خورنق[2] میں علی بن ابی طالبؓ کے پاس گیا، وہ ایک چادر اوڑھے ہوئے سردی سے کانپ رہے تھے، میں نے کہا: امیر المؤمنین! اللہ نے آپ اور آپ کے افرادِ خاندان کے لئے اس مال میں حصہ رکھا ہے اور آپ سردی سے کانپ رہے ہیں؟ فرمایا: "میں تمھارے مال سے کچھ نہیں لیتا، میری یہی چادر ہے جس کو میں اپنے گھر سے لے کر نکلا تھا" ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: "یہی چادر ہے جس کو میں مدینہ سے لے کر نکلا تھا"[3]

ابو نُعیم، بنی ثقیف کے ایک ایسے شخص کے حوالہ سے کہتے ہیں جن کو حضرت علیؓ نے عکبرا[4] کا حاکم (گورنر) بنایا تھا، اُن کا بیان ہے کہ اس علاقہ[5] میں نمازی نہیں تھے، (حضرت علیؓ وہاں آئے) تو مجھ سے کہا کہ جب ظہر کا وقت ہو تو میرے پاس آجانا، چنانچہ ظہر کے وقت میں وہاں پہونچا تو دیکھا حضرت علیؓ کے سامنے ایک پیالہ اور پانی کا ایک آبخورہ رکھا ہے، آپ نے مٹی کی ایک ہانڈی طلب کی جو وہاں رکھی تھی، جب اُن کے سامنے آئی تو اس پر

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص۵ [2] خورنق: شاہی محل، امیر کے رہنے کا قلعہ یا وہ جگہ جہاں قدیم ایرانی محل خورنق تھا۔ (مترجم)

[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۳، اور اسی طرح کی روایت ابو نعیم نے "الحلیۃ" میں کی ہے۔ ج ۱ ص۸۲

[4] موصل کے قریب ایک شہر ہے، یہاں بہت سے مصنّفین پیدا ہوئے مثلاً "املاء ما من بہ الرحمٰن" کے مؤلف حسین بن عبد اللہ العکبری۔ (مترجم)

[5] اصل لفظ السواد ہے "أقرب الموارد" میں ہے کہ بصرہ اور موصل کے درمیانی مقامات کو السواد کہتے ہیں، لیکن عام طور پر پورے عراق کو السواد کہتے ہیں۔ (مترجم)

مہر لگی تھی، میں نے دل میں کہا کہ یہ میری لالچ بڑھا رہے ہیں کہ اس میں سے کوئی ہیرا جواہر نکالیں گے، مگر جب انھوں نے اس کی مہر توڑی تو اس میں صرف ستّو تھا، آپ نے اس میں سے کھوڑا نکالا، اس پر پانی ڈالا، خود پیا اور مجھے بھی پلایا، مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے کہا: "امیر المؤمنین! آپ عراق میں رہ کر یہ کھاتے ہیں، یہاں کے عوام کا کھانا بھی اس سے کہیں بہتر ہوتا ہے" فرمایا: واللہ میں اس کو مُہر بند بُخل کی وجہ سے نہیں رکھتا، بات یہ ہے کہ میں اسی قدر خریدتا ہوں جتنی ضرورت ہو اور ڈرتا ہوں کہ اگر یہ ختم ہو جائے تو دوسرے مال سے ستّو بنا دیا جائے، اس لئے اس کی اتنی حفاظت کرتا ہوں، میں پسند نہیں کرتا کہ میرے پیٹ میں سوائے حلال و پاک چیز کے کچھ جائے۔"[1]

ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں فالودہ پیش کیا گیا، آپ نے اس فالودہ کو مخاطب کر کے فرمایا: تیری خوشبو اچھی ہے، رنگ حسین ہے، مزہ لذیذ ہے، مگر میں نہیں چاہتا کہ نفس کو ایسی چیز کا عادی بناؤں جس کا وہ اب تک عادی نہیں ہے۔[2]

زید بن وہب سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت علیؓ اپنے گھر سے اس حال میں نکلے کہ ایک تہ بند باندھے ہوئے تھے، اور ایک چادر سے جسم ڈھکے ہوئے تھے، تہ بند کو کپڑے کے ایک چیتھڑے سے (کمر بند کی جگہ) باندھ رکھا تھا، اُن سے کہا گیا کہ آپ اس لباس میں کس طرح رہتے ہیں؟ تو فرمایا: میں یہ لباس اس لئے پسند کرتا ہوں کہ یہ نمائش سے بہت دُور اور نماز میں عافیت دِہ ہے، اور مومن کی سنّت ہے۔[3]

مجمع بن سمعان التیمی سے روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لئے بازار کی طرف گئے اور وہاں جا کر کہا کون مجھ سے یہ تلوار خریدتا ہے؟ اگر میرے پاس

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۸۲ (دار الکتاب العربی بیروت، ط ۳ سنہ ۱۹۸۰ء) [2] ایضاً ج ۱ ص ۸۱، [3] المنتخب ج ۵ ص ۵۸

چار[۴] درہم ہوتے جن سے میں تہ بند خرید سکتا تو یہ تلوار نہ فروخت کرتا۔[۱]

احمد عبداللہ بن رزین کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے میری طرف خربوزہ بڑھایا، ہم نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ نے بط کھلائی ہوتی، اللہ نے بہت فراغت کی ہے، فرمایا: یا ابن رزین! میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ خلیفہ کے لئے صرف دو ہی کھانے حلال ہیں، ایک جس کو وہ خود اور اس کے گھر والے کھائیں اور دوسرا وہ جو لوگوں کے سامنے پیش کرے۔[۲]

ابو عبیدہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سال میں تین[۳] بار مقررہ حصّے تقسیم کئے، اس کے بعد اصبہان سے مال آگیا، آپ نے فرمایا اس کو چوتھی بار دی جانے والی رقم قرار دو، میں تمھارے مال کا خازن نہیں ہوں، کچھ لوگوں نے اس کو لیا اور کچھ لوگوں نے نہیں لیا۔[۳]

ایک بار حضرت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اس میں فرمایا:۔

"لوگو! اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے تمھارے مال سے نہ تھوڑا لیا ہے، نہ بہت، سوائے اس شئے کے، اور جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دکھائی، جس میں عطر یا کوئی خوشبو تھی، حضرت علیؓ نے کہا مجھے ایک دہقان نے یہ ہدیہ دیا ہے، پھر وہ بیت المال تشریف لائے، اور کہا یہ لو (وہ شیشی بیت المال میں جمع کر دی) اور یہ شعر پڑھنے لگے ؎

أفلح من كانت له قوصرة[۴]   يأكل منها كل يوم تمرة

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۳ [۲] ایضاً [۳] کنز العمال ج ۲ ص۳۲۰، عربی متن میں ہے" أنه أعطى العطاء في سنة ثلاث مرات" العطاء اصطلاح میں اس مقررہ یا غیر مقررہ رقم یا مال کو کہتے ہیں، جو بیت المال سے فوجیوں یا اصحاب خدمت کو دی جایا کرتی تھی (مترجم) [۴] القوصرۃ: لکڑی کے چھوٹے سے ڈبّہ کو کہتے ہیں۔

کامیاب ہوا وہ جس کے پاس ایک لکڑی کا چھوٹا سا ڈبہ ہو، اس میں سے روزانہ ایک کھجور نکال کر کھا لیتا ہو۔"

ہبیرۃ بن مریم کا بیان ہے: انھوں نے کہا کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے حضرت علیؓ کی وفات پر ایک مرتبہ خطبہ دیا اس میں فرمایا:۔

"اے لوگو! کل تم سے ایک ایسا شخص جدا ہوا ہے، جس نے سونا چاندی نہیں چھوڑا ہے، صرف سات سو درہم اس کی تحویل میں تھے جو اس کو بیت المال کے مقررہ حصہ میں ملے تھے، اس رقم سے وہ ایک خادم خریدنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"[1]

مال اور کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط و تورّع سے زیادہ مشکل زُہد وہ ہے جو حکمِ شرع اور قاضی کے فیصلہ پر سر جھکا دینے اور راضی خوشی اس کو قبول کرنے پر مائل کرے خاص طور پر جب کہ فریقِ ثانی غیر مسلم ہو اور ایسے موقع پر اپنی سیادت اور حکمرانی کا اظہار بھی نہ کرے، یہ بات مذکورہ ذیل قصّہ میں نظر آتی ہے۔

حاکم، شعبی سے روایت کرتے ہیں:۔

"معرکۂ جمل کے موقع پر علی رضی اللہ عنہ کی زِرہ ضائع ہو گئی، ایک شخص کو ملی اس نے بیچ ڈالی کسی نے ایک یہودی کے پاس وہ زرہ دیکھ کر پہچان لیا، اس کا مقدمہ شُریح کے محکمۂ قضا میں پہنچا، علیؓ کی طرف سے شہادت حسنؓ اور ان کے غلام قنبر نے دی، قاضی شُریح نے کہا حسنؓ کے بجائے کوئی اور گواہ لائیے، حضرت علیؓ نے فرمایا، کیا آپ کو حسنؓ کی شہادت قبول نہیں ہے؟ کہا: نہیں، لیکن میں نے آپ کی ہدایت یاد رکھی ہے کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت قبول نہیں کی جاتی،

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ۔ کتاب الفضائل "ج ۱۲ ص ۷۶ (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی۔ پاکستان۔ ۱۹۸۷ء)

پھر یہودی سے کہا، یہ زرہ تم لے لو، یہودی نے کہا: امیرالمؤمنین خود سے مسلمانوں کے قاضی کے پاس آئے اور اس نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور اس پر وہ راضی رہے!! واللہ اے امیرالمؤمنین آپ نے سچ کہا تھا، یہ آپ ہی کی زرہ ہے، آپ کے اونٹ سے گر گئی تھی، جس کو میں نے اٹھا لیا تھا" اشهد ان لا الٰہ الا اللہ واشهد ان محمدا رسول اللہ" حضرت علیؓ نے وہ زرہ اس کو بخش دی اور وہ شخص جو اسلام لایا تھا، ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا اور صفّین کے موقع پر شہید ہوا۔"[1]

اس زہد، ورع اور صلابتِ دینی کے باوجود آپ میں کبھی خشکی و تُرش روئی، چہرے اور پیشانی پر نفرت و بیزاری کے آثار نہیں دیکھے گئے، آپ اُن میں بھی نہیں تھے، جن کی صحبت سے لوگ ان کی خشکی اور خشک مزاجی کی وجہ سے دور رہتے ہیں، اور پاس بیٹھنے سے گھبراتے ہیں، اس کے برخلاف آپ انتہائی خندہ جبیں محبت و شفقت سے پیش آنے والے تھے، چہرہ پر شگفتگی کے آثار نظر آتے تھے، آپ کے اوصافِ ذاتی بیان کرنے والوں نے لکھا ہے:۔

"آپ میں مردانہ حُسن اور وجاہت تھی، متبسّم رہتے تھے، چال میں میانہ روی تھی، زمین پر ہلکے قدم رکھتے تھے۔"[2]

ذمّہ دارانِ حکومت (والی و عُمّال) اور عام مسلمانوں کے ساتھ آپ کا رویّہ

— والیوں (مقامی حکمرانوں) اور عُمّال (سرکاری محصول اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں)

---

[1] کنز العمال ج ۴ ص ۶، حاکم نے "الکنی" میں، اور ابو نعیم نے "الحلیۃ" (ج ۴ ص ۱۳۹) میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ [2] البدایۃ والنهایۃ ج ۷، ص ۲۲۳

کے ساتھ آپ کا یہی انداز تھا، اور عملی طور پر یہ بہت دشوار ہوتا ہے کہ حاکمِ وقت یا خلیفہ اس درجہ زُہد کا پابند ہو اور اس کا عمل عزیمت پر ہو۔

آپ اپنے کارندوں کو بار بار وصیّت فرماتے تھے:۔

"لوگوں کے ساتھ مُنصفانہ و مُساویانہ رویّہ رکھو، ان کی ضروریات کو صبر سے سنو، کیونکہ یہ لوگ مسلم رعیت کے ترجمان ہیں، کسی کو اپنی حاجت پیش کرنے سے نہ روکو، اور اس کی ضرورت پوری کرنے میں زیادہ دیر تک انتظار کی تکلیف نہ دو، خراج کی وصولیابی میں کسی کے جاڑے کا کپڑا فروخت نہ کرو، اور نہ اس کی سواری فروخت کرو جس پر وہ اپنا سامان لے کر جاتا ہے، اور نہ کسی غلام کو فروخت کرو، اور کسی کو ایک درہم کے مطالبہ میں ایک کوڑا بھی نہ لگاؤ۔"

خراج اور صدقات تحصیل کرنے والوں کو جو آپ نصائح کرتے رہتے تھے، ان میں سے چند اقوال:۔

"جب زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے جاؤ تو وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جاؤ، جب اُن لوگوں کے درمیان پہونچو تو سلام کرو (اور پھر پورا انداز میں سلام کے الفاظ ادا کرو) اس میں کمی یا اختصار نہ کرو، پھر ان سے کہو کہ اللہ کے مقرر کردہ والی اور خلیفہ نے آپ کے پاس مجھے بھیجا ہے کہ آپ کے مال میں جو اللہ کا حق ہے، وہ آپ سے وصول کروں تو کیا آپ کے اموال میں ایسا حق ہے، جو اس کے والی کو آپ ادا کریں؟

اس پر اگر کوئی کہے، نہیں تو دوبارہ اس کو کچھ نہ کہیں اور اگر وہ دے تو اس کے ساتھ جاؤ بغیر اس کے کہ اس کو ڈرائیں دھمکائیں، سختی کریں یا مصیبت و مشقّت میں ڈالیں، جو سونا چاندی دے اس کو قبول کرلو،

اگر اس کے پاس اونٹ یا دوسرے قسم کے جانور کے ریوڑ ہوں تو بلا اجازت اس کے باندھنے کی جگہ پر نہ چلے جائیں کیونکہ ان میں اکثر مال اسی کا ہے، اور اگر وہاں جاؤ تو ایسے نہ جاؤ جیسے کوئی شخص کسی پر مسلط ہوتا ہے یا سختی و درشتی سے پیش آتا ہے، کسی جانور کو بدکاؤ نہیں، اور نہ اس کو خوفزدہ کرو، اور ان کے مالکوں سے اس سلسلہ میں کوئی بدسلوکی روا نہ رکھی جائے، اور مال (غلہ وغیرہ) کو جب لینا ہو تو اس کو دو برابر ناپ کے برتنوں میں تقسیم کرو، اور اس سے کہو کہ ان دو میں سے کوئی ایک لے لو، جس کو چاہے وہ لے، اس پر اعتراض نہ کریں، پھر باقی ماندہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دو اور کہو کہ ان میں سے ایک لے لو، جس کو وہ لے اس پر اعتراض نہ کریں، اسی طرح تقسیم کرتے کرتے جب وہ حصہ آجائے جس قدر اللہ کا حق ہے، اس کو اللہ کا حق سمجھ کر لے لیں، اور اگر وہ واپس لینا چاہے یا دوبارہ ناپنا چاہے تو اس کی بات مان کر واپس کر دیں[۱]۔"

مُربّی و مُصلح امام

حضرت علیؓ کوئی انتظامی امور کے حاکمِ اعلیٰ یا اس طرح کے عُرفی خلیفہ نہیں تھے، جیسے اموی وعباسی خلیفہ تھے، بلکہ وہ شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کے انداز و نہج کے خلیفۃ المسلمین تھے، مسلمانوں کے حقیقی معنوں میں ولی الأمر، معلم، مُربّی اور عملی مثال قائم کرنے والے، اخلاقی و دینی امور کی نگرانی اور احتساب کرنے والے تھے، لوگوں کے رجحانات وخیالات اور تصرفات پر نظر رکھنے کہ وہ کس حد تک اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[۱] "نہج البلاغہ" صفحہ ۳۸۱ (دار الکتاب اللبنانی بیروت۔ ط ۱۳۸۷ھ۔ ۱۹۶۷ء)

کے اُسوہ کے مطابق ہیں، اور کہاں تک اس اُسوہ سے دُور اور مُنحرف، اور کس حد تک انھوں نے مغلوب اقوام اور مفتوحہ علاقوں کی تہذیب و تمدّن کا اثر قبول کیا ہے، آپ لوگوں کو نماز پڑھاتے، اُن کو نصیحتیں فرماتے، دین کے مسائل بتاتے اور دین کا فہم اُن کے اندر پیدا کرتے، اُن کو بتاتے کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے، اور کن باتوں کو ناپسند فرماتا ہے، آپ مسجد میں بیٹھتے، لوگ آپ کے پاس آیا کرتے، اپنے معاملات میں مشورے لیتے، کوئی دینی مسئلہ پوچھتا تو اُس کو بتاتے، دنیاوی اُمور میں صلاح و مشورہ دیتے، بازاروں میں چلتے پھرتے کاروباری لوگوں کی نگرانی کرتے کہ کس طرح خرید و فروخت کرتے ہیں، ان کو نصیحت فرماتے اور کہتے: "اللہ سے ڈرو اور ناپ تول کا پورا پورا لحاظ رکھو، لوگوں کا حق نہ مارو۔"

اپنی ذات کے معاملہ میں انتہائی محتاط تھے، اپنے منصب اور خاندانی برتری کا مطلقًا استحصال نہیں کرتے تھے، اگر بازار سے کوئی چیز خریدنا ہوتا تو دوکانداروں اور بیچنے والوں میں سے ایسے دوکاندار یا بائع کو تلاش کرتے جو آپ کو پہچانتا نہ ہو، اور اسی سے سودا خریدتے، اس کو سخت ناپسند کرتے کہ کوئی تاجر آپ کے ساتھ اس لئے رعایت کرے کہ آپ امیر المؤمنین ہیں، اس بات کی پوری کوشش کرتے کہ لوگوں کے درمیان اپنے قول، عمل اور برتاؤ میں اور اپنی مجلسوں میں مساوات قائم رکھیں، اور اپنے کارندوں اور عاملوں سے اس طرح کا مطالبہ کرتے اور علاقوں کے حاکموں سے بھی اسی کی توقع رکھتے، اُن حکام کی سخت نگرانی کرتے اور کبھی کبھی اچانک معائنہ کرنے والوں کو بھیجتے کہ وہ جاکر دیکھیں کہ حُکّام کا عوام کے ساتھ کیا سلوک ہے، اور عوام کی اُن حکام کے بارے میں کیا رائے ہے؟ آپ کے مقرر کردہ کارندوں اور حُکّام پر آپ کی ہیبت تھی، اور اگر ضرورت پڑتی تو مجبورًا فہمائش اور عتاب سے بھی کام لیتے، آپ کے وہ مکاتیب جو ان حُکّام اور کارندوں کے

نام ہیں، اس طرزِ عمل کے شاہد ہیں۔[1]

امیر المؤمنین اپنے کارندوں اور حکام سے صرف قانونی حدود ہی میں محاسبہ نہیں کرتے یا صرف شرعی و فقہی احکام پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ اُن کے اخلاق و سیرت پر بھی نظر رکھتے، اگر دیکھتے کہ ان کی سیرت و اخلاق خدا ترس والیوں کی سیرت و اخلاق سے مختلف ہے، یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کے خلاف ہے تو اس پر بھی محاسبہ کرتے۔

اسی سلسلہ کا واقعہ ہے کہ سیدنا علیؓ کو اطلاع ملی کہ بصرہ پر اُن کے مقرر کردہ عامل عثمان بن حُنیف ایک دعوت میں مدعو کئے گئے، جب وہاں گئے تو اُن کا خیر مقدم اور خاطر داری زیادہ کی گئی، اور اسلامی مساوات کو اس دعوت میں ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا، غربا اور معمولی آدمیوں کو نظر انداز کیا گیا تھا، جب امیر المؤمنین کو اس کی خبر ملی تو ایک مکتوب بھیجا جس میں تحریر فرمایا:

"اما بعد اے ابن حُنیف مجھے معلوم ہوا ہے کہ بصرہ کے لوگوں میں سے کسی نے تمہاری دعوت کی اور تم بہ عجلت وہاں پہونچے، تمہارے لئے رنگ برنگے اور بڑے بڑے طشت بھرے کھانے پیش کئے گئے، تم نے یہ نہیں سوچا کہ تم نے ایسے لوگوں کی دعوت قبول کی ہے، جن کے غریب عیال دار افراد نظر انداز کئے جاتے ہیں، اور مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں، سوچ لو اس طرح کی دعوتوں میں جو تم چباتے ہو، وہ کیا ہے؟ اس میں اگر کوئی مشتبہ مال ہے تو اس کو حلق سے

---

[1] "نہج البلاغۃ" میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے اس طرح کے متعدد مکتوبات ہیں، ان میں ایسے مکتوبات بھی ہیں جن کا اُسلوب اور انداز ایک صاحبِ ذوق ناقد کو (جس نے اس عصر کی تحریریں پڑھی ہیں) مطمئن کرتا ہے کہ یہ کلام حضرت علیؓ ہی کا ہو سکتا ہے۔

اترنے نہ دو، اور جس کے پاک ہونے کا یقین ہو اس کو شوق سے تناول کرو۔"[1]

حضرت علیؓ کا طرز و اصولِ حکومت اور اس سلسلہ میں منصفانہ قول

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیاست اور اُن کی حکومت کا نظام اور اُن کی انتظامی مشنری جس محور کے گرد گردش کرتی تھی، وہ یہ تھا کہ اسلام کی روح، اُس کے اصول، اس کی قدروں، اور نمونوں کو سیاسی مصلحتوں اور انتظامی ضروریات پر قربان نہ کیا جائے، انبیائے کرام کی خلافت اور خلفائے راشدین کی سنّت کو معیار تسلیم کیا جائے، خلیفہ سب سے پہلے اسلام کا داعی، اسلامی اخلاق کا نمونہ اور مسلمانوں کے لئے معیار و مثال ہو، اس کا صرف حاکم اور مسلمانوں کا سربراہ ہونا کافی نہیں ہے، چنانچہ وہ پوری طرح تیار تھے کہ اس نہج کو زندہ اور باقی رکھیں، اور اس پہلو کو تمام دوسرے سیاسی اعتبارات اور تنظیمی امور پر ترجیح حاصل رہے، خواہ اس کی جو قیمت ادا کرنا پڑے، چنانچہ اس نہج کو زندہ رکھنے کی اُن کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی، جس کو انھوں نے راضی خوشی ادا کیا، اور اسی پر اُن کا ضمیر مطمئن رہا۔

استاذ العقّاد نے بڑی خوبی کے ساتھ حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے درمیان اختلافات کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"یہ اختلاف دو آدمیوں کے درمیان نہیں بلکہ دو نظاموں کے درمیان تھا، اور اگر نئی تعبیر اختیار کی جائے تو کہا جائے گا یہ اختلاف دو مکتبِ فکر (SCHOOL OF THOUGHT) کا اختلاف تھا، مسئلہ یہ تھا کہ وہاں تصادم تھا، خلافتِ اسلامیہ کے درمیان (جس کی نمائندگی حضرت علیؓ کر رہے تھے) اور

---

[1] نہج البلاغۃ ص ۴۱۶-۴۱۷۔

سلطنت کے طریقہ کے درمیان (جس کی نمائندگی حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کر رہے تھے)[1]
امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حکومت خلافتِ راشدہ کی اہم کڑی تھی،
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت گو خلافتِ راشدہ نہ تھی لیکن عادلانہ حکومت کا
بہترین نمونہ تھی، اُن کا طرزِ حکومت اسلام کے قائم کردہ حدود سے باہر نہیں تھا،
مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم لکھتے ہیں:۔

"امیر معاویہؓ کی حکومت شخصی تھی، وہ اس کے استحکام اور بقا کے لئے ہر ممکن
تدبیر و طریقہ اختیار کرتے تھے لیکن کسی حالت میں اُن کا قدم دنیاوی حکمرانی
کے نقطۂ نظر سے جائز حدود سے باہر نہیں نکلا، وہ بڑے متحمل مزاج تھے، اُن کا
حلم تاریخی مسلّمات میں ہے، ان کے مخالفین بھی ان کے تحمّل اور برداشت کے
معترف تھے، مشہور شیعی مؤرخ ابن طقطقی لکھتا ہے: "معاویہ حلم کے موقع پر حلم اور
سختی کے موقع پر سختی سے کام لیتے تھے لیکن حلم کا پہلو غالب تھا" اُن کے حلم کے بہت سے
واقعات الفخری اور طبری وغیرہ سے نقل کئے ہیں، وہ جب تک سختی کے لئے مجبور
نہ ہو جاتے تھے، اس وقت تک سختی سے کام نہ لیتے تھے، اس بارے میں ان کا
اصول یہ تھا: "جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں
زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان
بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو نہیں توڑ دیتا جب لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو
ڈھیل دے دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں۔" (یعقوبی جلد ۲ ص ۲۸۳)[2]

اس اختلاف اور اصول کے جداگانہ نظریات کا نتیجہ سامنے آکر رہا، دو گروہ تھے،

۱؎ العبقریات الاسلامیۃ ص ۸۹۲ ۲؎ تاریخ اسلام ج ۲ ص ۳۵ طبع دہم۔

اور دونوں اپنے قدرتی و فطری رجحانات کے مطابق عمل پیرا تھے، اور اُن کے پیدا ہونے کا سبب یہ تھا کہ زمانہ بدل چکا تھا، نئے نئے معاشروں سے مسلمانوں کو سابقہ پڑ رہا تھا، اور ان کے براہ راست اثرات پڑ رہے تھے، ایک حد تک عصرِ نبوّت سے بُعدِ زمانی بھی ہو چکا تھا، وہ لوگ جنھوں نے براہ راست مدرسۂ نبوّت سے فیض اُٹھا کر ایک خدا ترس معاشرہ تعمیر کیا تھا، وہ صفِ اوّل کے حضرات تقریباً ختم ہی ہو چکے تھے۔

اس حقیقت کو بہت باریک بینی کے ساتھ استاذ عقّاد نے سمجھا اور اپنے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"علی رضؓ کا زمانہ اس لحاظ سے عجیب زمانہ تھا کہ اس زمانہ کے پیش رو کچھ اور لوگ تھے، اور بعد میں آنے والے کچھ دوسرے قسم کے افراد تھے، وہ اس لحاظ سے عجیب نہیں تھا کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہا جس پر اس کو رہنا چاہیئے تھا بلکہ وہ دور ایسا تھا کہ پوری طرح نہ جم سکا تھا نہ شکست و ریخت کا پوری طرح شکار ہوا تھا، کیونکہ وہ زیرِ تعمیر تھا، ایسی عمارت کی طرح نہ تھا جو مکمل طور پر ویران و برباد ہو چکی ہو اور نہ ایسی عمارت تھی کہ ہر طرح سے پائدار اور برقرار ہو۔"

ان دونوں اصولوں کا اختلاف، وقت کے تقاضوں کا اختلاف تھا، فطرتِ انسانی اور قانونِ تکوینی کے لحاظ سے اسلامی معاشرہ پر تدریجی تغیرات جو سامنے آئے وہ حضرت معاویہؓ کے لئے سازگار ثابت ہوئے، ان کی فوج اور اُن کے حدودِ حکومت میں امن و امان اور ٹھہراؤ تھا، حاکمِ وقت کی اطاعت کا جذبہ اور جوش تھا، اور حضرت علی رضؓ کی جہاں حکومت تھی، وہاں دونوں ملکوں کے روایتی پس منظر کے سبب (جس کا ذکر اوپر کیا گیا) کشمکش اور خود رائی تھی، اور ان چیزوں کی طمع تھی، جن سے مقابل کی فوج مستفید ہو رہی تھی، اور جس کو

مادی منافع کے حصول کے مواقع تھے، اور خواہشات پوری کرنے میں پوری طرح ڈھیل تھی۔

استاد عقاؔد لکھتے ہیں :-

"اجتماعی نظام سے رضا مندی شام اور اس کے اطراف میں معاویہ بن ابی سفیانؓ کے حصہ میں آئی، دوسری طرف اجتماعی نظام سے بیزاری جس طبقہ میں تھی، وہ علیؓ کے حصہ میں آئی، جو جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی تھی۔"[1]

حضرت علیؓ کی سیاست ان کے شایانِ شان تھی جس کا بدل ممکن نہ تھا

ان دونوں نظریاتی اور اصولی اختلافات کے نتائج جو ظاہر ہوئے جس میں ایک طرف امن و تنظیم تھی، اور دوسری طرف برہمی و خودسری، ایک طرف اطاعت و فرمانبرداری دوسری طرف گریز و فرار، اور اس صورتِ حال کے جو بھی سنگین نتائج سامنے آئے اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو جو مصائب برداشت کرنے پڑے، اور حضرت معاویہؓ کو جو سہولتیں، امن و عافیت اور رعایا کی طرف سے اطاعت و وابستگی حاصل ہوئی، ان سب کے باوجود واقعہ یہی ہے کہ حضرت علیؓ کی جو سیاست تھی وہی اُن کے شایانِ شان اور اُن کے مرتبہ کے مطابق تھی، اور اس کا کوئی بدل ممکن نہ تھا۔

عقاؔد نے بہت ہی انصاف اور ذہانت، اخلاقی جرأت اور تاریخی امانت کے ساتھ اس کا تجزیہ کیا ہے :-

"علی (رضی اللہ عنہ) نے اپنی خلافت کے روزِ اول ہی سے اعلیٰ ترین اور مناسب ترین سیاست اختیار کی، جس کے علاوہ کوئی دوسری سیاست ہو نہیں سکتی تھی،

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۸۶۹

جس کی طرف اُن کے ناقد اور بعض مؤرخین اشارہ کرتے ہیں، اور پھر دلائل پیش کرتے ہیں کہ اگر وہ دوسری پالیسی اختیار کرتے تو وہ ان مصائب و مشکلات سے اور اس صورتِ حال سے محفوظ رہتے جو بعد میں پیش آئی"۔[1]

وہ مؤرخین و ناقدین جو ایک ہی پیمانہ سے تمام افراد کا موازنہ کرتے ہیں، اور زمانہ کے فرق، تربیت، عقیدہ اور قدروں کو فراموش کر دیتے ہیں، جو رہنماؤں کا مطمحِ نظر تھا، وہ حضرت علیؓ پر معترض ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر حضرت علیؓ شام سے حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کو معزول کرنے میں جلدی نہ کرتے اور مصر کی گورنری سے قیس ابن سعد کو برطرف نہ کرتے، اور حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو حوالہ کر دیتے، تحکیم قبول نہ کرتے تو ان جنگوں سے نجات مل جاتی جس کو انھوں نے شجاعت، صبر اور پوری ایمانی قوت کے ساتھ سر کیا، اور ان مشکلات و مصائب سے محفوظ رہتے جن سے وہ دوچار ہوئے۔

لیکن استاد عقّاد نے حادثات اور حالات کے نتائج کا بہت باریک بینی سے تجزیہ کر کے اس رائے سے اختلاف ظاہر کیا ہے، وہ بڑی وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"اس سیاست کے انجام کار کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر جو بات ہمارے سامنے روشن ہو کر آتی ہے، وہ یہ کہ اگر ان کا (حضرت علیؓ کا) عمل دوسری قسم کی پالیسی پر ہوتا تو اس کی کامیابی قطعی نہ تھی، اور نہ خطرات سے مامون تھی، بلکہ میرے نزدیک کامیابی کی توقع اور بھی کم ہوتی، اگر وہ اُن کو نافذ کر دیتے تو اس پالیسی کے نتائج زیادہ خطرناک ہوتے اور جذبۂ خیر خواہی اور مشورہ کے حدود سے دور نکل جاتے"۔[2]

العقّاد زیادہ صراحت و اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں:۔

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۸۹۵ [2] ایضاً ص ۹۱۵

"حضرت علیؓ کے ناقدین کو خواہ وہ اُن کے عصر میں رہے ہوں یا بعد میں، کسی کو یہ خیال بھی آیا کہ اپنے دل سے پوچھے کہ کیا اُن کے امکان میں یہ تھا کہ جو طریقۂ کار انھوں نے اختیار کیا اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے؟ کسی کو خیال آیا کہ اس کے بعد اپنے دل سے پوچھے کہ فرض کیجئے جو انھوں نے کیا وہ نہ کرتے تو کیا انجام اس سے بہتر ہوتا جو سامنے آکر رہا[1]؟"

وہ مزید لکھتے ہیں :۔

"پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اُن کے اندر اگر چالاکی کی کمی تھی، اس سے ان کا کوئی بڑا خسارہ نہیں ہوا، اور اگر چالاکی و چالبازی سے اُن کو وافر حصہ ملا ہوتا جب بھی زیادہ نفع بخش نہ ہوتا کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ یا تو خلافت راشدہ رہے یا ملوکیت[2]"

ان دونوں مناہج (نظریاتی راستے) جو سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے اختیار کئے تھے، اُن کا قدرتی اور فطری تقاضہ تھا کہ دونوں کا طریقہ اپنا خلیفہ اور جانشین بنانے کے سلسلہ میں مختلف ہو، حضرت علیؓ نے معاملہ شوریٰ کے سپرد کردیا، اور اپنے بڑے صاحبزادہ کو خلیفہ نہیں نامزد کیا حالانکہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسہ، لاڈلے اور ایک محبوب شخصیت کے مالک تھے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے بارے میں فرمایا تھا:۔

"إن ابنی ھذا سید" میرا یہ فرزند سردار ہے (یعنی حضرت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما) جس وقت حضرت علیؓ سے آخری وقت دریافت کیا گیا "یا امیر المؤمنین ألا تستخلف؟" کیا امیر المؤمنین کسی کو اپنا جانشین نہیں مقرر فرمائیں گے؟ تو فرمایا:

---

[1] العبقریات الاسلامیۃ ص ۹۱۵ [2] ایضاً ص ۹۳

"لا" یعنی نہیں" ولکن أترککم کما ترککم رسول اللہ"۔ لیکن میں تم کو اس طرح چھوڑتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چھوڑا تھا، لوگوں نے کہا: پھر آپ اللہ کو کیا جواب دیں گے کہ اپنی قوم کو بے سردار کے چھوڑ دیا؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا: میں اللہ سے عرض کروں گا کہ جب تیری مرضی ہوئی تو نے مجھے خلیفہ بنایا جب تو نے اُٹھا لیا تو اُن کو تیرے ہی حوالہ کرتا ہوں، اگر چاہے تو اُن کو صلاح عطا فرما یا بگاڑ دے[1]۔

لیکن معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے یزید کے لئے خلافت کی بیعت حاصل کی جو اپنے والد کے بعد حکومت کا وارث ہوا[2]۔

کچھ حضرت معاویہؓ کے متعلق

تاریخی حقائق اور خاص طور پر اس پیچیدہ اور مبہم دور کو سامنے رکھتے ہوئے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد پیش آیا اور اسلامی معاشرہ پر اندرونی و بیرونی بدلتے ہوئے حالات کا جو ردِّ عمل ہوا، ان سب کا جائزہ لینے سے جو بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ حضرت معاویہؓ کو لوگوں کی نفسیات پہچاننے کا ملکہ، اور عرصۂ دراز تک حکومت کرنے کا جو تجربہ تھا، اس نے اُن کو یقین دلایا کہ اس وقت کے اسلامی معاشرہ کی قیادت اور وسیع اسلامی مملکت کی سربراہی (جس کے عناصر میں تنوّع پیدا ہو چکا تھا، اور جس کو چند در چند مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا) خلافتِ راشدہ کے ان خطوط پر قائم نہیں رکھی جا سکتی، جن پر خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم چلتے رہے، اور جن کو پوری طاقت سے نباہتے رہے حضرت معاویہؓ اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ اسلامی مملکت کو خطرات سے محفوظ رکھا جائے، امن و امان قائم رہے،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷، ص ۳۲۴ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ج ۸

غزوات وفتوحات کا سلسلہ جہاں تک جاری رہ سکتا ہے اس کو جاری رکھا جائے اور اس کی خاطر اگر ایک شخصی موروثی مگر عادل حکومت قائم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، حکومت اسلامی تعلیمات کی تابع ہو مگر اس میں لچک ہو اور شریعت کا پاس واحترام بھی امکانی حد تک قائم رہے، حکومت کے انتظامیہ اور حکومت چلانے کے طریقے اور لوگوں سے معاملت کرنے کے اصول میں توسُّع سے کام لیا جائے، اگر ضرورت وحالات اس کے متقاضی ہیں تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، مملکت تو دائرۂ اسلام سے باہر نہیں جائیگی (جس کی نوعیت اب ایک بڑی سلطنت کی ہو چکی ہے، اور وہ مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والے عناصر پر مشتمل ہے) ہوشیاری اور لچک کے ساتھ معاملات سلجھائے جائیں اور جو مشکلات سامنے آئیں اُن کو حل کرنے میں حکمتِ عملی اور مصلحتِ وقت سے مدد لی جائے، وقت ومقام کے اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے، لہٰذا انھوں نے اپنی حکومت ایک مسلمان فوجی وانتظامی سربراہ کی حیثیت سے قائم کر لی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی پیش گوئی بھی فرما دی تھی:۔

خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم	خلافت علی منہاج النبوۃ تیس ۳۰ سال
یعطی اللہ الملك (أو ملكه) من یشاء[1]	رہے گی اس کے بعد اللہ ملک جس کو چاہے گا

---

[1] سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب الخلفاء، وعن سعید بن جمهان قال حدثنی سفینة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم، الخلافة فی أمتی ثلاثون سنة ثم ملك بعد ذلك ثم قال لی سفینة: أمسك خلافة أبی بکر وخلافة عمر وخلافة عثمان ثم قال لی أمسك خلافة علی، قال: فوجدناها ثلاثین سنة (سنن ابی داؤد میں سعید بن جمہان سے روایت ہے کہ سفینہ نے مجھ سے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: "میری اُمّت میں خلافت تیس ۳۰ سال تک رہے گی، پھر بادشاہی ہو جائے گی، پھر مجھ سے سفینہ نے کہا کہ ابوبکر وعمر وعثمان (رضی اللہ عنہم) کی خلافت کا زمانہ جوڑو، پھر کہا علیؓ کی خلافت کو جوڑو، تو ہم نے اُس کو تیس ۳۰ سال پایا۔)

دیدے گا۔ ایک روایت میں ہے' اپنا
ملک جس کو چاہے گا دیدے گا۔

حضرت معاویہؓ کو خود بھی اس کا دعویٰ نہ تھا کہ اُن کی حکومت خلفائے ثلاثہ (حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم) کی خلافت کی طرح "خلافتِ راشدہ" ہے' وہ صفائی کے ساتھ فرماتے تھے' کہ وہ ایک حاکم اور والیٔ سلطنت ہیں' البتہ اُن کے بعد جو حُکام اور والیانِ سلطنت آئیں گے اُن کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اُن کی قدر آئے گی، اور کُھلا فرق محسوس ہوگا۔[1]

مشہور مؤرخ مسعودی[2] نے اُن کے روزانہ کے معمول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ان کے یہاں دن رات میں پانچ مرتبہ اِذنِ عام تھا، وہ صبح نمازِ فجر سے فارغ ہوتے تھے' تو بیٹھ جاتے اور پچھلے حوادث و واقعات کی داستان سنتے' پھر دولت خانہ تشریف لے جاتے' اور قرآن مجید کے ایک پارہ کی تلاوت کرتے' پھر مکان پر جاکر انتظامی ہدایات دیتے' پھر چار رکعت پڑھتے اور خواص الخواص کو آنے کی اجازت ہوتی اور اُن سے تبادلۂ خیال کرتے' پھر مُشیرانِ سلطنت حاضر ہوتے اور اُس دن کے کرنے والے کاموں کی اطلاع دیتے' پھر کچھ ناشتہ فرماتے' پھر ایک بار گھر جاکر باہر تشریف لے آتے' مسجد میں کرسی لگا دی جاتی اور آپ کے پاس کمزور' بادیہ کا رہنے والا اعرابی' بچہ، عورت اور بے کس و لاوارث آدمی آتا آپ فرماتے اس کا لحاظ و احترام کرو، کوئی کہتا میرے ساتھ زیادتی ہوئی، آپ فرماتے: "اس کے معاملہ کی تحقیق کرو" جب کوئی باقی نہ رہتا تو مجلس سے اُٹھتے، چارپائی پر بیٹھ جاتے اور فرماتے: "لوگوں کو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۴۶ و ۱۵۳ (دار الفکر العربی مصر) [2] ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی (م ۳۴۵ھ)

اُن کی حیثیت کے مطابق آنے دو۔

جب سب بیٹھ جاتے تو فرماتے کہ "صاحبو! ان لوگوں کی ضروریات و مسائل کو ہم تک پہونچایا کرو جو خود نہیں پہونچ سکتے، اسی لئے اللہ نے تم کو اعزاز بخشا ہے" پھر ہر ایک کے معاملہ اور ضرورت کے مطابق ہدایات دیتے، روزانہ کا یہی معمول تھا۔[1]

اس سب کے ساتھ اہلِ سنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ خلافت کے معاملے میں حق حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔[2]

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "علی بن ابی طالبؓ اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے، وہ مقابل جماعت کے مقابلہ میں برسرحق اور افضل تھے۔"[3]

اس میں شک نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں اسلام اور مسلمانوں کو فتح و غلبہ حاصل ہوا، اسلام کو فتحمندیاں حاصل ہوئیں اور اس کا دائرہ بڑھا، حضرت معاویہؓ نے غزوات کا سلسلہ جاری رکھا، اور فتوحات کا سلسلہ برّی و بحری راستوں سے وہاں تک پہونچا جہاں مسلمان فاتحین کے قدم پہلے نہیں پڑے تھے، ان کی فتوحات بحرِ اُوقیانوس (اٹلانٹک) تک پہنچ گئیں، اُن کے مصر کے گورنر نے سوڈان کو اسلامی مملکت میں شامل کر لیا، اُن کے زمانہ میں بحری بیڑے کثرت سے تیار ہوئے، اُن کو اس بات کا خاص اہتمام تھا، یہاں تک کہ اُن بیڑوں کی تعداد سترہ سو[1700] تک پہنچ گئی، یہ سب کشتیاں ہتھیار اور سپاہیوں سے بھرپور تھیں، ان بحری بیڑوں کو

---

[1] "مروج الذہب و معادن الجوہر" از المسعودی ج ۲ ص ۵۱-۵۲ (المطبعۃ الازہریہ مصر ۱۳۰۳ھ)

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" از حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

[3] مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ ج ۴ ص ۴۳۳ (مطبوعہ مکتبۃ المعارف، الرباط المغرب) ج ۲ ص ۲۷۸ و ۲۸۰،

وہ مختلف سمتوں میں روانہ کرتے اور وہ کامیاب ہو کر واپس آتے، اُن کے ذریعہ متعدد علاقے فتح ہوئے جن میں جزیرۂ قبرص (CYPRUS) اور یونان اور دردنیل کے بعض جزیرے اور جزیرۂ رودس (RODES) بھی شامل ہے، خشکی کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے انھوں نے ایک فوج تیار کی تھی، جو جاڑوں میں جا کر حملہ آور ہوتی جس کو "الشواتی" کہتے تھے، دوسرا دستہ تھا جو گرمیوں میں حملہ کرتا اس کا نام "الصوائف" تھا، یہ غزوات مسلسل جاری تھے اور مسلمانوں کی سرحدیں دشمنوں سے محفوظ تھیں، ۴۸ھ میں حضرت معاویہؓ نے ایک بڑی فوج تیار کی تھی کہ وہ قسطنطنیہ پر بحری اور برّی دونوں طرف سے حملے کرے، مگر چونکہ اس کی شہر پناہ بہت مضبوط اور وہاں تک پہنچنا دشوار تھا، اور چونکہ یونانی آتشیں حملہ نے اُن کے بیڑوں کو تباہ کر دیا تھا، اس لئے وہ حملہ کامیاب نہ ہو سکا، اور قسطنطنیہ فتح نہیں ہوا اس فوج میں شریک حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، سیدنا ابوایوب انصاریؓ اور یزید بن معاویہ بن ابی سفیانؓ تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میزبان حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات اسی شہر پناہ کے حصار کے زمانہ میں ہوئی، اور ان کی تدفین شہر پناہ کے قریب عمل میں آئی، حضرت معاویہؓ ہی کے زمانہ میں اور اُن ہی کی حکومت کے زمانہ میں مسلمان قائد عقبہ بن نافع افریقہ میں داخل ہوئے اور قبائل بربر میں جو لوگ اسلام لائے وہ اُن کی فوج سے آکر مل گئے، اور قیروان میں اپنا ایک مرکز اور فوجی چھاؤنی بنالی، اور کثیر تعداد میں بربری اسلام لائے اور مسلمانوں کی حکومت کا رقبہ بڑھ گیا۔[1]

---

[1] تفصیل مزید کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ الامم الاسلامیۃ" (الدولۃ الاموية) از شیخ محمد الخضری بک ج ا صفحہ ۱۱۴-۱۱۵، اور "الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی" (لجرجی زیدان) مؤلفہ علامہ شبلی نعمانیؒ (مطبع آسی لکھنؤ ۱۹۱۲ء)

حضرت معاویہؓ میں بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جس سے اُن کی اسلام اور مسلمانوں سے محبت کا پتہ چلتا ہے، اور یہ کہ وہ دینی ڈھانچہ کو باقی رکھنا چاہتے تھے، اور اس کا دفاع کرتے تھے، اُن کی دُور بینی اور انتظامی امور میں حکمت کے علاوہ اُن کے اندر دین کی حمیّت اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحتوں کو اگر ضرورت پڑے تو ترجیح دینے کا بھی جذبہ تھا، اُن کا ایک کارنامہ اس موقع پر قابلِ ذکر ہے جس سے اُن کی بلندیٔ کردار اور دین کی حمیّت کا پتہ چلتا ہے جس کو بہت سے مؤرخین نے ذکر کیا ہے، جن میں ابن کثیرؒ بھی ہیں، ابن کثیر نے لکھا ہے:۔

"شہنشاہ روم نے حضرت معاویہؓ کو ملانے کی خواہش ظاہر کی چونکہ اُن کا اقتدار رومی سلطنت کے لئے خطرہ بن چکا تھا، اور شامی فوجیں اس کی افواج کو مغلوب کر کے ذلیل کر چکی تھیں، اس لئے اس نے جب یہ دیکھا کہ معاویہؓ علیؓ سے جنگ میں مشغول ہیں وہ بڑی فوج کے ساتھ کسی قریب کے ملک میں آیا اور معاویہؓ کو لالچ دی، تو حضرت معاویہؓ نے اس کو لکھا:۔

بخدا اگر تم نہ رُکے، اور اے لعین اگر تو اپنے ملک واپس نہ گیا تو ہم اور ہمارے چچازاد بھائی (علیؓ) دونوں آپس میں مل جائیں گے اور تجھ کو تیرے تمام قلمرو سے خارج کر دیں گے، اور روئے زمین کو (اس کی وسعت کے باوجود) تجھ پر تنگ کر دیں گے، یہ سُن کر شاہ روم ڈر گیا اور جنگ بندی کی اپیل کی۔"[1]

یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ایک ممتاز فرد ہیں، ان کے مناقب میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو لوگ ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بے باکی و زبان درازی سے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۱۱۹

کام لیتے ہیں ان کو اس امر کا پاس و لحاظ ہونا چاہئے کہ وہ ایک ایسے صحابی ہیں جن کو قرابت کا شرف بھی حاصل ہے۔

امام ابوداؤد نے حضرت ابوسعیدؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لاتسبّوا أصحابي والذي نفسي بيده لو أنفق أحدكم مثل أُحُد ذهبا ما بلغ مُدَّ أحدهم ولا نصيفه۔	میرے صحابہ کی بُرائی نہ کرو، قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی اُحد کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں دیدے تو ان کی برابری کیا ان کے نصف درجہ کو بھی نہیں پاسکتا۔

ابوداؤد نے ابوبکرہؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا:۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للحسن بن علي إنّ إبني هذا سيد وإني أرجو أن يصلح الله به بين فئتين من أمتي۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ فرزند سردار ہے مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالے اس کے ذریعہ میری امت کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

لعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين۔	امید ہے کہ اللہ ان کے ذریعہ دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے گا۔

دیلمی نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے انھوں نے فرمایا:۔

سمعت عليًّا يقول سمعت	میں نے حضرت علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ	وہ فرماتے تھے کہ میں نے سنا رسول اللہ
وسلم یقول: لا تذہب	صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے دن رات
الأیام واللیالی حتی یملک	کے تسلسل کا قصہ ختم نہ ہوگا کہ معاویہؓ
معاویۃ۔	برسرِ حکومت آجائیں گے۔

آجری کتاب الشریعہ میں عبد الملک بن عمیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

"جب سے میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے معاویہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو اچھی طرح حکومت کرنا اس وقت سے مجھے خلافت کے حصول کی تمنا تھی۔"

اُمِ حرام کی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

أول جیش من أمتی	پہلی فوج جو سمندری علاقہ پہ
یغزون البحر قد اوجبوا۔	حملہ آور ہوگی اس میں حصہ لینے
	والوں کی نجات اور بخشش ہے۔

اور پہلا شخص جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بحری راستہ سے جہاد کو نکلا وہ حضرت معاویہ تھے، اُم حرام اس فوج میں تھیں اور سمندر عبور کرنے کے بعد اُن کی وفات ہوئی ہے۔

یہ بات ثابت ہے کہ حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا کاتب بنایا تھا اور آپ اپنا کاتب اسی کو بناتے تھے جو عدل وامانت کے صفات سے متصف ہو۔

حضرت معاویہ اپنے بارے میں کہتے ہیں:۔

لست بخليفة ولكنّي اول ملوك الاسلام وستجرّبون الملوك بعدی۔

میں خلیفہ نہیں ہوں لیکن اسلام میں پہلا بادشاہ ہوں اور میرے بعد تم کو دوسرے بادشاہوں کا تجربہ ہو جائے گا۔

حضرت معاویہؓ کے پاس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چند موئے مبارک تھے، انھوں نے وصیّت کی تھی کہ ان بالوں کو اُن کے مرنے کے بعد اُن کی ناک کے اندر رکھ دیا جائے[1]۔

وہ خلافت کے بعض ایسے اصول و مقاصد سے واقف تھے، جن کو وہ عمل میں نہ لا سکے اس لئے کہ زمانہ بدل چکا تھا اور حالات و ماحول کے تقاضے، مملکت کی وُسعت، ذمہ داریوں کی کثرت، وقتی مسائل کی مشکلات اور سربراہ حکومت کی نازک ذمہ داریاں (ان کے نزدیک) اس کی متحمل نہ تھیں، جو لوگ ان گہری اور وسیع تبدیلیوں اور زمانہ کے عظیم فرق سے واقف ہیں، وہ اُن کو کسی حد تک معذور قرار دیں گے، اور فیصلہ کرتے وقت حالات اور ماحول کی تبدیلی کو نظر میں رکھیں گے[2]۔

اس وقت کے اسلامی معاشرہ پر ایک نظر

یہ اختلافات جن کا ذکر ناظرین کی نظر سے گزرا اور جن کے نتیجہ میں خوں ریز معرکہ آرائیاں ہوئیں، افسوس اور دلی رنج کے ساتھ اُن کی کہانی سُنانے کے بعد

---

[1] ماخوذ از "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" از حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ص ۱۴۶-۱۴۷ مطبع صدیقی بریلی [2] ملاحظہ ہو "ازالۃ الخفاء" ص ۱۴۸-۱۵۲

ایک حقیقت کا اعتراف کرنا اور ایک پہلو پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ سب جنگیں اور اختلافات جو رُونما ہوئے، وہ اربابِ حکومت وقیادت اور اُمراء وحکّام اور ان کی افواج تک محدود تھے، لیکن جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے، جو سرزمین وحی ورسالت سے لے کر ان آخری حدود تک قائم تھا، جو اسلام کے زیرنگیں آگئی تھیں، وہ معاشرہ یا وہ جماعتیں جو اس کی تشکیل کرتی تھیں، سب دین پر عامل تھیں، فرائض وواجبات کی پابند تھیں، سُنّت پر عمل پیرا ہونے کا اس عہد کے بھی مسلمانوں کے اندر جذبہ تھا اور جو باتیں قرآن وسنّت سے ثابت ہیں، اُن پر کاربند رہنے کا شوق تھا، دینداروں، محدّثین، فقہاء، فتاویٰ واحکام بتانے والے علماء کا ان کے دلوں میں احترام تھا، اسلامی شعائر کو بالادستی حاصل تھی، جمعہ اور جماعت کا اہتمام تھا، حج کی ادائیگی کے اوقات اور اس کے شعائر میں سرِمُو اختلاف یا تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اور وہ ایک امیر کی سرکردگی میں انجام دیا جاتا، جس کو خلیفہ (صاحبِ حکومت) مقرر کرتا، جہاد پورے زور وشور سے جاری تھا، قرآن کریم کی تلاوت سے فضا گونجتی تھی، دل اس کی آیات سے نرم ہوتے تھے، آنکھیں ان سے تر رہا کرتی تھیں، دین اور احکامِ شریعت میں کوئی تحریف نہیں ہوئی تھی۔

اسلامی معاشرہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اس وقت کے تمام دوسرے مسیحی، یہودی، مجوسی اور برہمنی معاشروں سے اللہ کی طرف مائل ہونے، خشوع وخضوع، آخرت کے مُحاسبہ کے خوف اور مرنے کے بعد آنے والی زندگی کے **یقین** کے معاملہ میں فائق وممتاز معاشرہ تھا، کھُلے بندوں فواحش،

فسق و فجور کے مظاہروں، مادّہ پرستی اور مال و متاع کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کا رُجحان اس معاشرہ میں پیدا نہیں ہوا تھا، ایسا نہیں تھا کہ سب کے سب صرف نفع اور لذّت اندوزی کی ترازو پر ہر شئی کو تولتے، یہ سب نتیجہ تھا، اس کتاب اللہ کا جو کسی تحریف کو قبول نہیں کر سکتی تھی، اور نہ اس کو ضائع کیا جا سکتا تھا، اور یہ سب نتیجہ تھا، احادیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُسوۂ نبوی کے نداکروں کا، خلفائے راشدین کی سیرتیں، صحابۂ کرام کے احوال، شہداء و مجاہدین کی سوانح حیات کے پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا، مزید یہ کہ ایسے اللہ کے داعی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہر دور میں موجود رہے جو معاشرہ کو اسلامی نہج پر سنبھالے رہے، خشیتِ الٰہی رکھنے والے اور دنیا کو حقیر سمجھنے والے (زاہد اور متورّع) برابر موجود رہے، قلوب پر اسلام کی روحانی سطوت ہمیشہ قائم رہی، یہ سب اس لئے کہ اللہ تعالےٰ اس دین کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرما چکا ہے، اور یہ اُمّت جو اللہ کی طرف بلانے والی ہے قیامت تک رہے گی :۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥	بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔
(سورۃ الحجر۔ ۹)	

اور :۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمّتِ معتدل بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزّماں)

عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا ۰ (سورۃ البقرۃ ۱۴۳) تم پر گواہ بنیں۔

قرآن کریم اس اُمّت کے بارے میں بقاء کا ضامن ہے اس لئے کہ اس دین کا کوئی بدل نہیں ہے، اور اس لئے کہ مسلمان ہر زمانہ میں دعوت اِلی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے خلاء کو پُر کرتے رہے ہیں[1]، اور اس لئے کہ وہ عقیدہ و عمل کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر ہیں، اللہ نے ان کے ان دشمنوں کو جو ہمیشہ ان کی تاک میں رہے غالب نہیں ہونے دیا، عیسائی اقتدار و سلطنت (جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا) اور یورپ کا عیسائیت کا حلقہ بگوش برِّ اعظم اس کوشش میں رہا کہ مسلمانوں کو آپس کی جنگوں میں مشغول رکھ کر اور اُن کی سیاسی آویزشوں سے فائدہ اُٹھا کر ان ملکوں کو جو مسلمان فتح کر چکے تھے، اور جن پر پہلے، صدیوں سے عیسائی قابض تھے، جیسے شام، مصر، اور شمالی افریقہ کے بعض ممالک، ان سب کو دوبارہ عیسائی اپنے اثر و نفوذ میں لینے کے لئے کوشاں رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے، اور اپنا سیاسی و فوجی دباؤ نہیں ڈال سکے۔

مؤرخ ابن جریر الطبری ۳۵ھ کے حوادث کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس سال ہرقل کے فرزند قسطنطین نے ایک ہزار کشتیوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا، اللہ نے اس کی فوج پر ایک طوفانی عذاب نازل کر دیا جس سے وہ اپنی تمام تر قوتوں اور اسلحہ کے ساتھ غرق کر دیا گیا، سوائے بادشاہ اور ایک معمولی سی ٹولی کے، جو اس کے ساتھ تھی اس کی

---

[1] ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" (ج ۱ تا ج ۶) میں داعیانِ دین اور ان کی کوششوں اور اثرات کا تذکرہ، "صفۃ الصفوۃ" از ابن الجوزی، "طبقات الاصفیا" از حافظ ابی نُعیم الاصفہانی۔ ج ۱۔۲۔۳ میں اس زمانہ کے صالحین اور دعاۃ الی اللہ کے تذکرے۔

جماعت میں کوئی بچ نہ سکا، اور جب وہ صقلیہ (سسلی) میں داخل ہوا تو اس کے لئے ایک حمام تیار کیا گیا، جس کے اندر جب وہ داخل ہوا تو لوگوں نے قتل کر دیا! اور کہا: تو نے ہمارے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا (ہم تجھے انتقاماً اسی انجام کو پہونچاتے ہیں)[1]"۔

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷، ص ۲۲۸ (مطبعۃ السعادۃ۔ مصر)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت کے چند تابناک پہلو

تاریخ و روایات کے آئینہ میں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد و احفاد کے تذکرہ سے پہلے
مناسب ہوگا کہ آپ کی سیرت کے چند تابناک گوشوں پر سرسری
نظر ڈال لی جائے جو تاریخ و روایات سے ثابت ہیں۔

صنم پرستی اور جاہلیت کے آثار مٹانے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین

الحکم ابو محمد الہذلی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:
ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جنازہ میں شرکت فرمارہے تھے، اسی دوران
آپؐ نے فرمایا، تم میں کوئی ایسا ہے جو مدینہ چلا جائے اور وہاں جتنے بھی بُت ہوں سب کو مسمار
کردے، کوئی مجسمہ ہو تو اس کی ہیئت بگاڑ دے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا، میں
حاضر ہوں یا رسول اللہؐ، فرمایا، تو پھر چل پڑو، حضرت علی گئے اپنی مہم انجام دے کر واپس
آکر عرض کیا، یا رسول اللہ میں نے جو بُت بھی دیکھا اس کو مسمار کر ڈالا، جتنی (بلند) قبریں
وہاں ہیں سب کو زمین کے برابر کر دیا، کوئی مجسمہ ایسا نہیں ہے جس کی ہیئت نہ بگاڑ دی ہو،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا: اب پھر کوئی نئے سرے سے ان بتوں، اور مجسموں اور قبروں کو تعمیر کرے تو سمجھ لو کہ اس نے میری نبوت کا انکار کیا۔[1]

حضرت جریر بن حیانؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں تم کو اس کام پر مامور کرتا ہوں جس کام پر مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مامور فرمایا تھا، آپؐ نے مجھے اس بات پر مامور فرمایا تھا کہ تمام قبروں کو زمین کے برابر کردوں، ہر بُت کو مٹا دوں۔[2]

ابو الہیّاج الاسدی نے بیان کیا کہ مجھ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جس کام پر مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مامور فرمایا تھا اس پر تم کو مامور کرتا ہوں، کوئی مجسمہ بھی دیکھو اس کو توڑ ڈالو، کوئی اونچی قبر نظر آئے تو اس کو زمین کے برابر کردو۔[3]

احکام شریعت کی سب سے زیادہ فہم رکھنے والے اور سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والے

متعدد روایات کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "أقضاکم علی" "تم لوگوں میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت علی میں ہے" حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں جب مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن بھیجا اس وقت میں کمسن تھا، میں نے عرض کیا، آپ مجھے ان لوگوں میں بھیج رہے ہیں جن کے آپس میں جھگڑے ہوں گے، اور مجھے فیصلہ چکانے اور فیصلہ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے، فرمایا: اللہ تمھاری زبان سے صحیح بات نکلوائے گا اور تمھارے دل کو مطمئن کرے گا (کہ تم فیصلہ صحیح کر رہے ہو) حضرت علیؓ فرماتے ہیں اس کے بعد

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸۷ (مسند علی بن ابی طالب) [2] ایضاً ص ۸۹ [3] ایضاً ص ۹۶

مجھے کبھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں شک نہیں ہوا (کہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں[۱])

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے اُلجھے ہوئے مسائل سے پناہ مانگتے جن کے حل کرنے کے لئے (ابوالحسن (حضرت علی) نہ ہوں[۲]، حضرت عمرؓ کا یہ مقولہ مروی ہے :۔

"لولا علیٌّ لهلك عمر[۳]" اگر علی نہ ہوتے تو عمر تباہ ہو جاتا، حضرت عمرؓ کا حال یہ تھا کہ جب کوئی فیصلہ طلب پیچیدہ مسئلہ سامنے آتا تو فرماتے: "قضیة ولا أبا حسن لها[۴]" مشکل پیش آگئی ہے، اور اس کو حل کرنے کے لئے ابوالحسن نہیں ہیں۔

سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ کے حکیمانہ اور دور اندیشانہ فیصلہ کا نمونہ وہ ہے جس کی روایت امام احمد بن حنبل نے مسند علی میں اپنی سند سے بیان کی ہے جو حنش سے روایت کردہ ہے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا :۔

"جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن (اپنا نمائندہ بنا کر) بھیجا، وہاں مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا جو آپس میں ایک عجیب قسم کے جھگڑے میں اُلجھے ہوئے تھے، ان لوگوں نے شیر کے شکار کے لئے ایک کمین گاہ کھودی تھی، جس وقت لوگ ایک دوسرے کو دھکا دے رہے تھے کہ ایک آدمی اس کے اندر گرنے لگا، وہ آدمی دوسرے آدمی سے جو دہانے پر تھا چمٹ گیا، اس دوسرے آدمی نے تیسرے آدمی کو پکڑ لیا اور اس تیسرے نے چوتھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا نتیجہ یہ کہ چاروں یکے بعد دیگرے گر گئے شیر نے ان سب کے

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸۳ [۲] روایت ابوعمر از سعید المسیّب" ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء" شیخ الاسلام احمد بن عبدالرحیم شاہ ولی اللہ دہلویؒ ج ۲ ص ۲۶۸

[۳] ایضاً ص ۲۶۸ [۴] العبقریات الاسلامیۃ للعقاد ص ۹۶ (عربی میں غایت احترام کے طور پر بجائے نام لینے کے کنیت کا حوالہ دیتے ہیں۔ مترجم)

زخمی کر دیا، اتنے میں ایک شخص نے اپنی کمر سے چھرا نکال کر شیر کو مار ڈالا اور یہ چاروں زخموں کی تاب نہ لاکر ختم ہو گئے، حضرت علیؓ اس قضیہ کو چکانے کے لئے تشریف لائے، اور فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں تم آپس میں دست و گریباں ہو گئے؟ میں تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہوں اگر میرا فیصلہ منظور ہے تو خیر، ورنہ اس وقت جنگ مت کرو، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ آپؐ جو فیصلہ فرمادیں وہ تسلیم کرنا پڑے گا، اور اس سے جو سرتابی کرے گا اس کا کوئی حق نہ ہو گا، حضرت علیؓ نے فرمایا جن لوگوں نے کنواں (کمیں گاہ) کھودا ہے، ان سے خوں بہا چار آدمیوں کا جمع کرو، ایک کا چوتھائی، دوسرے کا تہائی، تیسرے کا نصف اور چوتھے کو مکمل خوں بہا دیا جائے، لوگوں نے اس فیصلہ کو منظور نہیں کیا، اور وہ سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ اُس وقت مقام ابراہیم کے قریب تشریف فرما تھے، ان لوگوں نے ماجرا سنایا، آپؐ نے فرمایا: میں تمہارا فیصلہ کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر آپ خاص انداز کی نشست (جس میں ایک بڑے رومال سے کمر اور گھٹنے کو باندھ لیتے ہیں) بیٹھ گئے، لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ علیؓ ہمارے درمیان فیصلہ کر چکے ہیں، آپؐ نے وہ فیصلہ سن کر اسی کی منظوری دیدی، حضرت حنشؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا علیؓ نے فرمایا چوتھے شخص کو مکمل دیت (خوں بہا) کا حق ہے۔[1]

کتاب وسنت کے عالم جلیل

ابو عمر ابو طفیل کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا، میں نے حضرت علیؓ

---

[1] المستدرک ج ۱ ص ۷۷

کو اس وقت دیکھا جب لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے، اور کہہ رہے تھے، کتاب اللہ کے بارے میں جو چاہو پوچھ لو، بخدا قرآن کریم میں کوئی بھی ایسی آیت نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ یہ رات کو نازل ہوئی ہے، یا دن کو (ہموار) راستے میں چلتے ہوئے نازل ہوئی ہے یا اس وقت جب آپ کسی پہاڑی پر تھے[1]۔

شریح بن ہانی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مسح علی الخفین کا مسئلہ دریافت کیا انھوں نے کہا علی سے پوچھو، اُن کو میری نسبت یہ مسئلہ زیادہ معلوم ہے، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں جایا کرتے تھے، پھر میں نے حضرت علی رضؓ سے دریافت کیا، انھوں نے کہا: فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسافر کے لئے تین راتیں اور دو دن ہیں اور مقیم کے لئے ایک دن و رات[2]۔

حضرت علی رضؓ سے روایت کی ہوئی ۵۸۶ حدیثیں ہیں[3]۔

ایک نرم خو اور مُونس انسان

سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ اپنی شجاعت، دلیری، دل کی مضبوطی اور ارادہ کی پختگی کے ساتھ ساتھ انتہائی نرم دلی اور اُنس و محبت رکھنے والے انسان تھے، نازک انسانی احساسات کے مالک تھے، بہت ہی ملنسار، دلنواز، نرم خو طبیعت پائی تھی، انسان کی یہ خصوصیات اپنے تمام جمال و کمال کے ساتھ اس وقت نمایاں ہوتی ہیں، جب اس کا قاتل اس کے روبرو کھڑا ہو، روایت ہے کہ اس کے بارہ میں جس نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے آپ پر حملہ کیا تھا آپ نے اپنے صاحبزادہ سیدنا حسن رضؓ سے فرمایا:

"دیکھو حسن! اگر میں اس کے حملہ سے جانبر نہ ہو سکوں تو اس پر ایک ہی وار کیا جائے،

---

[1] ازالۃ الخفاء ص ۲۶۸ [2] المسند ج ۱ ص ۹۶ [3] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۶۷

اس کا مثلہ ہرگز نہ کیا جائے، میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، خبردار کسی کا مثلہ نہ کیا جائے خواہ کٹھا کتا ہی کیوں نہ ہو[1]۔

جب ابن ملجم کو آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے فرمایا اس کو گرفتار کرو اور اس سے نرمی کا معاملہ کرو، اگر میں زندہ رہ گیا تو رائے قائم کروں گا کہ اس کو معاف کر دوں یا قصاص لوں، اور اگر میں مرجاؤں تو ایک جان کا بدلہ صرف ایک جان ہے[2]۔

جب سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ حضرت طلحہؓ کی لاش پر گئے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اپنے دستِ مبارک سے ان کے رخسار پر پڑی ہوئی گرد صاف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے، ابو محمد برداشت نہیں ہوتا کہ تم کو آسمان کے تاروں کے سایہ میں زخموں سے چور اور پٹیوں میں بندھا دیکھوں اس موقع پر آپ کی زبان سے نکلا کہ کاش اس دن کو دیکھنے سے بیس برس پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہوتے[3]۔

حضرت علیؓ جس طرح اپنے چھوٹوں پر شفقت کرنے میں مشہور تھے، اسی طرح اپنے بڑوں کی بزرگداشت اور عزت کرنے میں ممتاز تھے، بچوں سے پیار کرتے ان سے ہنسی کھیل کی بات کرتے اور ایسے لوگوں کو پسند کرتے جو بچوں کی دلجوئی اور دلبستگی کی باتیں کرتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے :۔

"باپ کا بیٹے پر اور بیٹے کا باپ پر حق ہے، باپ کا یہ حق ہے کہ بیٹا ہر حال میں اس کی اطاعت کرے اِلّا یہ کہ باپ کسی معصیت کی بات کا حکم دے اس میں اس کا اتباع نہیں کیا جائے گا، اور باپ پر بیٹے کا یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اچھی تربیت کرے اور قرآن پڑھائے[4]۔"

---

[1] الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ۔ ج ۲ ص ۳۳۵ [2] الجوہرۃ فی نسب النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ العشرہ۔ ج ۲ ص ۲۷۴ [3] العبقریات الاسلامیہ ص ۹۵۹ [4] ایضاً ص ۹۸۲

ابو القاسم البغویؒ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتی تھیں میں نے علی (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا کہ ایک درہم کی کھجور خریدی اور اپنی قبا کے دامن میں اس کو اٹھالیا، ایک شخص نے کہا، امیر المؤمنین! میں اُٹھالوں؟ فرمایا یہ بچوں والے کا کام ہے کہ اپنا سامان خود اُٹھائے۔[1]

ایک شخص آپ کی خدمت میں آکر کہنے لگا: یا امیر المؤمنین میری آپ سے ایک ضرورت ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اپنی ضرورت زمین پر لکھ دو، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ سوال تمھارے چہرے پر پڑھوں، چنانچہ اس نے لکھا، آپ نے اس کی طلب سے زیادہ اس کی حاجت روائی فرمادی۔[2]

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے جن امور کی ابتدا ہوئی

امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے متعدد ایسے کاموں کی ابتدا ہوئی جس کے آثار نہ صرف یہ کہ باقی و پایندہ ہیں بلکہ جب تک عربی زبان اور اس کے قواعد نحو و صرف باقی ہیں، وہ کارنامہ زندۂ جاوید رہے گا، ابو القاسم الزجاجی کی "امالی" میں مذکور ہے کہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو دیکھا کہ سر جھکائے متفکر بیٹھے ہیں، میں نے عرض کیا، امیر المؤمنین! کس معاملہ میں متفکر ہیں؟ فرمایا میں تمھارے شہر میں عربی غلط طریقہ پر بولتے ہوئے سنتا ہوں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ زبان کے اصول و قواعد میں ایک یادداشت تیار کردوں، میں نے عرض کیا اگر آپ ایسا کردیں تو ہمیں آپ کے ذریعہ زندگی مل جائے گی، اور ہمارے یہاں عربی زبان

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص۵ ، [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البدایۃ والنہایۃ" ج ۸ ص۹

باقی رہ جائے گی، اس گفتگو کے بعد پھر میں تین روز کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ایک کاغذ مرحمت فرمایا جس میں علم نحو کے ابتدائی مسائل درج تھے[1]۔

محقق فاضل استاذ العقاد کا بیان ہے:۔

"یہ بات بالکل سچ ہے کہ اس علم کی تشکیل میں سیدنا علی بن ابی طالبؓ کا سب سے بڑا حصہ ہے، یہ روایت تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ ابوالأسود الدؤلی نے آپ سے اس امر کا شکوہ کیا کہ (ان مفتوحہ ممالک میں) لوگ عربی کا تلفظ صحیح نہیں ادا کرتے اور اُس کے پڑھنے میں غلطیاں کرتے ہیں، آپ نے فرمایا لکھو، جو میں املا کراتا ہوں چنانچہ آپ نے اس کے ابتدائی اصول املا کرائے، اور ابوالأسود سے کہا اسی طرز پر دیگر قواعد لکھ ڈالو، اس وقت یہ علم نحو کے نام سے مشہور ہوا[2]۔ (عربی میں "نحو" طرز کے معنوں میں بولا جاتا ہے) آپ نے فرمایا: "اُنحُ ھذا النحو" یعنی اسی طرز پر چلیئے[3]"۔

العقاد مزید لکھتے ہیں:۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اولین کارناموں میں سے عقائد و علم کلام علم قضا، فقہ اور نحو اور عربی کتابت کے ضبط و اصول کی تدوین ہے[4]"۔

یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اسلامی تقویم (کلنڈر) کے بارے میں یہ فیصلہ کہ سال ہجرت نبوی کو تقویم اسلامی کی اصل قرار دی جائے، حضرت علی کی رائے تھی، جس کو حضرت عمرؓ نے اور دوسرے صحابہ نے پسند کیا تھا اور یہ حکم دیا گیا کہ اسلامی جنتری

---

[1] تاریخ الخلفاء ص۱۸۱ [2] العبقریات للعقاد ص۹۶۹ [3] ایضاً [4] ایضاً ص۹۶۷

کی ابتداء سال ہجرتِ نبویؐ کو قرار دیا جائے[1]، لہذا جب تک مسلمان ہیں یہی تقویم قائم ہے اور قائم رہے گی، ہجرت نبویؐ کو اسلامی جنتری کی اصل و ابتداء بنانے میں بہتیری حکمتیں اور مصلحتیں پنہاں ہیں، جو دعوتِ دین اور انسانی قدروں میں اسلام کی برتری ثابت کرتی ہیں اور جس میں حکماء اور منصف مؤرخوں کے لئے اسلام کی عظمت کا ایک ایسا نشان ملتا ہے جس سے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مذاہب کی عام سطح سے اسلام کس درجہ فائق اور بلند ہے، یہ کام ایک فال نیک اور نویدِ مسرّت بھی ہے کہ ہجرت تاریخ بشریت میں ایک سنگِ میل ہے، اور انسانی کردار کے لئے ایک منارۂ نور۔

ذات نبوی اور آپ کے خصائص سے گہری واقفیت اور مزاج شناسی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خاندانی اور نسبی تعلق، ایک عمر کی رفاقت اور روزمرہ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو آپؐ کے مزاج و اُفتادِ طبع سے اور ذات نبوی کی خاص صفات و کمالات سے گہری مناسبت ہو گئی تھی جن سے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی برحق صلے اللہ علیہ وسلم کو نوازا تھا، وہ آپ کے میلان طبع اور مزاج کے رخ کو بہت باریک بینی اور چھوٹی بڑی باتوں کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے جن کا آپ کے رجحانات پر اثر پڑتا ہے، یہی نہیں بلکہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو ان کے بیان کرنے اور ایک ایک گوشہ کو اجاگر کر کے بتانے میں بھی مہارت تھی، آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و رجحان اور طریق تعامل کو بہت ہی بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷ ص ۳۳۱-۳۳۲

[2] ملاحظہ ہو شمائل ترمذی یا "السیرۃ النبویۃ" از مؤلف ص ۴۲۲-۴۲۳ (عربی)

ایک روایت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کا سراپا بیان کیا ہے، اس میں سے صرف اس قدر نقل کرنا کافی ہوگا:

"(آپ) سب سے زیادہ کشادہ دل، سب سے زیادہ سچی اور ٹھوس بات کرنے والے، سب سے زیادہ نرم خو، اور میل جول میں سب سے زیادہ کریم النفس تھے، آپ پر اگر کسی کی اچانک نظر پڑتی تو وہ ہیبت محسوس کرتا، اور جس کو قریب سے دیکھنے اور میل جول کا سابقہ پڑتا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا، آپ کا وصف بیان کرنے والے کہتے ہیں: آپ جیسا نہ پہلے کوئی دیکھا اور نہ آپ کے بعد کسی کو آپ جیسا پایا صلے اللہ علیہ وسلم۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاج و اُفتادِ طبع، حسنِ سلوک، اور حلم و عفو کی خو سے گہری واقفیت کا اندازہ اس واقعہ سے نمایاں طور پر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان بن الحارث ابن عبدالمطلب جو آپ کے چچازاد بھائی تھے مگر عرصۂ دراز تک (معاذ اللہ) آپ کی ہجو کرچکے تھے اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچا چکے تھے، جب فتح مکہ کے موقع پر راستہ میں سامنے آئے تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا، ابوسفیان نے حضرت علیؓ سے اس کا گلہ کیا، حضرت علیؓ نے اُن کو راستہ سوجھایا اور کہا:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر کھڑے ہوجاؤ اور آپ سے وہی کہو جو برادرانِ یوسف نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا: تاللہ لقد آثرك اللہ علینا وإن کنا لخاطئین" (وہ بولے خدا کی قسم خدا نے تم کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم خطاکار تھے) آپ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی آپ سے زیادہ نرم گفتار ہو، (اس لئے آپ حضرت یوسف کا جیسا جواب دیں گے اور عفو و مرحمت کا معاملہ فرمائیں گے۔)

ابوسفیان نے ایسا ہی کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

"لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو أرحم الراحمین" (آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (ملامت) نہیں ہے خدا تم کو معاف کرے وہ بہت رحم کرنے والا ہے)

حضرت ابوسفیان اس دن کے بعد سے اسلام پر ثابت قدم رہے اور کبھی زندگی میں مارے شرم کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر نہیں اٹھایا۔[1]

سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے زمانۂ خلافت کے وہ پہلو جو تاریخ میں بجا طور پر اجاگر نہیں کئے گئے

عام طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت اور آپ کے عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے مؤرخوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی توجہات کا رخ نہ صرف یہ کہ عراقیوں اور شامیوں سے جنگ کی طرف تھا، بلکہ صرف اہلِ قبلہ سے قتال کرنے میں محصور تھا اور آپ کو ان ملکوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا جو خلفائے سابقین کے زمانہ میں فتح ہوئے' ان ممالک کے انتظامی اور عدالتی استحکام اور مرتدوں کی سرکوبی اور فتنوں کی بیخ کنی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی' اسلامی حدود سلطنت کی توسیع اور نئے ملکوں کے اسلام میں داخل کرنے کی کوشش آپ کی سوانح میں نہیں ملتی۔

اس سلسلہ میں عام طور پر مؤرخوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ضروری تفصیل سے کام نہیں لیا ہے' آپ کی سیرت کا یہ زاویہ پردۂ خفا میں رہا، اور اس کی تفصیل نہیں دی گئی، عراق و شام کی داخلی جنگوں کے واقعات اس درجہ انکار پر حاوی رہے کہ اس کے انبار کے نیچے یہ باتیں دب گئیں، اس سلسلہ کی چند باتیں نقل

---

[1] زاد المعاد۔ ج ا ص ۴۲۱

کی جاتی ہیں، جن کو آپ کی سوانح میں مرکزی حیثیت نہیں دی گئی، اور وہ تاریخ وسوانح میں متفرق جگہوں میں ملتی ہیں۔

مثلاً یہ کہ جب اہلِ فارس اور اہلِ کرمان نے خراج دینے سے انکار کیا اور نظامِ خلافت سے بغاوت کی تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس فتنہ کا سدِباب کیا، اور ان کو خلافت کا مطیع وحلقہ بگوش بنا دیا۔

"تاریخ الأمم والملوک" میں ابن جریر طبری ۳۹ ھ ہجری کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"عمرؓ علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ابن الحضرمی کا قتل ہوا ہے، حضرت علیؓ کے بارے میں لوگوں کی مختلف پارٹیاں بن گئیں، اہلِ کرمان اور اہلِ فارس کو یہ طمع ہوگئی کہ اگر خلافت کو تسلیم نہ کریں تو خراج کی ادائیگی سے بچ جائیں گے، چنانچہ ہر علاقہ کے لوگ اپنے سے قریبی حلقوں پر اثر انداز ہوگئے اور محصّلینِ خراج کو نکال دیا۔

عمر کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو القاسم نے کہا اور وہ مسلمہ بن عثمان سے اور وہ علی بن کثیر سے روایت کرتے ہیں کہ اس موقع پر جب کہ اہلِ فارس نے خراج دینا بند کر دیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ کس کو فارس کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری سپرد کر دیں، جاریہ بن قدامہ نے کہا میں امیر المؤمنین کو بتاتا ہوں کون شخص عزم کا پختہ اور سیاستداں ہے جس کے سپرد جو مہم کر دی جائے اس کے لئے مناسب ہوگا، پوچھا وہ کون ہو سکتا ہے؟ کہا زیاد، فرمایا، اس کے سپرد یہ کام کرتا ہوں، آپ نے ان کو فارس اور کرمان کا والی بنا کر بھیجا، ان کے ساتھ چار ہزار فوجی تھے، انھوں نے اس علاقہ کو سیدھا کر دیا۔"

"عمر نے ابوالحسن سے اور انھوں نے علی بن مجاہد سے روایت کی ہے کہ شعبی کا بیان ہے کہ جب اہلِ جبال نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور خراج ادا کرنے والوں کو حوصلہ ہوا کہ خراج دینا بند کرنے کی ہمّت کریں اور انھوں نے سہل بن حُنیف کو فارس سے نکال دیا جو حضرت علیؓ کی طرف سے عامل مقرر تھے، ابن عباسؓ نے کہا فارس کے سلسلہ میں میں کافی ہوں آپ کی مہم انجام دوں گا، حضرت علی نے ابن عباسؓ کو بصرہ بھیج دیا، اور زیاد کو ایک بڑے گروہ کے ساتھ فارس روانہ کیا، انھوں نے اہلِ فارس کو مطیع و فرمانبردار بنایا اور وہ خراج ادا کرنے لگے۔"[1]

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کے عہدِ خلافت میں فوج کے چند دستے سندھ کی طرف گئے اور اس کے وہ حصے فتح کئے جو پہلے سے اسلامی حکومت میں داخل نہیں تھے، البلاذری "فتوح البلدان" میں لکھتے ہیں :۔

"۳۸ھ کے آخر اور ۳۹ھ کی ابتدا میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں الحارث بن مُرۃ العبدی کو اس سرحد کی طرف بھیجا جو دوسرے علاقوں سے جدا تھی، یہ فوجی دستہ وہاں سے کامیاب ہو کر مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آیا، ایک دن میں یہاں کے مالِ غنیمت میں سے ایک ہزار غلام تقسیم کئے گئے سندھ کے علاقہ قیقان میں جو خراسان سے ملا ہوا ہے، ۴۲ھ میں وہ (اور چند اشخاص کو چھوڑ کر) اُن کے رفقا نے جامِ شہادت نوش کیا، قیقان سندھ میں ہے، خراسان سے اس کی سرحد ملتی ہے۔"[2]

---

[1] تاریخ الأمم والملوک لابن جریر الطبری حوادث ۳۹ھ ج ۶ ص ۷۹

[2] فتوح البلدان للبلاذری، ص ۴۳۸ طبع القاہرہ ۱۳۱۹ھ

قیقان خراسان کا وہ آخری علاقہ ہے جو سندھ سے ملا ہوا ہے ملاحظہ ہو کتاب "مراصد الاطلاع علی أسماء الأمکنۃ والبقاع" تالیف صفی الدین البغدادی (م ۷۳۹ھ) ج ۳ ص ۱۱۴۰ طبع بیروت ۱۹۵۵ء

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان عیسائیوں میں سے جو اسلام قبول کر چکے تھے، ایک جماعت مرتد ہوگئی عمار بن معاویہ الدہنی ابو طفیل سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ مرتد ہو گئے جو اصلاً عیسائی تھے، حضرت علی رضؓ نے وہاں معقل بن قیس التیمی کو بھیجا انھوں نے جنگجو قوم سے مقابلہ کر کے فتح حاصل کی اور اُن کے افراد کو گرفتار کر کے لائے[1]۔

حضرت علی کے بارہ میں احادیثِ فضائل کی کثرت اور اس کا سبب

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل میں کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں، شاید اس کثرت سے کسی اور صحابی رسول یا عہدِ رسالت کی کسی عظیم شخصیت کے بارے میں وارد نہیں ہوئیں، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کی شخصیت کو تقدیر الٰہی میں اور مخصوص حالات و اسباب کی بنا پر، نیز ان غیر معمولی کمالات و امتیازات کی موجودگی میں جن میں سے بعض میں وہ منفرد اور اکثر میں صاحبِ امتیاز تھے، پھر خلافت کے سلسلہ میں ان کو جن نازک مراحل سے گذرنا تھا، اُن سب اسباب نے زبان نبوت (علی صاحبہ الصلاۃ والسلام) کو اُن کے فضل اور امتیاز کے اظہار اور ان کی طرف سے دفاع اور حمایت میں جاری اور مشغول کر دیا، ان احادیثِ فضائل کا ایک معتد بہ حصہ کتب صحاح میں بھی آ گیا ہے، اور بعض کے بارے میں محدثین نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، ان میں امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی (م ۳۰۳ھ) جو صحاح ستہ میں سے ایک کتاب سنن نسائی کے مصنف ہیں، کی کتاب "الخصائص فی مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے[2]، اس کی تصنیف کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے دمشق کے قیام میں دیکھا کہ لوگ کثرت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل سے ناآشنا اور ان کے بارے میں مختلف غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، اور زبان طعن و اعتراض دراز کرتے ہیں، اس سے اُن کو اس کتاب کی تصنیف کی تحریک پیدا ہوئی۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو معانی الآثار للطحاوی۔ ج ۲ ص ۱۰۲ کتاب السیر (باب یکون الرجل مسلماً)
[2] ہمارے سامنے مطبع مظہر العجائب کلکتہ کا مطبوعہ نسخہ ہے، جو ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

باب نہم

جوانانِ اہلِ جنّت کے سردار
حسن وحسین
رضی اللہ عنہما

دونوں کی سیرتوں کے چند پہلو، حضرت حسنؓ کی معاویہؓ سے صلح اور ان کی شہادت
کربلا کا حادثۂ فاجعہ، صالح دینی حکومت کے قیام کی کوشش، حالات کی تبدیلی
ان کوششوں کی افادیت وقیمت

حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حسن بن علی بن ابی طالب رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے فرزند اکبر، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دلبند، خلقِ خدا میں رسولِ خدا سے سب سے زیادہ قریب اور مشابہ تھے، پیدائش صحیح روایات کے بموجب ۳ھ کی ہے، زیادہ خیال یہی ہے کہ نصف شعبان میں ہوئی، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آخر شعبان میں رمضان سے دو ایک[1] روز پہلے ہوئی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے انتہائی محبت فرماتے تھے، جب یہ بچے تھے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی اُن کے رُخسار ولب چومتے اور کبھی اُن کی زبان اپنے دہانِ مبارک میں لے کر چوستے، کبھی گود میں کھلاتے، کبھی سینہ اور پیٹھ پر بٹھاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ سجدہ میں ہوتے اور یہ پُشتِ مبارک پر سوار ہو جاتے اور آپ نہ صرف یہ کہ بیٹھنے دیتے بلکہ ان کی خاطر سجدہ کو اور طول دیتے، کبھی اپنے ساتھ منبر پر چڑھاتے۔[1]

زُہری حضرت انسؓ سے راوی ہیں کہ حسن بن علیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت ہی مشابہ تھے[2]، ہانی، حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حسنؓ کو مشابہتِ رسول حاصل تھی، سینہ سے سر تک اور حسین سینہ سے قدمہائے مبارک تک اپنے نانا کے مشابہ تھے۔[3]

حضرت علیؓ کے دل میں اپنے صاحبزادہ حضرت حسنؓ کی بڑی عزت تھی، وہ ان سے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۳۳ [2] مصنف عبدالرزاق (المجلس العلمی ڈابھیل۔ ط ۱۹۷۰ء) [3] روایت احمد بن حنبل (ابن کثیر۔ ج ۸ ص ۳۳)

احترام و توقیر کا معاملہ فرماتے، ایک روز فرمایا، کبھی تم تقریر کرتے تو میں بھی سنتا، کہنے لگے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں، ایک روز حضرت علیؓ ایسی جگہ جاکر بیٹھ گئے جہاں حضرت حسنؓ کو نظر نہ آسکیں، حضرت حسنؓ نے لوگوں کے سامنے تقریر کی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سُن رہے تھے، جب وہ اپنی تقریر ختم کر کے چلے گئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: "ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"[1] (یہ ایک ہی نسل تو ہے جس میں ایک دوسرے کا فرزند ہے۔ سورۃ آل عمران - ۳۴)

وہ بہت کم بولتے اور اکثر خاموش رہتے، لیکن جب بات کرتے تو کوئی اُن کے سامنے لب نہیں ہلا سکتا تھا، دعوتوں میں کم شرکت فرماتے، کسی لڑائی جھگڑے کے معاملہ میں نہ پڑتے، کسی کے معاملہ میں دخل اندازی نہ کرتے، جب اُن سے رجوع کیا جاتا تو دلیل سے بات سمجھا دیتے۔[2]

انھوں نے تین بار اللہ کی راہ میں اپنا مال نکال دیا، دو مرتبہ تو اس طرح دے دیا کہ اُن کے پاس کچھ نہیں رہ گیا، پچیس بار پیدل حج کئے، قربانی کے جانور آپ کے آگے آگے چلائے جاتے،[3] حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی گھوڑے پر سوار ہوتا اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نظر پڑتی تو بڑھ کر رکاب تھام لیتے اور اس کو اپنے لئے شرف سمجھتے، اُن دونوں میں کوئی طواف بیت اللہ کو نکلتا تو آپ کو سلام کرنے، مصافحہ کرنے کے لئے لوگ اُن پر اس طرح پروانہ وار ٹوٹ کر گرتے کہ ڈر لگتا کہیں اُن کو صدمہ نہ پہونچے۔[4]

حضرت حُذَیفہ سے مرفوعاً روایت ہے "الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة" یعنی حسن و حسین جنتیوں کے سردار ہوں گے، اس حدیث کی اور سندیں بھی ہیں، نیز

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۹ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مکارم سیدنا الحسن" البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۳۷-۳۹ [4] ایضاً

اس باب میں حضرت علیؓ، جابرؓ، بُریدہؓ اور ابو سعیدؓ سے بھی روایتیں ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو منبر پر دیکھا، آپ کے ساتھ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما بھی بیٹھے تھے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بار حاضرین کی طرف متوجہ ہوتے، ایک بار حضرت حسن کی طرف، اور فرماتے "میرا یہ بچہ سردار ہے، امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔"[1]

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ہاشم بن القاسم نے کہا، اُن سے مبارک بن فضالہ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسن بن ابی الحسن نے بیان کیا کہ ہم سے ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بار نماز پڑھا رہے تھے، آپؐ جب سجدہ میں گئے تو حسن بن علی آپؐ کی پُشت مبارک پر چڑھ گئے اور کئی بار اس طرح دیکھا گیا تو لوگوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کیا، ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ اُن کو جس قدر چاہتے ہیں کسی اور کو نہیں چاہتے، فرمایا: "میرا یہ بچہ سردار ہے، اللہ اس کے ہاتھوں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔"[2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت حسن کے بارے میں فرمایا: "میرا یہ فرزند سیّد (سردار) ہے، اس کے ہاتھوں اللہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کو ملا دے گا" اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "میرا یہ فرزند سیّد ہے امید ہے کہ اللہ اس کو باقی رکھے تاکہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان اس کے ذریعہ صلح کرائے" صحابۂ کرام کی ایک جماعت نے اس حدیث کو

1۔ الجامع الصحیح للبُخاری کتابُ الفِتَن۔ 2۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۱ ص ۲۳

روایت کیا ہے۔[۱]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دوش مبارک پر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو لئے ہوئے جا رہے تھے تو ایک شخص نے دیکھ کر کہا: "نِعمَ المرکب رکبت یا غلام" صاحبزادے بڑی اچھی سواری پر بیٹھے ہو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "و نِعمَ الراکب ھو" اور سوار بھی بہترین ہے۔[۲]

حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما اسلام کے شہ سواروں میں ہوئے ہیں۔

نعیم کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوہریرہ نے کہا کہ میں جب حسنؓ کو دیکھتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، اس لئے کہ میں نے دیکھا کہ ایک روز دوڑتے ہوئے آئے اور آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں بیٹھ گئے (حضرت ابوہریرہ نے اپنے ہاتھ اپنی داڑھی پکڑ کر دکھایا کہ یہ) اس طرح ریش مبارک ہاتھ سے پکڑنے لگے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا دہن مبارک کھول کر ان کے منہ میں ڈالنے لگے اور فرماتے جا رہے تھے "اللھم إنی أحبّہ فأحبّہ" اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما، یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔[۳]

ابنِ عساکر نے کہا:۔

"حضرت حسنؓ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک بار مدینہ منوّرہ کے کسی (چہار دیواری سے گھرے ہوئے) باغ کی طرف سے گزر رہے تھے تو ایک نوعمر حبشی غلام کو دیکھا کہ وہ بیٹھا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک روٹی تھی، اور اس کے سامنے کتّا بیٹھا تھا، وہ لڑکا ایک لقمہ خود کھاتا اور ایک لقمہ کتّے کو کھلاتا، اس طرح پوری روٹی تقسیم کر کے

---

[۱] الجوہرۃ فی نسب النبیؐ و اصحابہ العشرۃ ج ۲ ص ۲۰۱ [۲] ایضاً ص ۲۰۳

[۳] حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء از حافظ ابی نُعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی ج ۱ ص ۳۵

آدھی اس کو کھلا دی، حضرت حسن نے پوچھا تم نے کیوں اپنی روٹی میں آدھے کا شریک کتے کو بنا لیا اور خود زیادہ حصّہ نہیں لیا؟ کہنے لگا، میری آنکھیں اس کی (یعنی کتے کی) آنکھیں دیکھ کر شرم محسوس کرتی تھیں کہ میں زیادہ کھا جاؤں، حضرت حسنؓ نے پوچھا تم کس کے غلام ہو؟ کہا میں ابان بن عثمان کا غلام ہوں، فرمایا اور یہ احاطہ کس کا ہے؟ کہا: ابان کا، حضرت حسنؓ نے فرمایا میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ جب تک واپس نہ آجاؤں تم یہیں بیٹھے رہنا، چنانچہ آپ گئے اور اس غلام کو خرید لیا اور احاطہ بھی خرید لیا، اور غلام کے پاس آکر فرمایا: میں نے تم کو خرید لیا، اس نے اُٹھ کر کہا، اللہ اور اس کے رسول اور ان کے بعد میں آپ کے احکام سننے والا اور فرمانبردار ہوں، پھر حضرت حسنؓ نے فرمایا: تو میری طرف سے آزاد ہے اور یہ احاطہ تجھے ہبہ کر دیا۔[1]

حضرت حسنؓ کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش گوئی کی اہمیت اور اس کے نفسیاتی اثرات

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی کہ "اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعہ دو مسلم گروہوں کے درمیان مصالحت کرا دے گا" محض ایک اطلاع نہ تھی جس کو دوسری پیشین گوئیوں کی طرح حضرت حسنؓ اور دوسرے مسلمان سن لینے اور تصدیق کرنے، بلکہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے لئے ایک رہنما اشارہ اور تلقین کی نوعیت رکھنے والا مقولہ بھی تھا، جو ان کی پوری زندگی میں ان کے رجحانات و اعمال کا رُخ

---

[1] تہذیب تاریخ دمشق الکبیر (لابن عساکر ج ۴ ص ۲۱۷ - ۲۱۸ طبع ثانی دار المسیرۃ ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء

مقرر کرتے اور ایک معیار قائم کرتے ہیں "عنوانِ حیات" کا کام دے، اور یقیناً یہ جملہ اُن کے قلب کی گہرائیوں میں اُتر کر اُن کے اعصاب واحساسات پر طاری رہا ہوگا، اور اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہوگا اور اس کی حیثیت ان کے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کی ہوگی، یہ ضروری ہے کہ جب انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سُنی ہوگی جو آپ کے جدِّ امجد بھی تھے، اور نبیِّ برحق بھی، کہ یہ بات آپ کی شفقت ومحبت کا سبب ہے، تو حضورِ انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر مسرّت کی لہر اور آنکھوں میں امید کی چمک بھی دیکھی ہوگی، اور اس کو اپنی زندگی کے مقاصد میں بڑا مقصد، اعلیٰ ترین اُسوہ ونمونہ اور اپنے مستقبل کے لئے رہنما اصول قرار دیا ہوگا۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ پیشین گوئی اُن کی حرکات وسکنات سے ظاہر تھی، یہاں تک کہ اُن کے عالی مرتبت والد ماجد جن کی شفقتیں اس درجہ حاصل تھیں جو سراپا محبت اور صاحبِ فراست آباء کی طرف سے فرمانبردار اور ہونہار اولاد کو حاصل ہو سکتی ہیں، وہ آباء جن کو اللہ تعالیٰ نے جِبلّی طور پر ایسے اعلیٰ کمالات اور فضائل سے نوازا تھا جن کی نظیر ملنی مشکل ہے، ایسے جلیل القدر باپ سے ایسا سعادت مند ومرتبہ شناس فرزند (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد) عرض کرے کہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر کنارہ کش ہو جائیں، اور اللہ کی زمین میں کہیں بھی چلے جائیں یہاں تک کہ عربوں کا دماغ صحیح طور پر کام کرنے لگے اور اُن کو ہوش آجائے، اس وقت اگر آپ کسی گوہ کے بِل میں بھی ہوں گے تو لوگ آپ کو ڈھونڈ نکالیں گے، بغیر اس کے کہ آپ اپنے کو اُن کے سامنے پیش کریں،

---

[1] کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

بہرِ تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر جو بوقتِ ناز کچھ جُنبش ترے ابرو میں تھی

یہ خود آکر بیعت قبول کرنے کی درخواست کریں گے، پھر جس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اہلِ شام سے جنگ کا ارادہ کیا، اور اس کے لئے تیاریاں مکمل کر کے مدینہ سے نکل رہے تھے کہ اپنے حامیوں اور انصار کے ساتھ حریف اور برسرِ مقابلہ لشکر سے جنگ کریں تو اس وقت حضرت حسنؓ ہی تھے، جو سامنے آئے اور عرض کیا:۔

"یَا أَبَتِ دَعْ هٰذَا" "ابا جان آپ اس ارادہ سے باز رہیں، کیونکہ اس راہ میں مسلمانوں کا بڑا خون بہے گا، اور ان کے درمیان اختلافات اور صف آرائی کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہو جائے گا"[1]

ظاہر ہے جو فرزند اپنے والد ماجد سے اس طرح کی باتیں کرے اس کے خمیر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی اور دعاؤں ہی کا اثر ہوگا۔

لیکن سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت حسنؓ کے مشورہ کو قبول نہیں فرمایا، وہ لوگوں کو اس اشتباہ کی حالت میں چھوڑنا پسند نہیں فرماتے تھے، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر، خلافت کو اپنے مرکزِ صحیح پر لانے اور اہلِ حق کو ان کا حق دلانے کی اپنے اوپر جو ذمہ داری سمجھتے تھے، اس سے عہدہ برآ ہونا ان کے نزدیک ضروری تھا قرآن کریم میں آیا ہے "وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا" (ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے۔[2])

سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی خلافت اور حضرت معاویہؓ سے صلح

جب ابن مُلجم کے ہاتھوں سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مجروح ہو گئے اور شہادت

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۲۲۹-۲۳۰ [2] یہ آیت مختلف مذاہب کے قبلوں کے بیان میں تحویلِ قبلہ کے موقعہ پر نازل ہوئی لیکن اس سے اہلِ اخلاص اور اہلِ اجتہاد کے (خلوص اور امکانی غور وفکر کے بعد) سعی وعمل کی منزلوں کے اختلاف اور تنوّع پر بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ - ۱۴۸)

کی وفات کا وقت قریب تھا، لوگوں نے عرض کیا:۔

"امیر المؤمنین کسی کو خلیفہ بنا دیجئے! فرمایا: نہیں، میں یہ کام تم پر چھوڑتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چھوڑا تھا (یعنی بغیر خلیفہ نامزد کئے ہوئے دنیا سے تشریف لے گئے) اگر اللہ تمہارے لئے بہتری کا ارادہ فرمائے گا تو تم میں سے جو مناسب ترین فرد ہوگا، اس پر تم کو جمع کر دے گا، جیسا کہ تم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد سب میں بہتر فرد پر جمع کر دیا تھا۔[1]

لیکن لوگوں نے اسی روز جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا تھا، حضرت حسن (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ پر بیعت کر لی، یہ جمعہ کا روز رمضان کی سترہ[۱۷] تاریخ اور سنہ ۴۰ھ تھا۔"[2]

ابن کثیر کا بیان ہے:۔

"جب حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی وفات ہوگئی (اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت لے لی گئی) قیس بن سعد بن عبادہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اصرار شروع کر دیا کہ اہلِ شام سے جنگ کرنے کے لئے پیش قدمی کریں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی کسی سے جنگ کرنے کی نیّت نہیں تھی لیکن لوگوں نے اصرار کے ساتھ دباؤ ڈالا اور سب مل کر اتنی تعداد میں جمع ہوئے جس قدر پہلے جمع نہیں ہوئے تھے، چنانچہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد کو بارہ ہزار[۱۲۰۰۰] فوجیوں کے ساتھ آگے بھیجا اور خود فوجیوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھے کہ معاویہؓ اور اہلِ شام سے قتال کریں، جب مدائن سے آگے نکلے تو وہاں آکر رُک گئے اور مقدمۃ الجیش کو اپنے سامنے ٹھہرایا۔

---

[1] حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف اشارہ ہے۔ "البدایۃ والنہایۃ" ج ۸ ص۱۴ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۱۴

مدائن کے بیرونی حصہ پر جب وہ لشکر کے ساتھ تھے کسی نے باآواز بلند کہا:

قیس بن سعد بن عبادہ قتل ہو گئے! لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی، اور ایک دوسرے کا سامان لوٹنے لگے، یہاں تک کہ حضرت حسنؓ کے خیمے تک اکھاڑ لے گئے، یہی نہیں جس فرش پر وہ بیٹھے تھے اس کو بھی کھینچ کر اٹھانے لگے اور اس حال میں ایک دوسرے کو زخمی کرنے لگے، اور خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بھی زخم آیا جو کاری نہ تھا، آپ زخمی حالت میں اٹھ کر سوار ہوئے اور مدائن کے قصر میں چلے گئے، مختار بن ابی عبید نے اپنے چچا سعد بن مسعود سے کہا، جو کہ مدائن کا گورنر تھا، کیا تم کو دولت و عزت حاصل کرنے کا راستہ نہ بتاؤں؟ کہا، کیا مطلب؟ کہا حسنؓ کو پکڑوا اور قید کر کے معاویہؓ کے پاس بھیج دو، سعد بن مسعود نے کہا: خدا تجھ کو رسوا کرے اور تیری تدبیر کو غارت کرے، کیا میں نواسۂ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دھوکہ بازی کروں[1]؟"

علّامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

"اہل عراق نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا انتخاب اس نیت سے کیا تھا کہ وہ اہلِ شام سے جنگ کریں گے لیکن وہ جو چاہتے تھے وہ پورا نہیں ہوا، اور اس کے ذمہ دار خود اہلِ عراق تھے کہ وہ خود جنگ سے پہلو تہی کرتے تھے، اور اپنے ذمہ داروں اور قائدین کی مانتے نہیں تھے، اگر وہ سمجھدار ہوتے تو اس نعمتِ خداوندی کی قدر و عظمت کرتے جو ان کو سبط رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، سید المسلمین اور ایک عظیم صحابی اور صحابہ میں بھی عالم و فرزانہ، صاحبِ عزیمت شخصیت کی بیعت سے حاصل ہوئی تھی[2]"

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۱۴ [2] ایضاً ص ۱۶

"جب حضرت حسنؓ نے دیکھا کہ ان کی فوج میں اختلاف وانتشار ہے تو آپ اُن سے بیزار اور مایوس ہوئے، اور حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کو (جو اہلِ شام کے ساتھ سوار ہو کر مسکن تک آچکے تھے) ایک خط لکھا جس میں اُن کے سامنے صلح کی تجویز رکھی، اور چند شرطیں رکھیں کہ اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو وہ امارت سے حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو جائیں گے، اور مسلمان خونریزی سے بچ جائیں گے، لوگوں کو اس خط کا علم ہوا، اور حضرت معاویہؓ کے حق میں اتفاق رائے ہو گیا۔"[۱]

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ خلافت میرے بعد تیس۳۰ سال رہے گی، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ کے حق میں ربیع الاول ۴۱ھ میں دستبردار ہوئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے اس دن تک تیس۳۰ سال پورے ہوتے ہیں۔"[۲]

حضرت معاویہؓ کی فرمائش وخواہش پر حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبرداری کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں حمد وصلاۃ کے بعد فرمایا:-

"اما بعد، لوگو! اللہ تعالےٰ نے تم کو ہمارے پہلے بزرگوں کے ذریعہ ہدایت دی اور آخر کے لوگوں کے ہاتھوں تمھیں باہمی خونریزی سے بچایا، اور اس کام کی ایک مقررہ مدت اللہ کی طرف سے ہے، اور دنیا نام ہی ہے اُلٹ پھیر اور کسی کے غلبہ اور کسی کے مغلوب ہونے کا، اور یاد کرو کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی سے کہلوایا تھا:

وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ — میں خود بھی نہیں جانتا شاید یہ تمھارے لئے

---

[۱] البدایۃ والنہایہ۔ ج ۸ ص ۱۶ [۲] ایضاً

وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ○   آزمائش کا سبب اور محدود مدت
(سورۃ الانبیاء ۔ ۱۱۱)   کے لئے نفع و انتفاع کی چیز ہو۔

حضرت معاویہؓ کو یہ بلیغ مختصر لیکن عمیق و معنی خیز تقریر پسند آئی اور وہ اس کو اپنے دل میں لئے رہے"[1]

"ایک شخص جس کو ابو عامر کہا جاتا تھا، اس نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو خطاب کر کے کہا: "السلام علیك یا مُذِلَّ المؤمنین" (یعنی مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے) کیونکہ آپ نے شامیوں سے جنگ جاری نہیں رکھی، حضرت حسنؓ نے فرمایا: ابو عامر! ایسا نہ کہو، میں نے مسلمانوں کو ذلیل نہیں کیا صرف اس کو ناپسند کیا ہے کہ میری حکومت کی خاطر ان کا خون بہے"[2]

"جب حضرت معاویہؓ کی حکومت قائم ہوگئی اسی سال حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اپنے بھائی حضرت حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) اہلِ خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ (علی ساکنہا افضل الصلاۃ والسلام) واپس آگئے، حضرت حسنؓ جب بھی ان محلوں کی طرف سے گزرتے جو ان کے ہمنوا اور اُن کے گروہ کے تھے، وہ ان پر ملامت آمیز فقرے کستے کہ آپ کیوں حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے، وہ ایک عالی ظرف، کریم النفس اور ہردل عزیز ہستی کے مالک تھے، اور انھوں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا، اپنے دل میں کسی کے لئے کینہ نہیں رکھتے تھے، اور نہ ملامت کا جواب دیتے اور نہ اپنے عمل پر نادم تھے، بلکہ وہ اس سے خوش تھے، اگرچہ یہ بات ہزاروں کو بُری لگی تھی جس میں خود ان کے خاندان کے بعض افراد بھی تھے، اور اُن کے جاں نثار و محب بھی، یہ ملامت کا سلسلہ عرصہ کے بعد پھر شروع ہوا، اور آج تک بہت سے دلوں اور دماغوں میں یہ کھٹک ہے لیکن حق یہ ہے کہ اُن کا یہ طرز قابلِ قدر

---
[1] البدایۃ والنہایۃ ۔ ج ۸ ص۱۸   [2] ایضاً ص۱۹

اور جن کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑے اُن کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے، وہ تعریف کے مستحق تھے، اور ہیں کہ اُمّت کے افراد کو خونریزی سے بچا لیا جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشگوئی کی تھی، اور اُن کی مدح میں فرمایا تھا۔[1]

آپ کی محبّت کا دم بھرنے والے کہا کرتے تھے "یا عار المؤمنین" (اے اہلِ ایمان کے لئے باعث ننگ و عار) اس کے جواب میں فرماتے: "العار خیرٌ من النار"[2] (عار نار سے بہتر ہے) یعنی یہ طعن و ملامت جہنم کی آگ سے بہتر ہے، جس کا مسلمانوں کی خونریزی سے خطرہ تھا۔

ابو داؤد الطیالسی زہیر بن نُفیر الحضرمی سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: میں نے حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) سے کہا: لوگوں کا خیال ہے کہ آپ خلافت چاہتے ہیں؟ فرمایا: "عربوں کی کھوپڑیاں میرے ہاتھ میں تھیں جس سے میں صلح کرتا وہ صلح کرتے اور جس سے میں جنگ کرتا وہ جنگ کرتے، مگر میں نے اس کو (حکومت کو) اللہ کی رضا جوئی کے لئے چھوڑ دیا، کیا اب میں پھر حجاز کے اطراف میں اس آگ کو بھڑکاؤں گا؟"[3]

اور ایک بار فرمایا: "مجھے خوف تھا کہ قیامت کے روز میرے سامنے ستّر ہزار یا اسّی ہزار یا اس سے زیادہ یا کم لائے جائیں اور اُن سب کی رگوں سے خون بہہ رہا ہو، اور جن کا خون بہا وہ اللہ تعالےٰ سے میرے خلاف شکوہ کریں۔"[4]

شہادت کا واقعہ

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا، جو ان کی وفات کا باعث ہوا، عُمیر بن اسحٰق کہتے ہیں، میں اور قریش کے ایک آدمی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے پاس گئے تو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۱۹۔ [2] ایضاً ص ۴۱ [3] ایضاً ص ۴۲ [4] ایضاً

انھوں نے بتایا کہ مجھے بار بار زہر دیا گیا اور ہر مرتبہ پہلی بار سے زیادہ تیز اور سخت قسم کا زہر دیا گیا، اس وقت آپ پر نزع کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور سرہانے بیٹھ گئے اور کہنے لگے بھائی صاحب! کون ہے آپ کو زہر دینے والا؟ فرمایا کیا تم اس کو قتل کرنا چاہتے ہو؟ کہا: ہاں، فرمایا اگر مجھے زہر دینے والا وہی شخص ہے جس کو سمجھ رہا ہوں تو اللہ زیادہ سخت انتقام لینے والا ہے، اور ایک روایت میں ہے "واللہ اشدّ باساً واشدّ تنکیلا" (اللہ زیادہ قوت والا اور زیادہ عبرتناک عذاب دینے والا ہے) اور اگر وہ نہیں ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تم کسی بے قصور کو (شبہ میں) قتل کرو۔[1]

آپ کے جنازہ میں اس قدر لوگ جمع ہوئے کہ کثرتِ ازدحام سے "بقیع" میں جگہ نہ تھی، الواقدی نے ثعلبہ بن مالک سے روایت کی ہے کہ میں اس روز موجود تھا، جس روز حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور بقیع میں تدفین ہوئی، میں نے بقیع میں اتنا مجمع دیکھا کہ اگر سوئی ڈالی جاتی تو زمین پر نہیں کسی کے سر پر گرتی۔[2]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی جس وقت وفات ہوئی اُن کی عمر صحیح روایتوں کے بموجب ۴۷ سال تھی۔[3]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد کی جگہ پر ۴۱ھ میں والی ہوئے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ربیع الاول ۴۱ھ میں صلح کی، معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کے سال کو عام الجماعۃ کہا جاتا ہے آپ کی خلافت چھ ۶ ماہ رہی جس سے خلافت کے تیس ۳۰ سال پورے ہوئے۔[4]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۴۲ [2] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ۔ ج ۱ ص ۲۳۱

[3] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۴۴ [4] الجوہرۃ ص ۲۰۴

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا صحیح موقف

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے معاویہؓ سے صلح اور اُن کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا جو فیصلہ فرمایا وہ برمحل اور بروقت تھا، جس طرح کہ حضرت حُسین رضی اللہ عنہ نے یزید بن معاویہؓ کے معاملہ میں جو موقف اختیار کیا (جس کا تذکرہ آگے آئے گا) وہ بھی اپنی جگہ اور اپنے وقت پر بالکل حق بجانب تھا، کیونکہ حالات، ماحول، زمان و مکان جن میں حوادث پیش آتے ہیں، وہ اپنے اندر ایک خاص ڈگری کی گرمی یا سردی رکھتے ہیں، اور حالات و ماحول اور وقت کی نزاکت اور حالات کی شدّت کو دیکھ کر انسان کسی فیصلہ پر پہونچتا ہے، اور وقت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے، ہر جگہ اور ہر حالت میں ایک ہی عمل روا نہیں رکھا جا سکتا، حضرت معاویہؓ اور اُن کے فرزند یزید کے درمیان سیرت و اخلاق، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ دیکھنے، صحبت اٹھانے اور اسلام میں اُن کی خدمات کو سامنے رکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

حضرت معاویہؓ سے جنگ جاری رہنے کا نتیجہ صرف مسلمانوں کے درمیان خونریزی اور غیر مختتم جنگ ہوتا، اسلامی معاشرہ جو اس وقت تک اندرونی انتشار اور بیرونی خطروں سے دوچار تھا، کشیدگی اور کشمکش کا شکار رہتا، اور ہر وقت امکان تھا کہ بغاوت، پھر بدعہدی اور دھوکہ بازی کی صورت پیش آئے، حضرت حسنؓ دوسروں کی بہ نسبت عراقی فوجوں کی نفسیات سے زیادہ واقف تھے، جن کو اُن کی اور اُن کے والد ماجد کی حمایت کرنے کا دعوٰی تھا، ایک سے زیادہ بار یہ فوج ان کے عظیم المرتبت والد ماجد کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ چکی تھی، اور مستقل مزاجی اور پامردی سے جنگ کے بجائے فرار و فریب کا راستہ اختیار کر چکی تھی حضرت علی بن ابی طالب

کرم اللہ وجہہ نے ان لوگوں کے ہاتھ جو جھیلا اور جس طرح یہ لوگ نافرمانی، خود رائی اور نفس پرستی کی راہ پر لگے رہے، (جن کے اثرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبوں، مکاتیب اور طنز و عتاب میں صاف طور پر ملتے ہیں[1]) حضرت حسنؓ کے سامنے کل کی بات اور عینی مشاہدہ تھا۔

حضرت حُسین بن علی رضی اللہ عنہما

حضرت حُسین بن علی رضی اللہ عنہما پانچویں شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہد چٹایا اور اُن کے دہن پاک کو اپنی زبان بابرکت سے تر کیا، اُن کو دعائیں دیں، اور حُسینؓ نام رکھا، اور جیسا کہ پہلے گزر چکا حضرت حسنؓ کا چہرۂ مبارک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور سے مشابہ تھا، اور حضرت حسینؓ کا جسم پاک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسدِ اطہر کے مشابہ تھا، وفات نبوی کے وقت (جو ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوئی) حضرت حسینؓ کی عمر ساڑھے چھ سال (۶½) کی تھی۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "ایک روز میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا حسن وحسین (رضی اللہ عنہما) دونوں آپؐ کے صدر مبارک پر چڑھے کھیل رہے تھے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلے اللہ علیک وسلم) کیا آپ ان دونوں سے اس درجہ محبت کرتے ہیں؟ فرمایا "کیوں نہیں، یہ دونوں دنیا میں میرے پھول ہیں[2]"، اور حارث علیؓ سے مرفوعًا روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "حسنؓ وحسینؓ جوانانِ جنت کے سردار ہیں[3]"، یزید بن ابی زیاد کی روایتوں میں ہے کہ

---

[1] گزشتہ باب میں اس کے نمونے گزر چکے ہیں۔

[2] رواہ الطبرانی فی المعجم [3] ایضًا

ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسینؓ کے رونے کی آواز سنی تو اُن کی والدہؓ سے کہا: "کیا تم کو معلوم نہیں کہ ان کا رونا مجھے اندوہگیں کرتا ہے"[1]

حضرت حسینؓ نے اس جنگ میں بھی شرکت فرمائی تھی جس نے ۵۱ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا، اس حملہ میں یزید بن معاویہ بھی تھے[2] حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت عبادت گزار تھے، نماز، روزہ اور حج کا بہت اہتمام فرماتے تھے آپ نے بیس[2] حج پاپیادہ کئے تھے،[3] حضرت حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) انتہائی متواضع تھے ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار گزر رہے تھے، غربا کی ایک جماعت نظر آئی جو زمین پر بیٹھی روٹی کے ٹکڑے کھا رہی تھی، آپ نے اُن کو سلام کیا، اُن لوگوں نے کہا (ھلم یا ابن رسول اللہ) فرزند رسول اللہ ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمایئے! آپ گھوڑے سے اتر کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور کھانے میں شریک ہوئے آپ نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی: "اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ"[4] یعنی اللہ تعالےٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب ان لوگوں کی روٹی کے ٹکڑوں پر شرکت فرما چکے اور فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: بھائیو! آپ نے مجھے دعوت دی میں نے قبول کیا، اب آپ سب میری دعوت قبول کیجئے، ان لوگوں نے بھی دعوت قبول کی، اور آپ کے مکان پر آئے جب سب آکر بیٹھے تو آپ نے فرمایا، رباب! لاؤ جو بھی بچا ہوا محفوظ رکھا ہے۔[5]

حضرت ابن عیینہ نے کہا کہ عبداللہ بن ابی زید سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے حسین بن علیؓ کو اس وقت دیکھا جب آپ کے سر اور ریش مبارک کے بال سیاہ تھے، سوائے چند بالوں کے جو ریش مبارک کے اوپری حصہ میں سفید تھے، عمر بن عطا نے کہا:

---

[1] الطبرانی [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۵۱ بعض مؤرخین نے، جن میں امام بخاری کے استاد الحافظ الخلیفہ ابن الخیاط بھی ہیں، حضرت حسینؓ کا جنگ میں شریک ہونے والوں میں ذکر نہیں کیا ہے۔ [3] الجوہرۃ ج ۲ ص ۲۱۳ [4] سورۃ النحل ۔ ۲۳ [5] الجوہرۃ ج ۲ ص ۲۱۳-۲۱۴

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو میں نے وَسمہ (ایک طرح کے خضاب) سے بال رنگتے ہوئے دیکھا ہے، ان کے سر اور ریش کے بال بالکل سیاہ تھے[۱]۔

یزید بن معاویہؓ کی ولایت

حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد حضرت حسنؓ کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا، ان کے بعض عُمّال نے یزید کو خلیفہ بنانے کی تجویز پیش کی اس میں اُن کو تردد تھا، مگر جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو یزید کے معاملہ میں حضرت معاویہؓ کی توقعات اور ولیعہدی کے امکانات روشن ہوگئے، پدرانہ محبت و تعلق کی بنا پر معاویہؓ سے ایسا ہونا غیر طبعی اور غیر فطری بھی نہ تھا، انھوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے اثنائے گفتگو کہا کہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد بھیڑ بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح چھوڑ دوں جو بارش میں بھیگ رہی ہو، اور اس کا کوئی راعی نہ ہو[۲]، یزید کی بیعت جس روز لی گئی اُن کی عمر چونتیس [۳۴] سال تھی[۳]۔

حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت کے لئے لوگوں کو ۴۹ھ میں بلایا، مسلمانوں نے اس کو عام طور پر ناپسند کیا، اور سخت اختلاف کا اظہار کیا، کیونکہ لوگوں کو یزید کے مشاغل، شکار و تفریح سے شغف کا علم تھا، لوگوں نے یزید سے کہا کہ وہ اس کے لئے آگے نہ بڑھیں کیونکہ اُس سے اجتناب و احتیاط اس کے لئے سعی و کوشش کرنے سے بہتر ہے۔

یزید اس عام تأثر کو معلوم کرکے اس ارادہ اور اس کے لئے سعی کرنے سے باز رہے، اور اپنے والد سے گفت و شنید کی اور دونوں اس کے ترک کرنے پر متفق ہوگئے[۴]۔

جب ۵۶ھ شروع ہوا تو معاویہؓ نے یزید کے لئے بیعت لینے کا انتظام شروع کیا اور

---

[۱] سیر اعلام النبلاء، از ذہبی ج ۳ ص ۲۸۱، [۲] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۸۰، [۳] ایضاً ص ۱۴۶، [۴] ایضاً ص ۸۰

لوگوں کو اس امر کی دعوت دی اور تمام ممالک میں اس کی اطلاع بھیج دی، سبھوں نے تمام ممالک میں بیعت کر لی، سوائے حضرات عبد اللہ بن عمرؓ، حسین بن علیؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، اور عبد اللہ بن عباسؓ کے، حضرت معاویہؓ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ آئے، جب (مکہ مکرمہ سے واپسی میں) مدینۂ طیبہ سے گزرے تو ایک تقریر کی یہ لوگ منبر کے پاس موجود تھے، لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی، اور یہ حضرات بیٹھے رہے نہ موافقت کی۔ نہ مخالفت کی کیونکہ اس سلسلہ میں خاصا ڈرایا دھمکایا گیا تھا پس یزید کی بیعت سارے ملکوں میں تسلیم کر لی گئی، اور تمام ملکوں سے یزید کے پاس وفود آنے لگے۔[1]

یزید کا طرزِ زندگی اور اس کی اخلاقی حالت

طبرانی نے بیان کیا ہے کہ "یزید اپنی نوجوانی میں پینے پلانے والا آدمی تھا، اور نوعمروں کی راہ پر چلتا تھا"۔[2]

ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ "یزید میں اچھی عادتیں بھی تھیں، سخاوت، مروت، فصاحت بیانی، شعر گوئی، بہادری، ملکی معاملات میں صحیح رائے دینا اور صورت شکل بھی اچھی تھی، ملنے جلنے میں خوش اخلاق تھا، اس کے ساتھ ساتھ آزادی اور تعیش کی طرف بھی میلان تھا، بعض اوقات نمازیں چھوڑ دیتا تھا، اور اکثر اوقات بالکل غائب کر دیتا"۔[3] سب سے زیادہ جو بات قابلِ اعتراض اور لوگوں کی ناراضگی کا سبب تھی، وہ شراب نوشی کی شہرت غیر اخلاقی طرزِ عمل اور خلاف شرع وضع حرکات تھیں،[4] اس پر الحاد و زندقہ کا الزام نہیں تھا، البتہ اس کے بعض اخلاق و اعمال فاسقانہ تھے،[5] کہا گیا ہے کہ یزید کی ناچ گانے، شراب نوشی،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ صـ ۸۰ [2] ایضاً صـ ۲۲۸ ، [3] ایضاً صـ ۲۳، [4] ایضاً صـ ۲۳۲، [5] ایضاً

راگ ورنگ اور شکار میں عام شہرت تھی، نابالغ لڑکے اور گانے والیاں اور کتے اپنے پاس رکھتا تھا، بیل، مینڈھے، بندر اور ریچھ کو آپس میں لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھنے کا شوقین تھا،[1] ۲۵ھ یا ۲۶ھ یا ۲۷ھ میں پیدا ہوا، اُن کے زمانہ میں اس کے ہاتھ پر اس خیال سے بیعت کرائی گئی کہ وہ اُن کے بعد خلیفہ ہوگا اور اُن کے انتقال کے بعد رجب ۶۰ھ میں اپنی بیعت کی تجدید کرائی۔[2]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

"مجھے معلوم ہے ربِّ کعبہ کی قسم کہ عرب کب ہلاک ہوں گے، جب ان کی قیادت وہ شخص کرے گا جس نے جاہلیت کا زمانہ نہیں دیکھا اور اسلام میں بھی اس کو رسوخ اور خصوصیت حاصل نہیں ہے۔"[3]

یزید کی ولایت اور جیسا کہ اس کے طرزِ زندگی اور اخلاق کا ذکر کیا گیا، ایک ایسا واقعہ تھا، جو اس عہد میں (جو خلافتِ راشدہ سے متصلاً بعد آیا) برداشت کے لائق نہیں تھا، اس وقت عظیم المرتبت صحابۂ کرام اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے تابعین زندہ تھے، ان میں ایسے حضرات بھی تھے، جو خلافت اور مسلمانوں کی سربراہی اور قیادت کے بدرجہا زیادہ مستحق تھے، اور ان مقاصد کو پورا کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے تھے، جو اسلام لے کر آیا تھا، اور جن پر قرآن شاہد ہے، اور جو قیامِ خلافت کی غرضِ اوّلین ہیں، لہٰذا یہ قدرتی بات تھی کہ لوگوں کو بشدّت اس فرق اور عدمِ تناسب کا احساس ہوا، اگر خاصے عرصہ کے بعد یہ شکل پیش آئی ہوتی تو اس شدّت کے ساتھ اس کا احساس نہ ہوتا اور یہ نفسیاتی ردِّ عمل پیش نہ آتا،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۲۳۵، [2] ایضاً ص۲۲۶، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کا انتقال دمشق میں رجب ۶۰ھ میں ہوا، اس وقت ان کی عمر ۷۸ سال کی تھی، اور بتایا جاتا ہے کہ ۸۰ سے متجاوز تھی، دیکھئے البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۱۴۳، [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۲۳۲

جیسا کہ بعد کے واقعات نے (جو خلافتِ اموی و عباسی میں پیش آئے) ثابت کر دیا۔

حادثۂ کربلا

اگر اس دل فگار حادثہ کو چھوڑ دینے کی گنجائش ہوتی جو ہر صاحبِ ایمان اور صاحبِ ضمیر انسان کا سر شرم سے جھکا دینے، اور ندامت سے اس کی پیشانی عرق آلود کر دینے کے لئے کافی ہے، تو ہم اس کا سرے سے ذکر ہی نہ کرتے لیکن تاریخ جو حوادث و واقعات کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے اور وہ ہر نوع اور ہر درجہ کے حوادث ہوتے ہیں (خواہ ان کا دل و دماغ پر کیسا ہی اثر ہو) اُن کا مؤرخ و راوی اپنی خواہش، عقیدہ اور ضمیر کے علی الرغم اور دل پر پتھر رکھ کر بھی ان ناشدنی واقعات کے ذکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر تاریخ نامکمل رہتی ہے، اور حالات و واقعات کا جائزہ مکمل طور پر نہیں لیا جا سکتا، اور اُن سے صحیح نتائج نہیں نکالے جا سکتے، قلب و ضمیر، اور اُن صاحبِ غیرت و ایمان قارئین سے معذرت کرتے ہوئے (جو اہلِ بیتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خاندانِ نبوت کے مقام و حقوق سے واقف ہیں) اس حادثہ کو قلم بند کیا جا رہا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت نہیں کی اور انکارِ بیعت پر مُصر رہے، وہ اپنے جدِّ امجد علیہ الصلاۃ والسلام کے شہر میں مقیم تھے لیکن حکومتِ یزید کے کارندے، اس کے عُمّال نے ان کے انکارِ بیعت کو وہ اہمیت دی جو حضرات، عبد اللہ بن عمر —— عبد اللہ بن زبیر وغیرہ کے انکار کو اہمیت نہیں دی تھی، کیونکہ وہ حضرت حسینؓ کے مقام اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کا جو رشتہ اور نسبت تھی اس کی اہمیت و عظمت اور اُس کے دور رس اثرات سے واقف تھے، اور چونکہ ان کے عظیم المرتبت والد کی

تاریخ سے یہ بات مربوط تھی، اور حضرت معاویہؓ کی حکومت میں جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بھی اُن کارندوں کے علم میں تھے، مگر اُن کی کوششوں کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جھکنا یا نرم پڑنا قبول نہیں فرمایا انھوں نے جو موقف اختیار فرمایا تھا وہ پوری بصیرت اور عزم وارادہ کے ساتھ اختیار کیا تھا، اس سے وہ سرِ مُو منحرف نہیں ہوئے۔

حضرت حسینؓ کو اہلِ عراق کی دعوت اور حضرت مسلم بن عقیلؓ کو اُن کے پاس بھیجنا

جب یزید اور اس کے عُمّال کی طرف سے بیعت طلب کرنے میں سختی ہوئی تو حضرت حسینؓ مکّہ میں آکر پناہ گزیں ہوئے اور اُن کے پاس کثرت سے ملک عراق سے خطوط آئے، جن میں اُن کو دعوت دی گئی کہ عراق آجائیں، اہلِ عراق نے حضرت حسینؓ کو ڈیڑھ سو[۱۵] کے قریب خطوط لکھے، جن میں انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کے ساتھ ایک لاکھ آدمی ہیں، ان خطوط میں اُن سے جلد آنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، عراقی ہر خط میں اصرار کرتے اور ان کو بلاتے کہ وہ آکر یزید بن معاویہؓ کی جگہ بیعت لیں، اس وقت حضرت حسینؓ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل بن ابی طالب کو عراق بھیجا کہ حقیقتِ حال کا پتہ چلائیں، عراقیوں کو بھی اس سلسلہ میں ایک خط لکھا۔

حضرت مسلم کوفہ آئے کوفیوں نے ان کے ساتھ اخلاق کا معاملہ کیا، اور حضرت حسینؓ کی امارت پر بیعت کی، اور قسم کھائی کہ وہ اپنے جان ومال سے مدد کریں گے، اُن کی بیعت پر بارہ ہزار اور پھر بڑھ کر اٹھارہ ہزار جمع ہو گئے تو حضرت مسلم نے حسینؓ کو لکھا کہ وہ تشریف لے آئیں، اُن کے لئے تمام معاملات اور بیعت کی راہ ہموار ہے، حضرت حسینؓ نے مکّہ سے کوفہ کا قصد کیا، اور یزید نے کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو معزول کر دیا کہ اس کا موقف حسینؓ کے

بارے میں کمزور تھا، اور اس کی جگہ پر عبید اللہ ابن زیاد بن سمیّہ کو مقرر کیا اور بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری بھی ملادی۔[1]

اہلِ کوفہ کا حضرت مسلم کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا

حضرت مسلم بن عقیل سوار ہوئے، اور اپنا شعار جو "یا منصور أمِت" تھا کا آوازہ بلند کیا، چنانچہ چار ہزار کوفی جمع ہوئے، عبید اللہ بن زیاد اپنے انصار و اعوان کے ساتھ قصر میں داخل ہوا، اور دروازے بند کر لئے، جب حضرت مسلمؓ اپنی فوج کے ساتھ قصر کے دروازہ پر پہونچے تو امرائے قبائل نے (جو عبید اللہ کے ساتھ قصر میں تھے) اپنے قبائلی قوم کے لوگوں کو (جو مسلمؓ کے ساتھ تھے) اشارہ کیا کہ مسلم کو چھوڑ کر چلے جائیں اور اُن کو دھمکیاں دیں اور ڈرایا، بعض حکّام کو عبید اللہ نے نکالا کہ کوفہ میں گشت کریں اور لوگوں کو مسلم بن عقیلؓ سے علیحدہ ہونے پر مائل کریں، لوگوں نے یہی کیا، عورتیں آکر اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے کہنے لگیں کہ گھر چلو، اور مرد آکر اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے کہتے کہ نکل بھاگو ورنہ کل شام کی فوج آپہونچے گی تو پھر کیا کرو گے، لوگوں نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑا اور تتر بتر ہو گئے، اور مسلم بن عقیلؓ سے پھر گئے، یہاں تک کہ اُن کے پاس صرف پانچسو آدمی رہ گئے، پھر اور کم ہوئے، یہاں تک کہ تین سو رہ گئے، پھر اور گئے یہاں تک کہ صرف تیس رہ گئے، انھوں نے مغرب کی نماز پڑھائی اور کندہ کے دروازوں کی طرف بڑھے یہاں اُن کے ساتھ صرف دس آدمی تھے، پھر وہ لوگ بھی پھر گئے، اور وہ تنہا رہ گئے، یہاں تک کہ کوئی راستہ بتانے والا بھی نہیں تھا، یا جو اُن سے مؤانست کرتا، یا اپنے گھر میں پناہ دیتا، وہ جیسا سمجھ میں آیا ایک طرف

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۱۵۲

چل پڑے تاریکی پھیل گئی تھی، وہ تن تنہا پھر رہے تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کدھر جائیں[1]۔

اہلِ کوفہ نے حضرت مسلمؓ کا جس طرح ساتھ چھوڑا، یہ حکایت بہت طویل اور دردناک ہے، اور اس میں اس بات کے واضح دلائل ہیں کہ مادّی قوت اور جاہ و منصب سے مرعوبیت اور طمع، انسان کی پُرانی کمزوری ہے، خواہ اس کے مقابلہ میں اصول، قدریں اور نمونے جس قدر بھی بلند ہوں[2]، بہرحال انجام یہ ہوا کہ حضرت مسلم بن عقیل ایک گھر میں پناہ گزیں ہوئے، اس گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا، اور ان پر لوگ حملہ آور ہوئے یہ بھی تلوار سونت کر کھڑے ہوئے انھوں نے اُن کو گھر سے تین[3] مرتبہ نکالا، ادھر سے ان لوگوں نے پتھر پھینکنا شروع کئے اور پھر بانسوں کے ڈھیر میں آگ لگادی جس سے اُن کا دم گھٹنے لگا، مجبور ہو کر وہ تلوار لے کر نکلے اور اُن سے دست بدست جنگ کی، عبدالرحمٰن نے جن کے گھر میں وہ تھے، امان دیا، انھوں نے اپنے کو اُس کے حوالہ کردیا، مگر اس نے دشمنوں کے سپرد کردیا، اور وہ لوگ ان کو ایک خچر پر سوار کرکے لے گئے، تلوار بھی چھین لی، اب اُن کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا، اس وقت وہ رو پڑے اور انھیں یقین ہو گیا کہ وہ شہید کردیئے جائیں گے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۸ ص ۱۵۴-۱۵۵

[2] یہ بات پیشِ نظر رہے کہ عراق کی اس مسلم آبادی میں جس سے مسلمؓ اور حضرت حسینؓ کا سابقہ پڑا، بڑی تعداد جدید الاسلام لوگوں، آزاد کردہ غلاموں (موالی) اور مشرقی عرب کے قبائل کے ان افراد کی تھی جن پر پورے طور پر اسلامی رنگ نہیں چڑھا تھا، نیز طویل مدت تک مطلق العنان اور عیش پسند ساسانی سلطنت کے زیر سایہ رہنے سے عراق کی آبادی میں طاقت و دولت پرستی، ابن الوقتی اور موقعہ پرستی کی صفات قومی و انفرادی کردار کے طور پر پیدا ہوگئی تھیں، ان خصوصیات کا ظہور اس وقت پورے طور پر ہوا، جب ایک طرف عقیدہ و اصول و اخلاق تھے، دوسری طرف دولت، جاہ و منصب اور وقتی منافع۔

حضرت مسلمؓ کا پیغام حضرت حسینؓ کے نام اور لوگوں کی نصیحت و مشورہ

اسی دن یا اس سے ایک دن پہلے حضرت حسینؓ مکہ سے نکل چکے تھے حضرت مسلم نے محمد بن اشعثؓ سے کہا کہ اگر تم سے ہو سکے تو میری زبانی حسینؓ کو یہ پیغام بھیج دو کہ وہ واپس جائیں، محمد بن اشعثؓ نے حضرت حسینؓ کو کہلایا کہ واپس جائیں لیکن انھوں نے اس پیغام رساں کی بات کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا: جو بھی اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

حضرت مسلمؓ کو ابن زیاد کے پاس لایا گیا اور اُن کے اور ابن زیاد کے درمیان سخت باتیں ہوئیں، حضرت مسلم ابن عقیلؓ کو زیاد کے حکم سے محل کی چوٹی پر چڑھایا گیا، اور وہ تکبیر و تہلیل، تسبیح و استغفار اور اللہ کے ملائکہ پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے رہے کہ اتنے میں ایک شخص جس کا نام بکیر بن عمران تھا، اس نے اُن کی گردن ماردی اور ان کا سر قصر کے نیچے پھینک دیا، پھر جسم بھی گرا دیا۔[1]

حضرت مسلم بن عقیلؓ نے محمد بن الاشعث سے یہ خواہش کی تھی کہ ایک آدمی سیدنا حسینؓ کے پاس بھیج دیں جو اُن کی جانب سے یہ پیغام دے کہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ واپس جائیے، اہلِ کوفہ کے دھوکہ میں نہ آئیے، کیونکہ یہ آپ کے والد ماجد کے وہی ساتھی ہیں جن سے وہ اپنی موت یا شہادت کے ذریعہ جدائی چاہتے تھے، اور یہ کہ اہلِ کوفہ نے آپ سے بھی دروغ بیانی کی، اور مجھ سے بھی، اور جھوٹے کی کوئی رائے نہیں ہوتی ہے، وہ پیغام رساں حضرت حسینؓ سے مقام زبالہ میں ملا جہاں سے کوفہ کی مسافت چار راتوں کی تھی، اس نے خبر دی پیغام پہنچایا، تو حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا، اللہ ہم کو ہمارے اقدام اور عزم کا اور حکام کی خرابی پر صبر کا اجر عطا فرمائے۔[2]

جب لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت حسینؓ کوفہ پہونچنے پر مُصر ہیں تو اُن کو اُن کے بارے میں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۷ ص ۱۵۶-۱۵۷ [2] ایضاً ص ۱۵۹

اندیشہ ہوا، اور اُن سے اس سے باز رہنے کی درخواست کی، بعض صاحبِ رائے اور محبت رکھنے والے اشخاص نے بھی عراق جانے سے منع کیا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے کہا کہ اہلِ عراق دھوکہ باز لوگ ہیں، ان سے دھوکہ نہ کھایئے، اسی شہر میں رہئے تاآں کہ اہلِ عراق اپنے دشمن کو نکال دیں، پھر وہاں جایئے، حضرت حسینؓ نے کہا: اے ابن عم! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ خیر خواہ اور شفیق عزیز ہیں لیکن اب تو میں نکلنے کا قصد کر چکا ہوں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر آپ جانا ہی طے کر چکے ہیں تو بچوں اور عورتوں کو لے کر نہ جایئے، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ آپ کو کہیں اسی طرح شہید نہ کیا جائے جیسے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا ان کی عورتوں اور بچوں کے سامنے۔[1]

اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے بھی روکا، مگر حضرت حسینؓ نے واپس جانے سے انکار کیا، اس پر ابن عمرؓ نے گلے لگایا اور رو دیئے اور کہا کہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں ایک شہید کو، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی روکا تو حضرت حسینؓ نے کہا کہ میرے پاس چالیس ہزار آدمیوں کی اطلاع آئی ہے کہ انھوں نے طلاق و عتاق کی قسم کھائی ہے کہ وہ میرے ساتھ ہیں،[2] (طلاق کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ اگر انھوں نے غلط بیانی کی تو اُن کی بیویوں کو طلاق، اور عتاق کا مطلب یہ ہے کہ اگر قسم کی خلاف ورزی کی تو ان کے سب غلام آزاد۔)

حضرت ابوسعید الخدریؓ، جابر بن عبداللہ اور سعید بن المسیّب جیسے جلیل القدر حضرات نے بھی اُن کو روکا لیکن وہ سفر پر مُصر رہے،[3] راستہ میں فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی، اس سے صورتِ حال دریافت کی، اس نے کہا کہ اے فرزندِ رسولؐ ان کے (اہلِ کوفہ) دل آپ کے ساتھ ہیں، اور تلواریں آپ کے خلاف اور مدد آسمان سے آتی ہے۔[4]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۱۶۰، [2] ایضاً ص ۱۶۱، [3] ایضاً ص ۱۶۱-۱۶۲، [4] ایضاً ص ۱۶۷

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کوفہ اور کربلا میں

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق کی طرف اپنے خانوادہ کے افراد اور ساٹھ لوگوں کی معیت میں جو کوفہ کے رہنے والے تھے، کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھا، ان کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہاں کیا پیش آیا؟ راستہ میں اُن کو حضرت مسلم کی شہادت جس طرح پیش آئی اس کی خبر ملی، وہ بار بار "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھتے رہے، لوگوں نے کہا کہ اب اللہ ہی آپ کا محافظ ہے، فرمایا: اُن کے بعد اب زندگی میں لذت بھی نہیں ہے، جب حاجر پر پہونچے تو فرمایا کہ ہمارے گروہ والوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے، اب لوگوں میں سے جو شخص واپس جانا چاہے جا سکتا ہے، اس پر کوئی اعتراض یا دارو گیر نہیں ہوگی، چنانچہ لوگ ان کے اردگرد سے ہٹنا شروع ہوئے، یہ وہ اعراب تھے جو دائیں بائیں سے راستہ میں آکر مل گئے تھے، اور آپ کے ساتھ وہی لوگ رہ گئے جو مکہ سے ساتھ تھے۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خطوط سے بھرے ہوئے دو تھیلے اٹھائے اور اُن کو کھول کر پھیلا دیا، کچھ حصے پڑھ کر سنائے حُر نے کہا ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنھوں نے آپ کو ان خطوط میں سے کوئی خط بھی لکھا ہو، حُر وہاں سے ٹل گئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چلنے لگے، کوفہ کے چند افراد حضرت حسینؓ کے پاس آئے، ان سے آپ نے دریافت کیا کہ تمھاری پارٹی کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ اس پر مجمع بن عبد اللہ العامری نے کہا: سربرآوردہ قسم کے لوگ سب آپ کے خلاف جتھہ بنائے ہوئے ہیں کیونکہ ان کو بڑی بڑی رشوتیں مل چکی ہیں، اور ان کی خواہشات پوری کی گئی ہیں، وہ سب کے سب آپ کے خلاف برسرپیکار ہیں، رہے عوام تو ان کے دل

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص ۱۶۹

آپ کی جانب مائل ہیں، مگر ان کی تلواریں کل آپ ہی کے خلاف اٹھیں گی۔[1]

عبید اللہ بن زیاد نے عمر بن سعد کو بھیجا تو حضرت حسینؓ نے فرمایا: عمر! تین باتوں میں سے میرے لئے ایک بات مان لو، یا تو مجھے چھوڑ دو جیسے آیا ہوں واپس جاؤں، اگر اس سے انکار کرتے ہو تو مجھے یزید کے پاس لے چلو، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں، وہ جو پسند کرے فیصلہ کرے، اور اگر یہ بھی ناپسند ہو تو ترکوں کی طرف جانے دو تاکہ میں ان سے جہاد میں اپنی جان دوں، اس نے یہ پیغام ابن زیاد تک پہونچایا، اور اس نے چاہا کہ یزید کی طرف بھجوا دیں، مگر شمر ذی الجوشن نے کہا کہ نہیں ان کو (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو) آپ کا حکم ماننا چاہئے، یہ بات حضرت حسینؓ تک پہنچائی گئی، آپ نے فرمایا نہیں یہ نہیں کروں گا، عمر بن سعد نے آپ سے جنگ میں سستی کی، ابن زیاد نے شمر ذی الجوشن کو بھیجا کہ اگر عمر آگے بڑھیں تو جنگ میں شریک ہو ورنہ اس کو قتل کر دے اور اس کی جگہ لے لے، میں نے تجھ کو والی بنایا، عمر کے ساتھ تقریباً بیس آدمی اہلِ کوفہ کے بڑے آدمیوں میں سے تھے، انھوں نے کہا کہ نواسۂ رسول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تین باتیں پیش کر رہے ہیں، تم اس میں سے کچھ بھی قبول نہیں کرتے؟ یہ سب لوگ حضرت حسینؓ کی جماعت میں آگئے اور اُن کی معیت میں جنگ کی۔[2]

کربلا میں

ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حکم دیا کہ حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو پانی سے روک دیا جائے،[3]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۷۳ (مختصراً) [2] ایضاً ص ۱۷۰ [3] ایضاً ص ۱۷۵ اور ۱۸۰، بہت سے مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت حسینؓ اور ان کے رفقاء سے پانی نہیں روکا گیا، آگے کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت حسینؓ اور ان کے رفقاء نے آزادی سے پانی استعمال کیا، اور حریف لشکر کے لئے بھی اس کی اجازت دی۔

حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھی سب تلواریں حمائل کئے ہوئے تھے، حضرت حسینؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ پانی لیں اپنے گھوڑوں کو پلائیں اور دشمنوں کے گھوڑوں کو بھی حضرت حسینؓ نے ظہر کی نماز ادا کی۔

عمر بن سعد نے شمر ذی الجوشن کو پیدل فوجوں میں رکھا اور وہ لوگ حضرت حسینؓ اور اصحابِ حسینؓ کی طرف جمعرات کے دن نویں محرم کی شام کو پہونچے، اور پیدل وسوار دونوں نے گھراؤ کر لیا، اس موقع پر حضرت حسینؓ نے اس رات اپنے اہلِ خاندان کو وصیت کی اور اپنے ساتھیوں کے سامنے تقریر کی، اور ان کو اختیار دیا کہ جہاں چاہیں چلے جائیں، اور فرمایا کہ دشمنوں کا ہدف تنہا میں ہوں، اُن کے بھائیوں، صاحبزادوں اور بھائیوں کے صاحبزادوں نے کہا، آپ کے بعد ہماری زندگی بیکار ہے، اللہ ہم کو آپ کے سلسلہ میں وہ نہ دکھائے جسے ہم پسند نہیں کرتے، حضرت عقیل بن ابی طالب کے صاحبزادوں نے کہا کہ ہماری جانیں، ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال سب آپ پر فدا، جو انجام آپ کا ہوگا وہ ہمارا ہوگا اور آپ کے بعد زندہ رہنے پر تُف ہے۔[1]

جمعہ کے دن صبح کی نماز حضرت حسینؓ نے ادا کی (بعض روایتوں میں ہے کہ سنیچر کا دن تھا) اور یہ عاشورہ کا دن تھا، آپ کے ساتھیوں میں بتیس[۳۲] سوار اور چالیس[۴۰] پیادہ تھے، حضرت حسینؓ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور قرآن کریم اپنے سامنے رکھا، اور آپ کے صاحبزادہ علی بن حسینؓ (زین العابدین) جو بیمار اور کمزور تھے، وہ بھی جنگ کے لئے تیار ہوئے، حضرت حسینؓ لوگوں کو یاد دلانے لگے کہ وہ کون ہیں، کس کے نواسے اور بیٹے ہیں، اور اُن کی کیا حیثیت اور مقام ہے؟ وہ فرماتے تھے کہ لوگو اپنے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۷۶، ۱۷۷

دلوں کو ٹٹولو اور اپنے ضمیر سے پوچھو، کیا مجھ جیسے شخص سے جنگ کرنا جبکہ میں تمہارے نبیؐ کا نواسہ ہوں درست ہے؟[1] حُر بن یزید الریاحی آپ سے آکر مل گئے، اور اپنے گھوڑے پر یزیدی فوج کے سامنے آگئے اور جنگ کرتے رہے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

اس اثناء میں شمر کھڑا ہوا اور آگے بڑھا، اور حضرت حسینؓ کے رفقاء پر حملے کرنا شروع کیا، اور آپ کے ساتھی تنہا یا دو دو آپ کے سامنے جنگ کرتے رہے، اور آپ اُن کے لئے دعا کرتے رہے، آپ فرماتے "جزاکُمُ اللّٰہُ اَحسَنَ جزاءِ المُتَّقِین" وہ لوگ آپ کے سامنے جنگ کر کے ختم ہو گئے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے فرزندوں اور حضرت حسینؓ کے بھائیوں میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے۔

شمر ذی الجوشن نے آواز دی کہ اب (حضرت) حسینؓ کا کام تمام کرنے میں کیا انتظار ہے؟ چنانچہ آپ کی طرف زرعہ بن شریک التمیمی بڑھا اور آپ کے شانۂ مبارک پر وار کیا پھر سنان بن انس بن عمرو النخعی نے نیزہ چلایا اور گھوڑے سے اتر کر سر مبارک تن سے جُدا کر دیا، اور اس کو خولی کی طرف پھینکا، ابو مخنف کا بیان ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کے جسم اطہر کو دیکھا تو اس پر ۳۳ نشان نیزوں کے اور ۳۴ نشانات دوسری ضربوں کے آئے![2]

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ ۷۲ آدمی شہید ہوئے اور محمد بن حنفیہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۱۷۸-۱۷۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۱۸۸ عبرت کا مقام یہ ہے کہ جس جس شخص کا حضرت حسینؓ سے صف آرا ہونے اور ان کو شہید کرنے میں حصہ تھا، وہ سب ان کے بعد کیفرِ کردار کو پہونچے، مختار نے (باوجود اپنی مشہور گمراہیوں اور بے راہ رویوں کے) قاتلانِ حسینؓ کا پیچھا کیا اور ان لوگوں کو جن کا اس سلسلہ میں ہاتھ رنگین تھا، سب کو موت کے گھاٹ اُتارا "وَاللّٰہُ عَزِیزٌ ذُو انتِقَامٍ"

ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری لکھتے ہیں:۔

"شمر بن ذی الجوشن اپنے باپ ذی الجوشن کی طرح (میکا فیلی) قسم کی فطرت رکھتا تھا، جو اپنی مطلب براری کے لئے جو بھی وسیلہ ہو اس کو اختیار کر سکتا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ سخت دلی اور کینہ پروری میں وہ مشہور تھا۔" (اثر اھل الکتاب فی الفتن والحروب الاھلیۃ فی القرن الاول الھجری) ص۴۹۰

کا بیان ہے کہ آپ کے ساتھ سترہ[۱۷] افراد شہید ہوئے، وہ سب حضرت سیدہ فاطمہؓ کی اولاد سے تھے۔[۱]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جس روز شہید ہوئے، وہ یوم عاشورہ جمعہ کا دن محرم کا مہینہ ۶۱ھ تھا، آپ کی عمر شریف چوّن (۵۴) سال ساڑھے چھ (۶½) ماہ تھی۔

یزید کے سامنے

ہشام کا بیان ہے کہ جب حضرت حسینؓ کا سر مبارک آیا ہے تو یزید بن معاویہؓ کی آنکھ ڈبڈبا گئی، اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اگر تم حسینؓ کو قتل نہ کرتے جب بھی میں تم سے کچھ نہ کہتا، اللہ ابن سمیّہ پر لعنت بھیجے، بخدا اگر میں وہاں ہوتا تو معاف کر دیتا۔[۲]

معاویہؓ بن ابی سفیان کے ایک آزاد شدہ غلام نے بیان کیا کہ جب یزید کے سامنے حضرت حسینؓ کا سر لا کر رکھا گیا تو میں نے اس کو روتے دیکھا، انھوں نے کہا کہ ابن زیاد اور حسینؓ کے درمیان کوئی رشتہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتا۔[۳]

یزید کے سامنے رفقائے حضرت حسینؓ میں سے جو لوگ بچے تھے، وہ لائے گئے تو پہلے اس نے بدزبانی کی پھر بہت نرمی کا معاملہ کیا، اور اپنے گھر والوں کے پاس بھیج دیا، اور اُن کو سامان سفر دے کر مدینہ عزّت کے ساتھ روانہ کر دیا، کوئی روایت اس طرح کی نہیں ہے کہ اس نے ابن زیاد کو ملامت کی ہو، یا سزا دی ہو، یا معزول کیا ہو۔

اس کے مخالف بھی کچھ روایتیں ہیں جن میں یزید کی خوشی اور مسرّت کا اظہار اور شماتت کا بیان ہے، جو کسی مسلمان کے لائق نہیں۔

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ صہ ۱۸۹ (مختصراً) [۲] ایضاً صہ ۱۹۱ [۳] ایضاً صہ ۱۷۱

حرّہ کا واقعہ اور یزید کی موت

۶۳ھ میں حرّہ کا واقعہ پیش آیا جو اسلام کی اوّلین تاریخ کی پیشانی پر بدنما داغ ہے، یزید نے مسلم بن عقبہ کو اجازت دیدی کہ مدینہ میں تین۳ دن تک اس کو ہر طرح کی کارروائی کرنے کی آزادی ہے۔

ابن کثیر کہتے ہیں:-

"ان تین۳ دنوں میں مدینۂ نبوی میں وہ افسوسناک واقعات ہوئے، جن کا بیان کرنا مشکل ہے، یزید کا مقصد صرف اپنی سطوت وحکومت کا استحکام اور ہر طرح کی رکاوٹ اور مخالفت کا خاتمہ کرنا تھا لیکن اللہ نے (اس کے منصوبہ وانتظامات کے برخلاف) اس کو ناکام ونامراد بنا دیا۔[۱]

یزید اس کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہا، وہ بادشاہت سے صرف چار سال لذّت اندوز ہوا اور ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو اِس دنیا سے رخصت ہوا۔"[۲]

یزید کی موت پر آلِ ابی سفیان کی خلافت ختم ہوئی اور مروان بن حکم کی طرف منتقل ہوئی،[۳] یہاں تک کہ اُن کے جانشین بنی عباس ہوئے۔

۱؎ البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۸ ص۲۲۲ ۲؎ ایضاً ص۲۲۶

۳؎ معاویہ بن یزید بن معاویہ اپنے باپ کے بعد حاکم ہوا اور ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو اس کی بیعت لی گئی، یہ شخص عبادت گزار اور صالح تھا، مگر اس کی حکومت کی مدت زیادہ طویل نہیں رہی وہ اپنی حکومت کے زمانہ میں زیادہ تر بیمار رہا، لوگوں کے سامنے نکلتا نہیں تھا، ۲۱ سال کی عمر میں فوت ہوا (کچھ لوگ زیادہ یا کم بھی بتاتے ہیں) بنو اُمیّہ نے اس کے بعد جمع ہو کر ۳ ذی قعدہ ۶۴ھ کو مروان بن حکم کے

(باقی ص۳۷۱ پر)

سیدنا حسینؓ کی شہادت اور حادثۂ کربلا پر اکابر اہلِ سنّت کی رائیں اور تأثرات

ائمۂ اہلِ سنّت اور ان کے بزرگ ترین افراد ہمیشہ یزید اور یزیدی افواج کے قائدین مثلاً عبیداللہ بن زیاد، عمر بن سعد اور شمر ذی الجوشن کی حرکت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے، اور ان سے براءت و بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں، انھوں نے حضرت حسینؓ کی شہادت پر، اور اُن کے ساتھ جو اہلِ بیت شہید ہوئے اُن کی مظلومانہ شہادت پر اپنے دلی رنج و غم اور نا قدرانہ و نفرت آمیز جذبات و تأثرات کا اظہار کیا ہے، ان بیانات و تأثرات کا استیعاب و استقصاء تو مشکل ہے، یہاں چند نمونے ذکر کئے جاتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادہ صالح بن احمد کہتے ہیں:۔

"میں نے والد سے پوچھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو یزید سے محبت ہے تو فرمایا: میرے بیٹے کیا کوئی شخص جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ یزید کو پسند کر سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ والد محترم! پھر آپ اس پر لعنت کیوں نہیں کرتے؟ امام احمد بن حنبل نے کہا بیٹے! تم نے کب اپنے باپ کو دیکھا ہے کسی پر لعنت کرتے ہوئے ؟" [1]

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک گفتگو میں جو اُن کے اور مغل امیر و قائد

(باقی ص ۳۷۴ کا) ہاتھ پر بیعت کی، مروان ۶۵ھ میں فوت ہوا اور اس کا جانشین عبدالملک بن مروان بنا، آلِ مروان میں عرصہ تک حکومت باقی رہی، یہاں تک کہ ان کے خاندان سے بنی عباس کے خاندان میں منتقل ہو گئی اور کئی صدی تک انھوں نے کرّ و فر کے ساتھ حکومت کی وَالْأَرْضُ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ۔

[1] فتاوی ابن تیمیہؒ ج ۴ ص ۴۸۳ (طبع اول ۱۳۸۱ھ الریاض)

بولائی کے درمیان اس وقت ہوئی جب وہ فتنۂ کبریٰ کے بعد دمشق آیا تھا۔

امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا:۔

"جس نے بھی حسینؓ کو شہید کیا، ان کے قتل میں مدد کی یا ان سے راضی ہوا اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت' اللہ تعالیٰ نہ اُن کے عذاب کو دور کرے گا، اور نہ اس کا عوض قبول کرے گا۔[1]

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے شہادت کے ذریعہ عزت بخشی اور اُن کو جن لوگوں نے شہید کیا اور اس میں مدد کی یا اس عمل پر راضی ہوئے اُن کو رسوا کیا، سیدنا حسینؓ اپنے پیش رو شہدائے اسلام کا نمونہ تھے، کیونکہ وہ اور اُن کے بھائی دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں' اور اُن دونوں کی تربیت اسلام کے عین عروج کے زمانہ میں ہوئی، اُن دونوں کو ہجرت' اللہ کے دین کی راہ میں اذیت اور اس پر صبر کا وہ حصہ نہیں ملا تھا، جو اُن کے خانوادۂ عالی کے دوسرے افراد کو مل چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے شہادت سے سرفراز کرکے اُن دونوں کی عزت و توقیر کو یہاں تک پہونچا دیا، اُن کے درجات بلند کئے اُن کی شہادت ایک انتہائی دردناک حادثہ ہے' اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مصیبت کے موقع پر "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھنے کی تعلیم فرمائی ہے:۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ	اور صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی
اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا	کی) بشارت سنا دو' اِن لوگوں پر
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝	جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے'

[1] فتاوی ابن تیمیہؒ۔ ج ۴ ص ۴۸۷

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (سورۃ البقرہ - ۱۵۷ - ۱۵۵)[1]

تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں۔

امام ربانی شیخ احمد بن عبدالاحد السرہندی (جو مجدد الف ثانیؒ کے لقب سے مشہور ہیں) اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یزید سعادتِ توفیق سے محروم اور زمرۂ فساق میں داخل ہے اس پر لعنت بھیجنے میں تامل صرف اس لئے ہے کہ اہلِ سنت کا یہ اصول ہے کہ کسی پر لعنت نہ بھیجی جائے، کوئی متعین شخص اگرچہ کافر ہو اس پر لعنت کرنے میں عجلت نہیں کرنا چاہیئے، اِلّا یہ کہ قطعی طور پر معلوم ہو کہ اس کا کفر پہ خاتمہ ہوا ہو جیسے ابولہب اور اس کی بیوی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ (یعنی یزید) لعن کا سزاوار نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (سورۃ الاحزاب ۵۷)[2]

جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر کو رنج پہنچاتے ہیں اُن پر خدا دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے۔

محدث جلیل شیخ عبدالحق بخاری دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) اپنی کتاب "تکمیل الایمان" میں لکھتے ہیں :-

---

۱ فتاویٰ ابن تیمیہؒ ۔ ج ۴ ص ۵۱۱ ۲ مکتوبات امام ربانی ۔ ج ۱ مکتوب ۲۵۱
(ج ۴ مکتوبات امام ربانی ص ۶، طبع مطبعۂ مجددی امرتسر ۱۳۲۹ھ)

"خلاصۂ کلام یہ کہ یزید ہمارے نزدیک مبغوض ترین افراد میں ہے، وہ جرائم جن کا اس شقی نے (توفیقِ خداوندی سے محرومی کی بنا پر) ارتکاب کیا ہے، وہ ایسے جرائم ہیں کہ اس اُمّت میں کسی سے سرزد نہیں ہوئے ہوں گے۔"[1]

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) اپنی شہرۂ آفاق و بے نظیر کتاب "حُجّۃ اللہ البالغۃ" میں "مبحث الفتن" اور حدیث کے الفاظ "ثم ینشأ دعاۃ الضلال" (پھر گمراہی کی دعوت دینے والے اُبھریں گے) کی شرح میں لکھتے ہیں:-

"گمراہی کی دعوت دینے والا شام میں یزید اور عراق میں مختار ہے۔"[2]

لعن یزید کے جواز و عدمِ جواز کے سلسلے میں دونوں مسالک پر بحث کرنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے:-

"پس جوازِ لعن و عدمِ جواز کا مدار تاریخ پر ہے، اور ہم مقلّدین کو احتیاط سکوت میں ہے، کیونکہ اگر لعن جائز ہے تو لعن نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، لعن نہ فرض ہے، نہ واجب نہ سنّت نہ مستحب، محض مباح ہے، اور جو وہ محل نہیں ہے تو خود مبتلا ہونا معصیت کا اچھا نہیں۔"[3]

صالح نظامِ حکومت کے قیام کی کوششیں، غلط صورتِ حال کی تبدیلی کا وِشیں اور اُن کی قیمت

خلفائے راشدین کے بعد جو خلافت قائم ہوئی وہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

---

[1] "تکمیل الایمان" ص ۱۷۸ (مطبع فخر المطابع لکھنؤ طبع ۱۹۰۶ء)

[2] حُجّۃ اللہ البالغۃ۔ ج ۲ ص ۲۱۳ (طبع المکتبۃ السلفیۃ، لاہور۔ پاکستان)

[3] فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۹ (مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

موروثی وخاندانی نظام پر قائم تھی، عرب اور مسلمان جس کے زیرنگیں تھے، کسی کی ہمت نہ تھی کہ خلفائے بنی اُمیّہ یا خلفائے بنی عبّاس سے مقابلہ کی ہمت کرنا اور کامیابی کی ذرا بھی توقّع ہوتی، صرف وہ شخصیتیں اس بارہ میں مستثنیٰ تھیں جن کی عالی نسبی اور علوِّ خاندانی معروف ومسلّم تھا، اور اُن کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں کی حمایت ودینی حمیّت کی قوت حاصل ہو، حقیقت میں لوہا ہی لوہے سے ٹکرا سکتا ہے، اور ہوا کا مقابلہ آندھی ہی کر سکتی ہے۔

اسی لئے دیکھا گیا کہ اُموی اور عبّاسی خلفاء کے مقابلہ میں جس نے جہاد کا عَلَم بلند کیا اور اصلاحِ حال کے لئے آواز لگائی وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانوادہ کے افرادِ گرامی، اور علوی خاندان کے گُل سرسبد تھے، اُن ہی لوگوں کو اس کا حقیقی غم تھا کہ زمین میں فساد پھیل رہا ہے، بگاڑ بڑھ رہا ہے، خلافت کی روح ختم ہو گئی ہے، مسلمانوں کی دولت وقوت، نفسانی خواہشات کے پورا کرنے اور عیش کوشی کے اسباب فراہم کرنے اور جاہلیت کی سنّتوں کے احیاء میں صرف ہو رہی ہے۔

سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ وعن آبائہ کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن حسین نے ہشام بن عبد الملک الاموی کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا ۱۲۲ھ میں وہ سولی دے کر شہید کئے گئے، حضرت امام ابو حنیفہؒ نے دس ہزار درہم اُن کی خدمت میں بھیجے اور حاضری سے معذرت کی۔[1]

پھر حضرت حسن بن علیؓ کی اولاد میں محمد بن عبد اللہ بن حسن بن علی ذُوالنّفس الزکیّۃ (رضی اللہ عنہ وارضاہ) مدینہ منوّرہ میں اور اُن کے بھائی ابراہیم آپس میں اتفاق کرکے (منصورِ عباسی کے مقابلہ میں) کھڑے ہوئے، امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں حضرات ذوالنّفس الزکیّہ کے طرفداروں میں تھے، اور امام ابو حنیفہؒ نے علانیہ

---

[1] مناقب ابی حنیفہ۔ ج ۱ ص ۵۵

ان کا ساتھ دیا، اور رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، اور منصور کے کمانڈر حسن بن قحطبہ[۱] کو ان سے جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا اور اس کو اس سے باز رکھا، اور یہی حقیقی سبب تھا، امام ابوحنیفہؒ سے منصور کی عداوت کا، جو اُن کی زندگی کے خاتمہ کا سبب ہوا۔

علامہ ابن الاثیر کی "تاریخ الکامل" میں مذکور ہے کہ امام مالکؒ (بن انس) سے محمد ذوالنفس الزکیہؒ کے جہاد میں ساتھ دینے یا نہ دینے کے سلسلہ میں فتویٰ مانگا گیا، اور استفتاء میں کہا گیا کہ کیا یہ جائز ہے، اس حال میں کہ ابوجعفر (منصور) کی بیعت کا قلادہ ہماری گردنوں میں ہے؟ امام مالکؒ نے فرمایا:۔

"تم لوگوں سے زبردستی بیعت لی گئی ہے، اور مکرہ (جس سے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود کوئی کام کرایا جائے) کی قسم کا اعتبار نہیں۔"

اس فتویٰ کے بعد لوگ محمد ذوالنفس الزکیہؒ سے جا کر مل گئے اور امام مالکؒ اپنے گھر سے نہیں نکلے،[۲] محمد ذوالنفس الزکیہؒ کو ۱۴۵ھ میں رمضان کے مہینہ میں شہید کیا گیا، اور ان کے بھائی اسی سال ذوالقعدہ میں شہید ہوئے۔

یہ کوششیں ناکام رہیں، اور ان کا عملی نتیجہ نہیں نکلا، کیونکہ جن حکومتوں کے خلاف یہ اقدام کیا گیا تھا، وہ نہایت مستحکم اور منظم تھیں، ان کے پاس ہتھیار اور مکمل جنگی سامان تھا، ہم نے ماضی اور زمانۂ حال کی تاریخوں میں بکثرت ایسی کوششوں کا حال دیکھا ہے، جو باوجود اس کے کہ اخلاص، شجاعت، ایمان اور سرگرمی پر مبنی تھیں، اُن کے علم بردار وں

۱ے بعض تاریخوں میں حمید ابن قحطبہ نام آیا ہے۔ ۲ے الکامل لابن الاثیر ج ۵ ص ۲۵، یاد رہے کہ اپنے عہد کے دو جلیل القدر اماموں (جن کا شمار اہلِ سنت کے مؤقر ائمۂ اربعہ میں ہے) کی تائید وحمایت اور اعانت و تعاون بڑی اہمیت و قیمت کا حامل ہے، اور اس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اور رہنماؤں کے اخلاص میں کوئی شک نہیں، اُن کے پیروؤں نے بھی ایثار و قربانی اور مہم جوئی میں کوئی کمی نہیں کی، یہ تحریکیں (منظم اور مضبوط حکومتوں کے مقابلہ میں) ناکام رہیں، تاریخ میں یہ انوکھی مثال اور اس دنیا کے نظامِ تکوینی اور قانونِ فطری میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، لیکن سیاسی اور مادّی نتائج کے لحاظ سے ناکامی کے باوجود ان تحریکوں نے اسلام کی روح مزاج کے بقا و تسلسل میں بڑا کردار انجام دیا ہے، کیونکہ ان اقدامات نے تاریخ میں اسلام کی عظمت اور اس کی حیثیت کو نمایاں کر دیا، اگر اس طرح کے واقعات عہد بہ عہد کچھ وقفوں سے پیش نہ آتے تو اسلامی تاریخ نفس پرستی، خود رائی، نفع اندوزی، مُطلق العنان سلاطین کے جَور و استبداد اور خود غرض افراد کے استحصال و موقع پرستی کی ایک مسلسل داستان ہوتی، لیکن ان سرفروش قائدین اور اُن کے صاحبِ ایمان و عزیمت متّبعین نے اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر آنے والی نسلوں کے لئے روشنی کے ایسے منارے قائم کر دیئے جن کے ذریعہ تاریخ کے دُھندلکے میں ایمان کی روشنی جگمگاتی اور بعد میں آنے والی نسلوں کو راستہ دکھاتی رہی ہے، اور اُن کو اسلام کی فرُوسیتِ سابقہ کی یاد دلاتی اور باطل کا مقابلہ کرنے کی ہمت بخشتی رہی، اور اس نے اسلام کی غُربت اور حدود و قوانینِ اسلام کے تعطّل پر خلش کو زندہ رکھا۔

یہ ایک قابلِ صد احترام وراثت ہے جو مسلمانوں کے لئے قابلِ فخر ہے، یہ وہ بیش بہا دولت ہے جس سے نسل در نسل افراد کو رُخصت پر عزیمت سُہولت پسندی اور۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

کے جاہلی اصول پر۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

کے بہادرانہ وجرأت مندانہ اسلامی اصول کو ترجیح دینے پر آمادہ کیا، یہ مجاہدانہ کارناموں کا ایک تسلسل ہے جو دل کو ایمان ویقین اور اعتماد سے معمور اور جوشِ اسلامی سے مخمور کرتا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (سورۃ الاحزاب ۲۳)

(مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا، اُس کو سچ کر دکھایا، تو اُن میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔)

باب دہم

حضراتِ اہلِ بیت اولادِ سیدنا علیؓ اور ان کی پاکیزہ سیرتیں

سادات حسنی و حسینی کی پاکیزہ سیرتیں اور اخلاق عالیہ، اہل بیت کی صاف گوئی اور اعلان حق، مجاہدانہ اور سرفروشانہ کارنامے، تبلیغ و اشاعت اسلام میں ان کا اثر و فیض، تزکیہ و اصلاحِ نفوس اور تربیتِ خلائق میں ان کی گرانقدر خدمات، جہاد اور جنگِ آزادی میں قیادت، ائمہ و امامت کا شیعی عقیدہ، اس کا زندگی، معاشرہ اور اخلاق پر اثر اور اس کے خطرات

حادثۂ کربلا کے بعد اولادِ سیدنا علیؓ کی سیرتیں اور اُن کے کام

حادثۂ کربلا مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے شرمسار کرکے، حکومتِ وقت، اس کے شرکائے کار اور ہم نواؤں کے لئے سامانِ رُسوائی بن کر ختم ہوا، زندگی کا دھارا اپنے رُخ پر بہنے لگا، حضرات علی، حسن اور حُسین (رضوان اللہ علیہم) کے اَخلاف اپنے اَسلافِ کرام کے طریقہ پر گامزن ہو گئے، پاکیزہ خصائل، پاک نفسی اور عالی ظرفی، وہی عبادت میں انہماک اور آخرت طلبی، اصلاحِ نفس کی فکر، اور دنیا سے بے رغبتی، سچی ربانیت وحقانیت اور خودداری اور کردار کی بلندی (جو رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے خانوادہ کے شایانِ شان اور پیغمبروں کے حقیقی وارثوں کی علامت تھی) ان حضرات میں بدرجۂ اَتم موجود تھی، اُن کا طرزِ عمل اور پاکبازی، اور اُن کی سیرتیں اور اخلاق اپنی جگہ پر اعلیٰ دینی مثال ونمونہ اور ایک ایسا اخلاقی دبستان ہے جس سے ہر نسل کے افراد شرافت واخلاق، مُروّت اور سیرچشمی، بدخواہوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور "با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا" کا درس لیتے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے۔

تاریخ کے اس بحرِ زخّار سے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں:۔

حضرت سعید بن المسیّبؒ کہتے ہیں کہ "علی بن حسین (زین العابدینؒ) سے زیادہ خشیتِ الٰہی رکھنے والا انسان میں نے نہیں دیکھا۔"[1]

امام زُہریؒ کہتے ہیں کہ ہم نے کسی قریشی کو ان سے بہتر نہیں دیکھا، اُن کا (امام

---

[1] حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء۔ ج ۲ جزء ۳ ص ۱۴۱

زُہری کا) یہ حال تھا کہ جب حضرت علی بن حسینؒ کا ذکر آتا تو رو پڑتے اور فرماتے کہ "تمام عبادت کرنے والوں کی زینت اُن سے تھی" (یعنی وہ صحیح معنی میں زین العابدین تھے)[۱]

حضرت علی بن حسینؒ (جن کا لقب ہی زین العابدین پڑ گیا تھا) راتوں کو اپنی پیٹھ پر روٹیوں کی بوری لے کر نکلتے اور ضرورتمندوں اور مستحقین کے گھر پہونچاتے۔[۲]

جریر کا بیان ہے کہ جب حضرت علی بن حسینؒ کی وفات ہوئی تو اُن کی پیٹھ پر وہ نشانات دیکھے گئے، جو ان بوریوں کے اٹھانے سے پڑ گئے تھے، جن میں روٹیاں بھر کر وہ راتوں کو نکلتے اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے تھے۔[۳]

شیبہؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ جب حضرت علی بن حسینؒ کی وفات ہوئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ مدینہ منورہ کے سَو گھروں کی پرورش کرتے تھے۔

محمد بن اسحاق کا کہنا ہے کہ اہلِ مدینہ میں بہت سے لوگ اس طرح گزارا کرتے کہ اُن کو معلوم نہ ہوتا کہ اُن کا خرچ کہاں سے آتا ہے، جب حضرت علی بن حسینؒ کی وفات ہو گئی تب انھیں پتہ چلا کہ یہ راتوں کو روٹیاں پہنچانے والے زین العابدین حضرت علی بن حسینؒ تھے۔[۴]

وہ رات اور دن میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے، اور جب تیز ہَوا چلتی تو بے ہوش ہو کر گر جایا کرتے۔[۵]

عبدالغفار بن قاسم کی روایت ہے کہ ایک بار حضرت زین العابدینؒ[۶] مسجد سے

---

[۱] حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء، ج ۲ جزء ۳ ص ۱۳۵ [۲] ایضاً ص ۱۳۶ [۳] ایضاً

[۴] ایضاً [۵] صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی، ج ۲ ص ۵۶

[۶] عربی متن میں ہر جگہ ان کا نام علی بن حسینؒ لکھا ہے مگر چونکہ اردو داں حلقہ میں وہ اپنے لقب سے مشہور ہیں، اس لئے مترجم نے زین العابدین ہی لکھا ہے۔

نکل رہے تھے کہ ایک آدمی نے اُن کو گالی دی، حضرت زین العابدینؓ کے غلام اور ساتھی غصہ میں اس پر دوڑ پڑے، حضرت زین العابدینؒ نے فرمایا: "ٹھہرو، اس کو کچھ نہ کہو" پھر خود ہی اس شخص کی طرف بڑھے اور فرمایا: "ہماری زیادہ تر باتیں اور حالات تم سے پوشیدہ ہیں، تم یہ بتاؤ کہ تمھاری کوئی ضرورت ہے جو میں پوری کرسکوں؟ وہ آدمی نادم و شرمسار ہوا، آپ نے اپنا لبادہ اتار کر اس کو دے دیا، اور ایک ہزار درہم عطا فرمائے اس واقعہ کے بعد جب اس شخص کی آپ پر نظر پڑتی تو پکار اٹھتا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اولادِ رسول (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہیں[۱]"

ایک بار حضرت زین العابدینؒ کے پاس کچھ لوگ مہمان تھے، آپ نے ایک خادم سے کھانا جلد لانے کا تقاضا کیا، وہ عجلت میں اوپر چڑھا، وہ تیزی سے تنور میں بھُنے ہوئے گوشت کی سیخ لے کر آرہا تھا کہ زین العابدینؒ کے ایک بچہ پر (جو نیچے کے زینہ پر بیٹھا ہوا تھا) سیخ گر گئی جس سے وہ فوراً جاں بحق ہوگیا، حضرت زین العابدین نے بجائے باز پرس کرنے یا ناراض ہونے کے غلام سے کہا: "جا تو آزاد ہے، تجھ سے جان بوجھ کر یہ کام نہیں ہوا، اور بچہ کی تجہیز و تکفین میں لگ گئے[۲]"

حضرت زین العابدینؒ کی ولادت ۳۸ھ کے کسی مہینہ میں ہوئی، اُن کی والدہ سلافہ (آخری شاہ ایران یزدگرد کی صاحبزادی) تھیں[۳] آپ کی وفات ۹۴ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی اور آپ کی تدفین آپکے عم بزرگوار حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی قبر مبارک میں ہوئی[۴]،

۱؎ صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی۔ ج ۲ ص ۵۶ ۲؎ ایضاً

۳؎ عام طور پر وہ شاہ بانو کے نام سے مشہور ہیں۔ ۴؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حالات حضرت علی بن الحسینؒ اور آپ کے مناقب، البدایۃ والنہایۃ ج ۹ ص ۱۰۳-۱۱۵

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل صرف حضرت زین العابدینؒ ہی سے جاری رہی۔

حضرت زین العابدینؒ کے صاحبزادہ محمد الباقرؒ اور اُن کے فرزند جعفر (الصادقؒ) اور ان کے فرزند حضرت موسیٰ بن جعفرؒ (جن کا لقب موسیٰ الکاظم ہے) اور اُن کے صاحبزادہ حضرت علی الرضاؒ سب کے سب اپنے آباء و اجداد کے نقش قدم پر بُردباری سخاوت، صداقت اور پاکبازی و خودداری میں مثالی شخصیتوں کے مالک تھے، عمرو بن المقدامؒ کہتے تھے، ابو جعفر محمد الباقرؒ پر جب نظر پڑتی تو دیکھتے ہی یقین ہو جاتا کہ یہ خانوادۂ نبوّت کے چشم و چراغ ہیں[۱]، ان کے صاحبزادہ جعفر بن محمد الصادقؒ عبادت اور یادِ الٰہی میں خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہنے، خلوت گزینی اور دنیا سے بے تعلّقی کو، جاہ طلبی اور رجوعِ خلائق و عقیدتِ عام پر ترجیح دیتے تھے[۲]، امام مالکؒ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ میں جعفر بن محمدؒ کے پاس جایا کرتا تھا، وہ ہمیشہ متبسّم رہا کرتے تھے لیکن جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامِ نامی لیا جاتا تو رنگ پیلا یا ہرا پڑ جاتا، میں مدّت دراز تک ان کے پاس آتا جاتا رہا، میں ہمیشہ اُن کو تین کاموں میں سے ایک کام میں مشغول پاتا، یا تو نوافل ادا کر رہے ہوتے، یا روزہ سے ہوتے، یا تلاوت کلام پاک میں مشغول ہوتے، کبھی میں نے ان کو بلا وضو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے نہیں سُنا، بے مطلب کسی کی بات میں دخل نہ دیتے، وہ بلاشبہ خدا ترس عابد و زاہد بزرگوں میں تھے[۳]، حضرت موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علیؒ (یعنی موسیٰ الکاظم) اس درجہ کے فیّاض، عالی ظرف اور کریم النفس شخص تھے کہ اگر ان کو کسی شخص کے متعلق معلوم ہوتا کہ وہ ان کی

۱؎ حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۹۳ ۲؎ ایضاً

۳؎ الامام الصادق از علامہ ابو زہرہ ص ۷۶ (مطبوعہ دار الندوۃ الجدیدۃ، بیروت)

بُرائی کرتا ہے تو اس کے پاس کچھ رقم (کبھی ایک ہزار دینار کی تھیلی) بھیج دیتے[1]، وہ چار سو[400]، تین سو[300] اور دو سو[200] دینار کی تھیلیاں تیار رکھتے اور اہلِ مدینہ میں تقسیم کرتے تھے، اُن کے صاحبزادہ حضرت علی رضا (ابن موسیٰ الکاظم) کو خلیفہ مامون الرشید عباسی نے اپنا ولی عہد بنایا تھا، ان کی ولادت ۱۵۳ھ کے کسی ماہ کی ہے، ان کی وفات ماہ صفر کے آخری روز ۲۰۲ھ میں ہوئی، ان کی نمازِ جنازہ خلیفۂ مامون نے خود پڑھائی اور اپنے والد خلیفہ ہارون الرشید کی قبر کے پاس (قدیم طوس حال مشہد میں) دفن کیا۔

سبط اکبر حضرت حسنؓ کی آل و اولاد کا بھی یہی حال تھا۔

مشہور مؤرخ ابن عساکر نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ دمشق الکبیر" میں حضرت حسن بن حسن بن علی کے (جو حضرت حسن مثنیٰ کے نام سے مشہور ہیں) حالات لکھے ہیں، اور ان کے ایسے اوصاف و اخلاق بیان کئے ہیں، جو ان کی سیادت کے شایانِ شان ہیں[2]۔

حضرت عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہما (جن کو عبداللہ المحض کہا جاتا ہے[3]) تابعینِ اہلِ مدینہ اور محدثین میں سے تھے، مؤرخ واقدی کا بیان ہے کہ عبداللہ کثیر العبادت بزرگ تھے، لوگ ان کی بڑی عزت و تعظیم کرتے تھے، ظاہری طور پر بھی بڑی وجیہ اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے، قوتِ گویائی میں بھی ان کو وافر حصہ ملا تھا، مُصعب بن عبداللہ کہا کرتے تھے، میں نے اپنے علماء کو کسی کی اتنی عزت و تعظیم کرتے نہیں دیکھا، جس قدر وہ

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۰۳ [2] ملاحظہ ہو تہذیب تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر ج ۴ ص ۱۶۵-۱۶۹ (طبع دار المسیرہ بیروت ۱۹۷۹ء) [3] ان کو عبداللہ المحض اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے والد حضرت حسن (المثنیٰ) بن حضرت حسن بن علی تھے، اور ان کی والدہ فاطمۃ الصغریٰ، حضرت حسین شہید کی صاحبزادی تھیں، اس طرح یہ پدری و مادری دونوں واسطوں سے خالص ہاشمی علوی تھے (المحض کے معنی خالص و مکمل کے ہیں)

عبداللہ المحض ؒ کی تعظیم کرتے تھے، ربیعہ ؒ نے ایک مرتبہ ان کو گفتگو کرتے ہوئے سُنا تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ طرزِ گفتگو انبیاء کی اولاد ہی کا ہوسکتا ہے۔

مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ کچھ لوگ بیٹھے تھے، ان میں مشہور عالم و محدث ایّوب بھی تھے، پیچھے سے کسی آنے والے نے ان کو سلام کیا، وہ اپنے پورے جسم کے ساتھ اس کی طرف مُڑ گئے اور آہستہ سے جواب دیا، پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس اہتمام و تعظیم کو دیکھ کر اُن سے پوچھا گیا یہ کون ہیں؟ کہا: "فرزندِ رسول عبداللہ بن حسن ہیں"[1]

ابن کثیر کا بیان ہے: عبداللہ المحض بن حسن المثنّیٰ ابن حسن بن علی بن ابی طالب (رضوان اللہ علیہم) کی علماء بڑی تعظیم کرتے تھے، وہ باوقار عابد و زاہد بزرگ تھے، یحییٰ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگوں کو ان پر بڑا اعتماد اور ان کی نگاہوں میں ان کی بڑی وقعت اور وزن تھا، ان سے بہت سے مُحدّثین نے احادیث کی روایت کی ہے، جن میں سفیان ثوری، دراوردی اور مالک بھی ہیں، سنِ وفات غالباً ۱۴۵ھ ہے۔[2]

ان کے صاحبزادہ محمد نے حکومتِ وقت (عبّاسیوں) کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کیا تھا، بہت ہی بلند ہمّت اور صاحبِ عزیمت بزرگ تھے، ان کا بڑا رُعب داب تھا، شجاعت میں یکتا،[3] کثیر الصّیام اور کثیر النّوافل تھے، (جسمانی طور پر) نہایت قوی و توانا تھے، ان کا لقب المہدی اور النّفس الزّکیہ تھا،[4] ان میں بنی ہاشم اور اہلِ بیت نبوّت کی تمام خصوصیات نظر آتی تھیں، مُروّت، لوگوں کا لحاظ و خیال، ان کو اپنی وجہ سے کسی اذیّت اور خطرہ میں نہ پڑنے دینا اُن کا خاص وصف تھا جب خلیفہ منصور کی فوج سے مدینہ منورہ میں مقابلہ ہوا اور اُن کو

---

[1] تاریخ ابن عساکر۔ ج ۴ ص ۳۵۷-۳۶۶ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۹ ص ۹۲

[3] ایضاً ج ۱۰ ص ۹۵ [4] الکامل لابن الأثیر ج ۵ ص ۵۵۳

اپنی شہادت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے گھر جا کر وہ رجسٹر جلا دیا جس میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کے نام درج تھے، کیونکہ اُن کو ڈر تھا کہ ان کے بعد (ان کی حمایت و نصرت کے الزام میں) ان پر سختی کی جائے گی، اور اُن کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔[1]

نسبتِ نبوی کی غیرت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات گرامی سے ان حضرات کو نسبی تعلق کا جو شرف حاصل تھا، اس کے بارے میں ان کے اندر شدید غیرت و احتیاط پائی جاتی تھی، اس نسبت سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنا اس کی ناقدری اور اس کا بے جا استعمال سمجھتے تھے، جس طرح دوسری قوموں اور مذاہب میں دیکھا جاتا ہے کہ اونچی ذات والے اپنی عالی نسبی یا خاندان ونسل کی خصوصیت کو اس طرح کام میں لاتے ہیں کہ ان کے ماننے والے اُن کو مقدس اور قانون سے بالا سمجھتے ہیں، گویا وہ کوئی مافوق البشر مخلوق ہیں، لیکن تاریخ وسیر کی کتابوں سے فرزندانِ رسول وساداتِ کرام کی خودداری اور عزتِ نفس کی جو تصویر ملتی ہے، وہ کُلّیۃً اِن برہمن زادوں اور ایرانی و مسیحی دنیا کے مذہبی اجارہ داروں کے طرزِ عمل سے مختلف ہے، جو مذہب وخاندان کا استحصال کرتے ہیں، اور مذہبی خدمات کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، مختلف ادیان اور اقوام میں ایک طبقہ ہمیشہ ایسا رہا ہے جو پیدائشی طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا، اور اس کو اپنی گزربسر کے لئے کسی محنت یا جدّوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اس کا سلسلہ دورِ حاضر تک جاری ہے۔

ایک مرتبہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما بازار تشریف لے گئے، کوئی چیز خریدنا چاہتے تھے، آپ نے اس کا بھاؤ معلوم کیا، دوکاندار نے اس کی عام قیمت بتائی، ابھی سودا

---

[1] الکامل لابن الأثیر ج ۵ ص ۵۴۷-۵۴۸

نہیں ہوا تھا کہ دوکاندار کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ یہ نواسۂ رسول حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہیں، اس نے ذاتِ نبوی سے تعلق و نسبت کے احترام میں قیمت کم کر دی، لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس رعایت کو قبول نہیں فرمایا اور مطلوبہ چیز چھوڑ کر چلے آئے، اور فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قرب و تعلق کی بناء پر حقیر سے حقیر فائدہ بھی اٹھاؤں۔

جُوَیریہ جو حضرت زین العابدینؒ کے خادم خاص تھے، کہتے ہیں، علی بن حسین بن علی (زین العابدینؒ) نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عزیزداری کے تعلق کی بنا پر ایک درہم کا فائدہ بھی نہیں اٹھایا[1]، آپ جب کسی سفر پر جاتے تو اپنے آپ کو ظاہر نہیں ہوتے دیتے تھے، آپ سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا: مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر کوئی ایسا فائدہ حاصل کروں جس کا جواب اور بدل (سفر اور عجلت کی وجہ سے) نہ دے سکوں[2]۔

اسی طرح حضرت علی رضا (بن موسیٰ الکاظم) کا بھی حال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی جب سفر کرتے تو اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، جب اُن سے اس کا سبب دریافت کیا گیا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں، تو فرمایا: میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر وہ چیز حاصل کروں جس کا (سفر کی وجہ سے) مناسب جواب نہ دے سکوں[3]۔

مبالغہ اور غلو کے ساتھ مدح سرائی اور اظہار محبت سے نفرت

یہ حضرات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے نسبی تعلق کے اظہار و افتخار کے بارے میں بہت محتاط تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہودیت، عیسائیت اور برہمنیت کے جیسے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۹ ص ۱۰۶ [2] وفیات الاعیان لابن خلکان۔ ج ۲ ص ۴۳۴ (مطبعۃ النہضۃ۔ قاہرہ ۱۹۴۸ء) [3] ایضاً ج ۲ ص ۴۳۴

دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی طرح اس نسبی تعلق کو بیان کرنے میں مبالغہ آرائی اور غلو سے کام لیا جائے، چنانچہ یحییٰ بن سعیدؒ سے روایت ہے وہ کہتے تھے کہ: ایک مرتبہ کچھ لوگ حضرت زین العابدینؒ کے پاس جمع تھے، اور ان کی مدح سرائی کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: ہم سے محبت و احترام کا تعلق صرف اللہ کے لئے اور اسلامی رشتہ کی بناء پر قائم کیجیے، میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ہم سے ایسی محبت و عقیدت کا اظہار کرنے لگے ہیں جو ہمارے لئے عار بن گئی۔[1]

اسی طرح خلف بن حوشب نے حضرت زین العابدینؒ کے متعلق بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اے اہلِ عراق، اے کوفہ کے لوگو! ہم سے آپ اسلام کی بنا پر محبت رکھئے، ہم کو اتنا نہ بڑھائیے جتنا ہمارا حق نہیں ہے۔[2] آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم اہلِ بیت خوشی اور پسندیدہ بات پیش آجانے پر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، اور کوئی مصیبت یا ناپسندیدہ چیز سامنے آتی ہے تو اس پر اللہ کی حمد کرتے ہیں۔[3]

اسی طرح حسن (مثنیٰ) بن حسن بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم نے ایک شخص سے کہا: جو آپ کی مدح سرائی میں مبالغہ کر رہا تھا، اے نامرادو![4] ہم لوگوں سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرو، اگر ہم اس کے احکام پر چلیں تو ہم سے تعلق رکھو اور اگر ہم اس کی نافرمانی کریں تو ہم سے دور رہو، اگر اللہ تعالےٰ کسی قرابت اور رشتہ داری کی بناء پر

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ۳ جزء سوم ص ۱۳۶ [2] ایضاً ص ۱۳۷ [3] ایضاً ص ۱۳۸

[4] عربی متن میں "ویلکم" استعمال ہوا ہے، اور "ویلکم یا ویحکم" کے لفظی معنی ہیں "تمھاری بربادی ہو" یا "اے نامرادو!" مگر درحقیقت یہ لفظ صرف مخاطب کو ذرا تیز لہجہ میں خطاب کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے، یہ بولنے کا طریقہ ہے کبھی کبھی لوگ اس طرح کے الفاظ پیار سے بھی کہہ دیا کرتے ہیں، جیسے اردو میں اے کمبخت، مقصود یہ نہیں ہوتا کہ اے وہ جس کی شامت آگئی ہے (مترجم)

رعایت کرنا تو بیٹے کی وجہ سے اس کے ماں باپ کو بخش دینا، ہمارے بارے میں حق بات کہا کرو[1]
کیونکہ تمھاری مطلب براری کے لئے یہ بہت کافی ہے، اور ہم تم سے اس بات پر خوش رہیں گے،
اسی طرح اپنے مدح سراؤں سے فرمایا: اللہ کے بندو! ہم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لائیں تو
ہم سے اللہ کی اطاعت کی بناء پر محبت یا تعلق رکھو، اور اگر ہم اس کی نافرمانی کریں تو اس کی
معصیت کی وجہ سے ہم سے قطع تعلق کرو۔[2]

ان حضرات کو ہمیشہ مسلمانوں کے اتحاد اور وحدتِ کلمہ کی فکر دامن گیر رہا کرتی تھی،
عبداللہ ابن مسلم بن بابک عرف البابکی (حضرت زید بن علی شہیدؒ کے ایک رفیق) روایت کرتے ہیں:۔
"ہم لوگ زید بن علیؒ کے ساتھ مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے، جب آدھی رات ہوئی اور
ثریّا (ایک تارہ) نمایاں ہو کر بھرپور روشنی دینے لگا تو زید بن علیؒ نے فرمایا: اے بابکی! کیا تم
اس تارہ (ثریّا) کو دیکھ رہے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ عرض کیا
نہیں، فرمایا" واللہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اس تارے سے میرے ہاتھ لگیں، اور وہاں سے
گر کر میرا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اللہ (اس کے عوض میں) محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
اُمّت میں صلح و اتحاد پیدا فرما دے"۔[3]

خلفائے ثلاثہؓ کے فضل و کمال کا اعتراف اور ان کا دِفاع

یہ حضرات ہمیشہ تینوں خلفائے راشدین کی خدمتِ اسلام کے کارنامے اور مسلمانوں
پر ان کے حقوق کا اعتراف کیا کرتے تھے، اور اس کا اظہار علانیہ اور مجمعِ عام میں کیا کرتے تھے،

---

[1] ابنِ عساکر ج ۴ ص ۱۶۵-۱۶۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۹ ص ۱۷۱ [3] مقاتل الطالبیین
لابی الفرج الاصبہانی (۲۸۴-۳۵۶ھ) ص ۱۲۹ نشر دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر بیروت۔

چنانچہ یحییٰ بن سعیدؒ سے روایت ہے کہ حضرت علی بن حسین (زین العابدینؒ) کی خدمت میں چند عراقی آئے اور انھوں نے حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بارے میں کچھ ناروا بات کہی، جب وہ لوگ کہہ چکے تو حضرت زین العابدینؒ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں نہیں ہو جن کے بارے میں قرآن کریم میں آتا ہے :-

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ	اور ان کے لئے (بھی) جو ان (مہاجرین)
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا	کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ
وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا	اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے
بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا	بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں،
غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ	گناہ معاف فرما اور مؤمنوں کی طرف
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○	سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا
(سورۃ الحشر ـ ۱۰)	ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو بڑا
	شفقت کرنے والا مہربان ہے ۔

تم لوگ میرے پاس سے نکل جاؤ خدا تم سے سمجھے[1]۔

عُروہ بن عبداللہ نے کہا میں نے حضرت محمد الباقرؒ سے تلوار پر زینت و آرائش کرنے کے بارے میں دریافت کیا، فرمایا کوئی حرج نہیں ہے، حضرت ابوبکر الصدّیق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی تلوار پر زینت و آرائش کی تھی، میں نے کہا آپ "الصدّیق" کہتے ہیں؟ وہ ایک دم سے اٹھے اور قبلہ رُخ ہو گئے، اور فرمایا: "ہاں الصدّیق کہتا ہوں، اور جو اُن کو صدّیق نہ کہے اللہ دنیا و آخرت میں اس کی بات کو سچا نہ کرے[2]"۔

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۸۵

مولیٰ جابر الجعفی سے روایت ہے کہ جب میں حضرت محمد الباقر سے رخصت ہوا تو فرمایا کہ اہلِ کوفہ سے کہدینا کہ میں ان لوگوں سے بری ہوں جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے براءت کا اظہار کرتے ہیں[1]۔

محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ حضرت محمد الباقر نے فرمایا: جو شخص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت نہیں جانتا وہ سنّت سے ناواقف ہے[2]۔

ابوخالد الاحمر نے کہا: میں نے عبداللہ المحض بن حسن المثنیٰ سے حضرات شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا: "صلّی اللّٰہ علیھما ولا صلّی علی من لم یصلّ علیھما" (ان دونوں پر اللہ کی رحمت ہو اور جس نے ان دونوں پر رحمتِ خداوندی کی دعا نہیں کی اس پر اللہ کی رحمت نہ ہو) اور فرمایا: "میں ایسے شخص کے بارے میں جو سیّدنا ابوبکر و سیّدنا عمر رضی اللہ عنہما پر سبّ و شتم کرتا ہو توقّع نہیں رکھتا کہ اس کو توبہ نصیب ہو" ان کے سامنے اس دن کا تذکرہ آیا جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو اس قدر روئے کہ داڑھی اور دامن تر ہو گئے[3]۔

اصحابِ عزیمت وکردار، ومردانِ میدانِ کارزار

بزرگانِ اہلِ بیت اور اولادِ شیرِ خدا علیؓ بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اور ان کے فرزندانِ عالی قدر سب کے سب ہمّت و عزیمت کے جوہر سے آراستہ اور اس شجاعت و حمیت کے پیکر تھے، جو خاندانِ نبوی کا شعار اور سیدنا علی المرتضیٰ اور حضرت حسینؓ شہید کربلاء کی وراثت

---

[1] صفۃ الصفوۃ۔ ج ۲ ص ۱۸۵، اور ایک نسخہ میں ہے جو تمسخر کرتے ہیں "ممن ھزأ" کا لفظ ہے۔

[2] ایضاً   [3] تاریخ ابن عساکر ص ۳۵۷-۳۶۶

تھی، ان حضرات نے ہمیشہ عزیمت پر عمل کیا اور راہِ حق میں کبھی کسی اذیت اور خطرہ کی پرواہ نہیں کی، مسلمانوں کو صحیح رُخ پر لگانے میں انھوں نے ہر آزمائش کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

حضرت زید بن علی بن حسینؒ نے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک بن مروان کا، اور حضرت محمد بن عبداللہ المحضؒ (ذی النفس الزکیہؒ) اور ان کے بھائی حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح خلافتِ منصور کے مقابلہ میں اعلانِ حق کیا اور آخر دم تک جہاد کا علم بلند رکھا اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، ان حضرات کا یہی طریق کار تاریخ اسلامی کے ہر دور میں رہا ہے، کوئی جماعت جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اٹھی ہے، بیرونی حکومت سے نبرد آزما اور استعماری طاقتوں کے مقابلہ میں صف آراء ہوئی ہے، خواہ ایشیا میں ہو یا افریقہ میں، ہمیشہ اس کی صفِ اوّلین میں قائدانہ کردار ادا کرنے والا فرد، اسی خاندانِ نبوّت کا فرد ہوگا، ان حضرات کی تاریخ سرفروشی اور شجاعت و پامردی کے واقعات سے پُر ہے، یہ موضوع کسی ایسے صاحبِ نظر، عالی ہمّت اور حق گو مؤرّخ کا منتظر ہے، جس کے اندر اخلاقی جرأت، مطالعہ کے لئے صبر و حوصلہ ہو، اور وسیع معلومات کا حامل ہو کہ وہ کسی ایک کتاب یا سلسلۂ کتب میں اُن کو یکجا کر دے[1]۔

---

[1] مثال کے طور پر سیرت سید احمد شہید (ش ۱۲۴۶ھ) اردو میں مصنف کے قلم سے (۷۶۰ اصفحات میں) مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "سید احمد شہیدؒ" (۱، ۲، ۳، ۴) عربی میں "إذا هبت ريح الإيمان" اردو میں "جب ایمان کی بہار آئی"، انگریزی میں سید غلام محی الدین صاحب کی کتاب "SAIYID AHMAD SHAHEED" ملاحظہ ہوں، نیز مرحوم امیر شکیب ارسلان کے "حاضر العالم الاسلامی" پر محققانہ و فاضلانہ حواشی جن میں طرابلس اور برقہ میں سنوسی تحریک اور الجزائر میں امیر عبدالقادر الجزائری کے جہاد کے بارے میں قیمتی معلومات ہیں۔

ج ۲ ص ۱۴۰-۱۶۵ و ص ۱۶۸-۱۷۲ (مکتبہ عیسی البابی الحلبی، قاہرہ ۱۳۵۲ھ)

سیرت و کردار کے یہ بلند و شاندار نمونے اس (پھیکی) تصویر کے برعکس ہیں جو ان حضرات کی محبت و عقیدت کے مُدّعی اور علَم بردار پیش کرتے ہیں، وہ اپنے غلو میں ہر طرح کے حدود پار کر جاتے ہیں، ان لوگوں نے خانوادۂ نبوی کے افراد کا جو نقشہ اور حلیہ پیش کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ سہمے سہمے، محتاط و مستور الحال رہتے تھے، وہ مصلحت کوشی اور اخفائے حق کی سیاست پر عمل پیرا تھے، "تقیہ" اور مُداہنت سے کام لیتے تھے، وہ اس کو وقتی اور ہنگامی ضرورت نہیں بلکہ مستقل عبادت اور تقرّب الی اللہ کا وسیلہ سمجھتے تھے، اُمّتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کو نبوت کی اصل تعلیم سے بے خبر اور بے گانہ رکھتے تھے، دین کو سر بلند کرنے اور اس کو غالب کرنے کے جذبہ سے عاری و بیگانہ تھے، وہ اس راہ میں کسی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

ان پیشوایانِ ملّت کی جو تصویر ان کتابوں میں نظر آتی ہے، جو اُن کے فضائل و مناقب میں لکھی گئی ہیں قطعًا ماسونیت (FREEMASONS) "جمیعۃ اخوان الصفا"[1] اور زیر زمین باطنی تنظیموں (UNDERGROUND ORGANIZATIONS) سے مختلف نہیں ہے، جو مختلف زمانوں میں وجود میں آئیں اور اب بھی مختلف ممالک میں قائم ہیں، اس تصویر کے (جو ان کتابوں سے سامنے آتی ہے) مطالعہ سے دلوں میں وہ اُمنگ اور دین کو پھیلانے اور اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کا وہ جذبہ نہیں پیدا ہوتا جس نے بارہا تاریخ کا

---

[1] یہ ایک خفیہ یونانی فلسفہ سے متأثر آزاد خیال لوگوں کی جماعت تھی جو اندرون خانہ اور پسِ پردہ کام کرتی تھی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصری فاضل استاد محمد لطفی جمعہ کی کتاب "تاریخ فلاسفۃ الإسلام فی المشرق والمغرب" (مطبوعہ مطبعۃ المعارف مصر ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۷ء کا باب "اخوان الصفا" ص ۲۵۳-۲۷۳)

رُخ بدل دیا اور چودہ[۱۴] صدیوں کی اسلامی تاریخ میں متعدد بار زنار یک و مایوس کن دور کی صورتِ حال کو بدل کر تاریخِ انسانی کو نیا رُخ دینے کی کامیاب کوشش کی۔

ان بزرگوں کا دعوت واشاعتِ اسلام اور تزکیۂ نفوس کا شاندار کارنامہ اور اس کی چند مثالیں

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اہلِ بیت اور سادات کرام سے نسبت کرنے والے سب کے سب معصوم، معیاری انسان تھے، اور سب نے دین کی حمیت، اسلام کی حمایت اور عقائدِ صحیحہ پر استقامت اور اس کی دعوت کا بلا استثناء حق ادا کیا، تاریخ میں اس کے خلاف بھی شواہد ملتے ہیں، اور مسلمانوں کے مختلف طبقات اور خاندانوں میں عظیم المرتبت مجاہدین اور حامیِ دین اور مصلحین و مرشدین پیدا ہوئے، اور خود خاندانِ نبوت کے لوگوں نے اُن سے فائدہ اٹھایا اور ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا، ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ساداتِ کرام اور اولادِ رسول کی خصوصیات و کمالات قرنِ اوّل یا قرنِ ثانی پر ختم نہیں ہو گئے، ان کا سلسلہ بہت بعد کی صدیوں تک قائم رہا، اور اُمّت ان سے فیض اٹھاتی رہی۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات (اولادِ رسولؐ) مسلمانوں کے حالات، مسائل اور وقت کے تقاضوں سے غافل اور یکسو نہیں رہے (جیسا کہ اُن کی محبت کے غالی دعویدار ان کے متعلق بیان کرتے ہیں) اور انھوں نے بعض دوسری قوموں اور مذاہب کے موروثی مذہبی اجارہ داروں کی طرح تن آسانی اور بے ضرر مذہبی پیشوائی کی زندگی نہیں گزاری، بلکہ انھوں نے اپنی قسمت اُمّت کی قسمت سے وابستہ سمجھی اور رکھی اور جہاد و قربانی کے میدان میں وہ اکثر پیش پیش رہے۔

خانوادۂ نبوّت کے چشم و چراغ افراد کی (خواہ ان کا تعلق حسنی شاخ سے ہو یا حسینی شاخ سے) اسلام کے پھیلانے میں گرانقدر خدمات ہیں، اور ان خدمات کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوا، اُن کے ذریعہ اسلام ان ملکوں اور علاقوں تک پہنچا جہاں کبھی اسلام کا اور پیغمبرِ اسلام (علیہ الصلاۃ والسلام) کا نام بھی نہیں سُنا گیا تھا، لاتعداد خلق خدا نے اسلام قبول کیا، اور ان ملکوں میں ابتداء ہی سے اسلام کی جڑیں مضبوط ہوئیں، اور وہاں اسلام کا شجرۂ طیبہ اب تک بارآور و بُرثمر ہے، ان ملکوں میں کثیر تعداد میں علمائے دین اور نفوسِ انسانی کے مُربّی و مُصلح پیدا ہوئے، مغربِ اقصیٰ کے بربر (جو ناقابلِ تسخیر سمجھے جاتے تھے) انھیں ساداتِ کرام کے ہاتھوں پر ہزاروں کی تعداد میں مشرّف باسلام ہوئے[1]، برِّصغیر ہند کے علاقۂ کشمیر میں (جہاں آج بھی بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے) اسلام کی اوّلین دعوت دینے والے مبلّغِ اعظم امیر سید علی بن شہاب الہمدانی تھے (م ۷۸۶ھ[2])

اسی طرح جنوب مشرق ایشیا اور جزائر انڈونیشیا میں اسلام پھیلانے میں نمایاں اور

---

[1] اہلِ علم جانتے ہیں کہ ادریس بن عبداللہ بن عبداللہ بن الحسن (جو ادریس اکبر کے لقب سے جانے جاتے ہیں) (۱۷۵ھ) وہ ہیں جنھوں نے افریقہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اور جب ان کی حکومت پائدار ہوگئی تو وہ بربر اسلام کی طرف جُوق در جُوق آئے جن کی اکثریت یہودیت یا عیسائیت کی حلقہ بگوش تھی، یہ سب ان کے ہاتھ پر ایمان لائے، ملاحظہ ہوں مغربِ اقصیٰ کی تاریخ کے موضوع پر کتابیں۔

[2] مصنّف "نزہۃ الخواطر" لکھتے ہیں: "(امیر سید علی الشہاب) اسماعیل بن علی بن محمد بن علی بن الحسین السبط (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی نسل سے تھے، ۷۷۳ھ میں (یا ۷۸۰ھ) میں کشمیر آئے اور ان کے ہاتھوں پر وہاں کی اکثر آبادی اسلام میں داخل ہوئی" (ج ۲ ص ۸۵) یہ بات بھی تاریخی لحاظ سے ثابت شدہ ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کے تمدن و تہذیب اور اسلامی آداب و فنون کا رواج انھیں کی آمد کے بعد ہوا، اور بڑے بڑے علماء کے ظہور کا سہرا امیر کبیر سید علی الہمدانی ہی کے سر ہے۔

بڑا حصہ سادات کا ہے، مؤلف "ل، و، س فندرن" اپنی کتاب میں لکھتا ہے :۔

"لام میں کشش کا باعث سادات و اشراف تھے، جن کے ذریعہ جاوہ، وغیرہ کے ہندو سلاطین مشرّف بہ اسلام ہوئے اگرچہ وہاں حضرموت کے عرب بھی آئے تھے، مگر ان کا اس درجہ اثر نہیں تھا، اس صورت حال کا حقیقی سبب یہ تھا کہ یہ حضرات پیغمبرِ اسلام کی اولاد تھے، جن کا لایا ہوا یہ دین ہے"۔

سراواک[1] کی تاریخ میں مذکور ہے کہ سلطان برکات حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی ذرّیت میں سے تھے، حضرموت کے حسینی سادات بحری تجارت کرتے تھے، اور انھوں نے اسی آمد و رفت میں وہاں کے لوگوں میں اسلام پھیلایا۔

ایک علمی مجلس مذاکرہ (سیمینار) منعقدہ انڈونیشیا ۸ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ (۳۰ اپریل ۱۹۶۲ء) کے بحث و مطالعہ کے نتیجہ میں تسلیم کیا گیا کہ حضرموت سے آئے ہوئے سادات نے (جو شافعی المذہب تھے) انڈونیشیا میں اسلام پھیلایا، اسی طرح چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں فلپائن کے جزیروں میں اسلام سادات علویہ کی ایک جماعت کے ذریعہ پھیلا جو وہاں پہنچے تھے، اور وہاں دعوتِ اسلام کا علم بلند کیا، اور اس ملک کو ترقی دینے اور یہاں کے اجتماعی، ثقافتی اور سیاسی اداروں کو پروان چڑھانے میں بڑا حصہ لیا، نیز جزائر القمر سے لے کر جزیرۂ مڈغاسکر، موزنبیق اور وہاں سے ملایا اور سولو تک اسلامی دعوت کو عام کرنے والے یہی حضرات (سادات علویہ) تھے[2]۔

---

[1] جزیرۂ بورنیو (انڈونیشیا) کا ایک شمالی حصہ۔ [2] اس سلسلہ کی جزئی تفصیلات علامہ سید علوی بن طاہر الحداد کی کتاب "المدخل الی تاریخ الاسلام فی الشرق الاقصیٰ" (مطبوعہ عالم المعرفۃ جدہ ۱۴۰۵ھ) میں "ناشرو الاسلام فی الشرق الاقصیٰ" (مشرقِ بعید میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرنے والے حضرات) کے عنوان کے تحت دیکھی جا سکتی ہیں (ص ۱۹۹-۳۰۴)

سادات کرام میں ایک خاصی تعداد ان عظیم المرتبت روحانی مربیوں کی ہے جنھوں نے تزکیۂ نفوس واصلاحِ باطن، بندگانِ خدا کے تعلق مع اللہ اور ان میں فکرِ آخرت پیدا کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور توجہات صرف کردیں، جن کی سعی و توجہ سے خدا کے ہزاروں بندوں کو، تقویٰ، انابت الی اللہ، اور اتباعِ سنّت کی سعادت و توفیق، خواہشاتِ نفسانی کی غلامی سے آزادی اور انانیت وتکبر کے امراض سے رہائی نصیب ہوئی، دعوتِ الی اللہ کے میدان میں ان کے کارہائے نمایاں ہیں، ان کے پاس لوگ دور دور سے آتے تھے، اور ان کو اللہ تعالٰے نے وجاہت اور مقبولیت بھی اس درجہ کی بخشی تھی کہ بعض اوقات شاہانِ وقت اور والیانِ سلطنت کی شوکت وحشمت بھی اس کے سامنے ماند تھی۔

ان بزرگانِ دین میں (جن کے مکمل تذکرے تو الگ رہے، ان سب کے نام بھی اس کتاب میں نہیں آسکتے) ہم خصوصیت کے ساتھ شیخ المشائخ سیدنا عبدالقادر جیلانی[1] (۴۷۰-۵۶۱ھ) کا نام لیں گے جنھوں نے دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس، مردہ دلوں کی مسیحائی اور دلوں کی انگیٹھیوں کو (جو حکومت و دولت اور مادیت وغفلت کے اثر سے سرد پڑ گئی تھیں) دوبارہ گرم کرنے میں ایسے کارنامے انجام دیئے جن کو کرامت ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ان کی تربیت اور ان کے مواعظ سے ایمان کی فصلِ بہار آگئی جس سے مرجھائے دل شاداب ہوگئے، بجھی بجھی سی طبیعتیں اپنے اندر جوش و نشاط محسوس کرنے لگیں، پورے عالمِ اسلام میں نئے سرے سے تازہ ایمان کی ایک طاقتور لہر پیدا ہوئی، سچی روحانیت، صحیح اسلامی کردار واخلاق، اور تسلیم ورضا اور توحید خالص کی ہوائیں چلیں۔

شیخ عمر الکیسانی لکھتے ہیں:-

---

[1] آپ کا شجرۂ نسب دس واسطوں کے ذریعہ سبط اکبر حضرت حسنؓ سے مل جاتا ہے۔

"شیخ عبدالقادرؒ کی کوئی مجلس ایسی نہیں تھی جس میں کوئی نہ کوئی یہودی یا عیسائی مشرّف بہ اسلام نہ ہوا ہو، یا کسی ڈاکو، قاتل، جرائم پیشہ آوارہ شخص اور دوسرے قسم کے فاسقوں نے توبہ نہ کی ہو، یا کسی بدعقیدہ نے اپنے غلط مسلک سے رجوع نہ کیا ہو، آپ کے ہاتھوں پر جن ڈاکوؤں اور رہزنوں نے توبہ کی ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔[1]"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و تربیت یافتہ افریقہ کے دُور دَراز علاقوں میں پھیل گئے جن کے ذریعہ ان علاقوں میں لوگوں نے بکثرت اسلام قبول کیا۔[2]

حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات دینی تعلیم کے عام کرنے، سنّت کی حمایت اور بدعات کے رد میں بھی گرانقدر رہیں۔[3]

برّصغیر کے مُصلحین، مُرشدین و مُجاہدین

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ذریعہ نسبی تعلق رکھنے والے بے شمار اہل اللہ برّصغیر ہند میں بھی ہوئے ہیں، جنھوں نے بندوں کا تعلق

---

[1] قلائد الجواہر ص۲۲ از عمر کیبالی (المطبعۃ العثمانیہ مصر ۱۳۰۳ھ) [2] ملاحظہ ہو پروفیسر آرنلڈ (T.W. ARNOLD.) کی کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING OF ISLAM) باب ۱۱ "اسلام کی افریقہ میں اشاعت" نیز ملاحظہ ہو "حاضر العالم الاسلامی" ج ۲ ص۳۶۷ میں امیر شکیب ارسلان کے حواشی بعنوان "افریقہ میں اسلام"۔ [3] علامہ ابن رجب الحنبلی کہتے ہیں کہ حضرت شیخ جیلانی قدس سرہ عقیدہ اور فروع میں امام احمد بن حنبل اور محدثین سلف کے متبع تھے، اور کلامی مسائل مثل صفاتِ الٰہی اور مسئلۂ تقدیر وغیرہ میں سنت پر سختی سے عامل تھے، اور اس کے مخالفین کا رد سختی سے کرتے تھے

اللہ تعالیٰ سے جوڑا، دلوں کے زنگ دور کئے، نفس و شیطان کے شر سے بچنے کی راہ پر ہزاروں بندگانِ خدا کو لگایا، روحانیت و نورانیت ان کے ذریعہ عام ہوئی، ان بزرگانِ دین کی خدمات، اور ان کے اصلاحی و تربیتی کارناموں کی وسعت ایسی ہے کہ۔ ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

صرف نام بھی شمار کرنا ممکن نہیں، ہم خاصانِ خدا میں سے صرف حضرت خواجہ نظام الدین محمد بن احمد بدایونی دہلوی (مشہور بہ سلطان المشائخ و محبوب الٰہی) اور ان کے خلیفۂ اجل سید نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی (معروف بہ چراغ دہلی) اور ان کے خلیفۂ گرامی قدر سید محمد بن یوسف حسینی گلبرگوی (مشہور بہ خواجہ گیسو دراز) کی طرف اشارہ کریں گے، ان سب حضرات کا نسبی طور پر سادات کرام میں ہونا تسلیم شدہ امر ہے۔[1]

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (محمد بن احمد بدایونی۔ ۶۳۶ھ - ۷۲۵ھ) کے بارے میں علامہ علی بن سلطان القاری المکی (ملا علی قاری) نے اپنی کتاب "الأثمار الجنية في أسماء الحنفية" میں لکھا ہے:

"ان پر (یعنی حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی پر) خلق خدا کو خدا کی طرف بلانے اور بندگی اور عبودیت و عبادت کی راہ پر چلانے اور دنیا کے علائق کی غلامی و بندگی سے چھڑانے اور نفس کو آلائش سے پاک کرنے کا کام ختم تھا، اسی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر علمی تبحّر اور خاصانِ خدا کے اخلاق و کرم کا وصف بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔"

صاحبِ قاموس علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے بھی اپنی کتاب "الألطاف الخفية في أشراف الحنفية" میں ان کا ذکرِ خیر بلند الفاظ میں کیا ہے۔[2]

---

[1] ان بزرگانِ دین کے تذکرے "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" (مؤلفہ مولانا حکیم سید عبد الحی الحسنیؒ) کے جزء دوم و سوم میں پڑھئے۔ [2] نزهة الخواطر ج ۲ ص ۱۶۰-۱۶۴

ان حضرات کے اثرات خانقاہوں کی محدود فضا ہی میں محصور و محدود نہ تھے، عام زندگی، معاشرہ اور بازاروں تک محیط تھے۔

اس عہد کے صاحبِ نظر اور معتبر مؤرخ ضیاء الدین برنی عمومی زندگی پر حضرت خواجہ کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سلطان علاء الدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوّف شیخ الاسلام نظام الدین، شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا، ایک دنیا ان کے انفاسِ متبرکہ سے روشن ہوئی، اور ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا، اور ان کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھالیا، اور ہمیشہ کے لئے پابندِ نماز ہوگئے، اور باطنی طور پر دینی مشغلہ کی طرف رغبت ظاہر کی، اور توبہ صحیح ہوگئی، اور عباداتِ لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہوگیا، اور دنیا کی حرص و محبت جو انسانوں کے فوائد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے، ان مشائخ کے اخلاقِ حمیدہ اور ترک و تجرید کے معاملات کے دیکھنے سے دلوں سے کم ہوگئی، اور سالکوں کو نوافل اور وظائف کی کثرت اوراد و صفات عبودیت کی پابندی سے کشف و کرامات کی آرزو دل میں پیدا ہونے لگی، اور ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہوگئی اور ان کے مکارمِ اخلاق و مجاہدہ و ریاضت کے دیکھنے سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

سلطان علاء الدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہوگیا تھا، خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہدِ علائی کے آخری چند سالوں

میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جُوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلّم کھلاّ مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے، اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔"[1]

شیخ محمود بن یحییٰ اودھی (جو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے نام سے مشہور خاص و عام ہیں) فن سلوک اور عبادت و ریاضت کے بلند مقام پر فائز تھے، سنّت کے بشدّت پابند، خلقِ خدا کو اللہ کی طرف بلانے والے، نفع و افادۂ عام میں مشغول، زُہد و توکّل میں بے نظیر تھے، ۷۵۷ھ میں دہلی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔[2]

یہ مشائخ، حکومتِ وقت، ملک میں اسلام کے مستقبل اور مسلم معاشرہ کی نگرانی اور اگر ضرورت پڑے تو مشورہ و رہنمائی اور اپنے اثر و نفوذ سے کام لینے سے بھی غافل نہیں تھے، نہایت نازک اور مسلم سلطنت و اقتدار اور اسلام کے مستقبل کے لئے ایک فیصلہ کن مرحلہ میں جب کہ حالتِ مسافرت میں ٹھٹہ (سندھ) میں سلطان محمد تغلق کا انتقال ہوا، مسلمان افواج اور انتظامیہ "لاوارث" شکل میں نظر آنے لگا، دریائے سندھ کے دوسری جانب مغل فوج حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑی تھی، اور حکومت کی ذمہ داری کوئی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا، حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کے اصرار اور دعا و سرپرستی کے وعدہ کی بنا پر فیروز تغلق نے حکومت و قیادت کی ذمہ داری قبول کی، اس کی تخت نشینی سے ہندوستان کو جو فیوض و برکات

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۳۴۱ (ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مطبوعہ ۱۸۶۲ء)

[2] نزہتہ الخواطر ج ۲ ص ۱۵۵-۱۵۶

پہونچے اور اس کا دورِ حکومت (جس کی مدت چالیس[۴] سال ہے) امن و امان، جرائم کی کمی، اخلاق کی بہتری اور آسمانی برکات کے نزول کے لحاظ سے جو امتیاز رکھتا ہے، اس میں اسی چراغِ ہدایت کی روشنی اور اس کا فیض شامل تھا[۱]۔

ان بزرگانِ سادات میں گلبرگہ کے حضرت سید محمد بن یوسف (خواجہ گیسو دراز) تھے، جو اپنے وقت کے امامِ طریقت، عالمِ جلیل، فقیہ و زاہد، رہنمائے راہِ سلوک تھے، جن کے ہاتھوں بے شمار کرامتیں ظاہر ہوئیں، ان کا پورا نام و لقب یہ ہے، محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف الامام ابوالفتح صدر الدین محمد دہلوی ثم گلبرگوی، ان کا نسب جو حضرت یحییٰ بن حسین بن زید الشہید علیہ و علیٰ آبائہ السلام پر منتہی ہوتا ہے، ۷۲۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۸۲۵ھ میں وفات پائی، علم روایت میں اہلِ علم ان سے رجوع کرتے تھے، اور اصلاحِ نفس، تزکیۂ باطن اور راہِ حق پر گامزن ہونے کے لئے بندگانِ خدا ان کے فیوض سے مستفید ہوتے تھے، شریعت و طریقت کے جامع تھے، معارف و حقائق کے دریا کے شناور تھے[۲]۔

ان ہی میں علامہ سید اشرف بن ابراہیم حسنی و حسینی تھے، جو سید جہانگیر اشرف کے لقب سے مشہور ہیں، مقام سمنان میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے زیرِ سایہ دولت و تنعم میں شاہانہ انداز میں پروان چڑھے، اپنے وقت کے ممتاز اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اپنے والد کی جگہ پر (جو اس علاقہ میں برسرِ حکومت تھے) تخت نشین ہوئے، حکومت کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتے رہے، اور اس کے ساتھ علمی اشتغال بھی جاری رکھا، شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی اور دوسرے علماء و مشائخ عصر سے اکتسابِ فیض کیا، پھر تختِ

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ فیروز شاہی" از ضیاء الدین برنی ترجمہ از ڈاکٹر سید معین الحق اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۷۵۳-۷۵۶، [۲] نزہتہ الخواطر ج ۳ صفحہ ۱۶۲-۱۶۴

حکومت سے اپنے بھائی محمد کے حق میں دستبردار ہو کر ہندوستان کا قصد فرمایا، اور کچھوچھہ[1] میں قیام پذیر ہوئے اور تربیتِ نفوس، اصلاحِ باطن اور دعوت الی اللہ کے کاموں میں مشغول رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں ہزاروں کو ایمان نصیب کیا۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ بڑے عالمِ دین اور سیاح گزرے ہیں، ان کی تالیفات فقہ، اصول فقہ، علم کلام اور تصوّف میں ہیں، علم کلام اور انساب میں بھی آپ کو اچھا درک تھا، سوانح و تراجم اور تفسیر میں بصیرت رکھتے تھے، ان کا ایک دیوان بھی ہے، ۲۸ محرم ۸۰۸ھ کو وفات پائی۔[2]

اصلاح و تربیت اور تعلیم سلوک و دعوت الی اللہ کی مشغولیت کے ساتھ اس ملک میں (جہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑ چکی تھی) حالات کے تغیّر اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پیش آنے والے خطرات سے بھی غافل نہ تھے۔

جب راجہ کنس نے بنگال پر اپنے تسلّط کا دائرہ وسیع کرنا چاہا اور وہاں کے اسلامی اقتدار کے لئے وہ خطرہ بن گیا اور وہاں کی مسلمان آبادی غلامی اور ہندوانہ اثرات کے خطرہ سے دوچار ہوئی تو سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے سلطان ابراہیم شرقی کو اس خطرہ کی طرف متوجہ کیا، اور بنگال کی طرف عنانِ عزیمت موڑ کر اسلامی اقتدار کی حفاظت کی طرف توجہ دلائی، جس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا، اور وہ علاقہ بدستور مسلمان حکومت و انتظام کے ماتحت رہا، وہاں کی مسلمان آبادی

---

[1] شمالی مغربی ہندوستان کے صوبہ یو پی (اتر پردیش) کا ایک قصبہ (ضلع فیض آباد تحصیل ٹانڈہ)۔

[2] اختصار از "نزہۃ الخواطر" ج ۳

اعتقادی و تہذیبی ارتداد یا انحراف کے خطرہ سے بچ گئی[1]

ان جلیل القدر علم بردارانِ دعوت و عزیمت میں حضرت سید آدم بنوری بھی ہیں (جو نسبا حسینی کاظمی سادات میں ہیں) ان سے لاتعداد خلقِ خدا فیضیاب ہوئی کہا جاتا ہے کہ اُن کے ہاتھ پر چار لاکھ مسلمانوں نے اتباعِ سنّت محمدیہ پر بیعت کی اور ایک لاکھ طالبینِ خدا اُن کے ذریعہ علم و معرفت کے بلند مقام پر پہونچے، کہا جاتا ہے کہ ان کی خانقاہ کسی دن ایک ہزار آدمیوں سے خالی نہیں رہتی تھی، اور سب کا کھانا آپ ہی کے لنگر سے آتا اور سب یکسوئی کے ساتھ روحانی و باطنی استفادہ میں مشغول رہتے، ۱۰۵۲ھ میں آپ لاہور تشریف لے گئے دس ہزار مشائخ اور ہر طبقہ کے علماء و صوفیاء اس سفر میں آپ کے ہم رکاب تھے، اس جمّ غفیر اور رجوع خلائق کو دیکھ کر بادشاہِ وقت شاہجہاں کو فکر لاحق ہو گئی (جو اس وقت لاہور ہی میں تھے) کہ ایسا مرجعِ خلائق شخص سلطنت کے لئے خطرہ بھی بن سکتا ہے، اُن کو (مناسب و مہذّب طریقہ پر) سفرِ حج کا اشارہ کیا، آپ نے حجاز مقدّس کا قصد فرمایا اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی، جہاں ۱۰۵۳ھ میں وفات پائی۔[2]

ساداتِ کرام کی دینی و علمی خدمات کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا جس کی تفصیل طوالت طلب ہے، اور جس کے لئے ایک ضخیم تصنیف درکار ہے، ہم کئی صدیاں پیچھے

---

[1] ملاحظہ ہو مجموعہ مکاتیب سید اشرف جہانگیر مکتوب نمبر ۴۶ صفحہ ۹۸،۹۷ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی صفحہ ۵۶)

[2] اختصار از "نزہۃ الخواطر" ج ۵ ص ۲

چھوڑتے ہوئے اور طویل و وسیع مکانی فاصلوں کو طے کرتے ہوئے اپنے وقت کے عظیم المرتبت مُرشدِ روحانی اور یگانۂ روزگار داعی الی اللہ حضرت سید احمد (بن عرفان) شہیدؒ[1] (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ) کے عطر بیز تذکرہ تک پہونچ جاتے ہیں، جن کو بہت سے علماء اور اہلِ بصیرت و انصاف تیرہویں صدی ہجری کا مجدّد تسلیم کرتے ہیں، جن کی مسیحا نفسی سے اور جن کی جاں فروشانہ مساعی و دعوت سے ایمان کی پُرزور رُوح پرور ہوائیں چلیں، توحید خالص کا مذاق عام ہوا، اور عمل بالسنّۃ کا سکّہ ہندوستان کے اس دور آخر میں جاری و رواں ہوا، جہاد و شوقِ شہادت کا وہ جذبہ بیدار، اور "رخصت" کے بجائے "عزیمت" پر عمل کرنے کا وہ شوق لوگوں کے اندر پیدا ہوا جس نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی، جن کی تربیت و توجّہ سے لوگوں کے اندر دین کے لئے سر فروشی اور جہاد فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اُمنگ، شریعتِ مُطہّرہ کو انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کا عزم و حوصلہ پیدا ہوا، اور خلافتِ راشدہ کے نہج پر آزاد اسلامی حکومت کے قیام اور نظام شرعی جاری کرنے کی ایک زبردست تحریک وجود میں آئی، ملک کو (جو صدیوں سے مسلم حکومتوں کے زیر سایہ رہ چکا تھا) "بیگانگانِ بعید الوطن" اور "تاجرانِ متاع فروش" انگریزوں[2] کے تسلّط اور اثر و نفوذ سے (جو سارے عالم اسلام کے لئے

---

[1] آپ کا نسبی سلسلہ محمد ذی النفس الزکیہ ابن عبداللہ المحض بن حسن المثنیٰ بن الحسن بن علی بن ابی طالب پر منتہی ہوتا ہے، ہندوستان میں اس خاندان کے جدِّ امجد امیر کبیر شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد بن السید رشید الدین احمد ساتویں صدی ہجری میں تشریف لائے، اللہ کے راستہ میں جہاد کیا اور آپ کے ہاتھ بہت سے شہر اور قلعے فتح ہوئے، بالآخر کڑا مانک پور کو اپنی اقامت گاہ بنایا، اللہ نے آپ کی نسل میں برکت عطا فرمائی اور ان میں بکثرت علماء و مصلحین اور مجاہدین فی سبیل اللہ پیدا ہوئے، جن میں سب سے زیادہ مشہور حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

[2] یہ الفاظ خود حضرت سید صاحب کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہیں، جو آپ نے بعض والیانِ ریاست کو ہندوستان کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں لکھا تھا۔

خطرہ بنتا چلا جا رہا تھا) آزاد کرانے کی منظّم سعی اور جد و جہد شروع ہوئی، ان کے رفقاء و متّبعین نے اس مقصد کے لئے جان و مال قربان کرنے کی ایسی مثالیں پیش کیں جن کی نظیر دُور دُور تک نظر نہیں آتی، خود انگریز مؤرخوں نے اس جماعت اور تنظیم کو انگریزی حکومت اور انگریزی نفوذ اور اس کے مستقبل کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور ایک سنجیدہ چیلنج تسلیم کیا[1]، یہ ایمان کی ایک بادِ بہاری اور فصلِ گُل تھی، جس کی ان آخری صدیوں کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی[2]۔

ہندوستان کے مشہور و معروف عالم و مصنّف امیر الملک والاجاہ نواب سید صدّیق حسن خاں قنوّجی، رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے حضرت سید صاحب کے بعض خلفاء کو دیکھا تھا، اور ان کی مساعی کے آثار بھی دیکھے تھے لکھتے ہیں:۔

"خلقِ خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجّہ سے درجۂ ولایت کو پہنچی، آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمینِ ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا، اور کتاب و سنّت کی شاہراہ پر ڈال دیا، ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحبِ کمال سُنا نہیں گیا"

---

[1] ملاحظہ ہو ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" (THE INDIAN MUSULMANS BY W.W. HUNTER) نیز فائل و ذخیرہ موسومہ (THE GREAT WAHABI CASE)

[2] ملاحظہ ہو مصنّف کی عربی کتاب "إذا هبت ريح الإيمان" (طبع بیروت و لکھنؤ) اور اس کا اردو ترجمہ "جب ایمان کی بہار آئی" نیز عربی رسالہ "الامام الذی لم یوف حقہ من الانصاف والاعتراف" (مطبوعہ المجمع الاسلامی العلمی ندوۃ العلماء لکھنؤ والمختار الاسلامی قاھرہ مصر) اور اس کا اردو ترجمہ "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" (مطبوعہ سید احمد شہید اکیڈمی لاہور، و مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اور جو فیوض اس گروہِ حق سے خلقِ خدا کو پہنچے ان کا عُشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہنچا"۔[1]

ہندوستان کے ایک باخبر ثقہ عالمِ دین (جنھوں نے اس جماعتِ قُدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی، اور جن کا زمانہ قریب تھا) مولوی عبدالاحد صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ غیر مسلم مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہوئے"۔[2]

سید صاحبؒ کی دعوت و تربیت اور ان کے خلفاء کی سعی و کوشش سے مجاہدین اور مبلّغین کی جو جماعت تیار ہوئی تھی، اس کے بارے میں اس جماعت کا ایک شدید مخالف سر ولیم ہنٹر (W.W. HUNTER) لکھتا ہے:۔

"اس جماعت کے ایک ایک مبلّغ کے پیرو اسّی اسّی ہزار ہیں، ان میں آپس میں مکمّل مساوات ہے، ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہے، اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں کسی بات سے عذر نہیں ہوتا"۔[3]

ممالکِ عربیہ کے قائدینِ جہاد و جنگ آزادی

عرب ملکوں میں بھی دین کے بلند پایہ داعی، روحانی مُربّی اور تحریکِ جہاد و آزادیِ ملک کے

---

[1] "تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار" مطبع شاہجہانی بھوپال مطبوعہ ۱۲۹۸ھ ص ۱۰۹-۱۱۰

[2] "سوانح احمدی" از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری ص ۹۵ مطبع فاروقی سِن طباعت ۱۳۰۹ھ

[3] "مسلمانانِ ہند" از ڈاکٹر ہنٹر خط نمبر ۵ ص ۱۸۴۳ء۔

متعدد رہنما و قائد پیدا ہوئے جنھوں نے بڑی بڑی مغربی طاقتوں کا محیر العقول شجاعت اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیت کے ساتھ مقابلہ کیا جن کی سعی و قربانی سے یہ ممالک آزاد ہوئے اُن کو بدیسی حکمرانوں سے نجات ملی، ان کی مساعی کے نتیجہ میں آج بھی وہاں آزاد مسلم حکومتیں قائم ہیں۔

ان میں سے صرف دو شخصیتوں کا تذکرہ امیر شکیب ارسلان کے ان حواشی سے نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے امریکی مؤلف (LOTHROP STODDARD) کی کتاب (NEW WORLD OF ISLAM) کے عربی ترجمہ "حاضر العالم الاسلامی" پر لکھے ہیں۔

امیر عبدالقادر الجزائری کے بارے میں امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں:۔

"امیر عبدالقادر کا پورا نام عبدالقادر بن محی الدین حسنی ہے ان کے بزرگ مغرب اقصیٰ کے رہنے والے اور سادات میں سے تھے، ان کی ولادت ۱۲۲۳ھ (مطابق ۱۸۰۸ء) کی ہے، علم و تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی حصولِ علم میں ان کو انہماک رہا، ادب، فقہ، علم کلام اور فلسفہ و حکمت میں کامل دستگاہ حاصل کی، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلحۂ جنگ کی مشق بھی جاری رکھی، اور شہسواری کو بھی نظر انداز نہیں کیا، اگر ایک طرف انھوں نے علوم میں مہارت حاصل کی تو دوسری طرف تیر اندازی اور شہسواری میں بھی ممتاز ہوئے، سیف و قلم دونوں کا حق ادا کیا، ان اسباب کی بنا پر ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی اور ان کے والد کی وفات کے بعد ان کی حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی اور مغرب اوسط (مغرب وسطیٰ) کے تمام علاقوں کے یہ قانونی حاکم تسلیم کئے گئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے حدودِ سلطنت و نفوذ میں وہ علاقے بھی شامل ہو گئے جو پہلے داخل نہیں تھے، یوم المقطع کے موقع پر (۲۶ جون ۱۸۳۵ء) کو فرانسیسی فوج پر فتحیاب ہوئے پھر فرنچ جنرل "لوجو" سے مقابلہ میں اُن کو شکست اٹھانی پڑی،

لیکن پوری ثابت قدمی اور پامردی کے ساتھ وہ مورچہ سنبھالے رہے، فرانس نے بھی "تفنہ" کے معاہدہ کے موقع پر اُن کی شجاعت و دلیری کا اعتراف کیا، اسی معاہدہ کی رُو سے وہران کا پورا صوبہ اور الجزائر صوبہ کا بڑا حصہ اُن کے حدودِ سلطنت میں رہا۔

ان سنگین حالات میں وہ کبھی بھی اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالنے کی فکر سے خالی نہیں رہے، او جنوری ۱۸۳۹ء میں فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، اس روز سے ۱۸۴۳ء تک اس تسلسل کے ساتھ جنگ جاری رہی کہ اس میں کوئی وقفہ جنگ سے خالی نہیں گزرا، اس پورے عرصۂ جنگ میں امیر عبدالقادر نے وہ ثابت قدمی دکھائی جس کی شہرت سارے عالم میں پھیل گئی، مگر چونکہ فریقین کے درمیان طاقت کے معاملہ میں کوئی تناسب نہیں تھا، اس لئے دشمن الجزائر کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے اور امیر عبدالقادر الجزائری کے ہمنواؤں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، اور بالآخر فرانسیسیوں کے قدم الجزائر میں جم گئے، اس وقت امیر عبدالقادر مغرب (مراکش) میں پناہ گزیں ہو گئے، الجزائر کے علاقہ میں جہاں فرنچ قابض تھے، امیر نے پھر ایک بار حملہ کیا تھا، اور بلادِ بربر تک پہنچ گئے تھے، مگر فرنچ اپنی طاقت بہت مضبوط کر چکے تھے، اس لئے ان کو کامیابی نہیں حاصل ہو سکی، اور وہ بالآخر شام ہجرت کر کے چلے گئے اور اپنی بقیہ عمر دمشق میں گزاری، جہاں وہ علماء کی صحبت میں بیٹھنے لوگوں کی امداد و اعانت، لوگوں کے ساتھ سلوک و احسان کے کاموں میں مشغول رہتے، وہ اخلاق کریمانہ، علم و تقویٰ میں آپ اپنی مثال تھے ۱۸۸۳ء میں وفات پائی اور دمشق کے محلہ "الصالحیۃ" میں مدفون ہوئے رحمۃ اللہ علیہ[1]

امیر شکیب ارسلان، سیدی احمد الشریف السنوسی (معروف بہ شیخ سنوسی) کے بارہ میں

---

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد دوم حاشیہ امیر شکیب ارسلان ص ۱۶۸-۱۷۲

لکھتے ہیں، جو حسنی سادات میں سے تھے، اسی لئے الشریف اُن کے نام کا جزء بن گیا ہے :-

"میں نے سیّدی احمد الشریف السنّوسی کی شخصیت میں ایک ایسے انسان کو دیکھا جو ایک وسیع النظر عالم، عظیم المرتبت استاد و مُربّی، اور باوقار و باعظمت شخصیت کا مالک تھا، میں نے اپنی پوری زندگی میں ان سے زیادہ شریف و باعظمت آدمی نہیں دیکھا، شاہانہ انداز کا رکھ رکھاؤ، خوشحال معاشرت، بیدار مغزی، دلنوازی، سیر چشمی، اعلیٰ درجہ کی ذہانت، معاملہ فہمی، اور اصابتِ رائے ان کی خصوصیات میں سے تھی، حافظہ نہایت قوی، رُعب اور وقار کا یہ عالم کہ اُن کی خوش گفتاری اور دلجوئی کے انداز کے باوجود لوگ ان کے احترام پر مجبور رہتے۔

میں نے ان میں صبر اور قوتِ برداشت کی ایسی طاقت دیکھی جو معاصرین میں کمتر نظر آئی، قوتِ ارادی غیر معمولی حد تک بڑھی ہوئی، چہرہ پر بھرپور نورانیت، اگر وہ اپنے تقویٰ کے لحاظ سے "ابدال" میں تھے تو شجاعت و بے جگری میں "ابطال" (بہادروں) میں، جنگِ طرابلس کے موقع پر (جیسا کہ میں نے سنا ہے) معرکوں میں بنفسِ نفیس شرکت فرماتے اور گھوڑے کی پیٹھ پر مسلسل دسیوں گھنٹے گزارا کرتے تھے، اس میں اُن کو کوئی تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا، اپنے آپ کو خطرات میں ڈالتے اور دشمنوں کے غول میں گھس کر وہاں تک پہونچ جاتے جہاں تک فوجی سپہ سالاروں کا ۔۔۔ رہ ہو تاکہ اس خط سے پیچھے رہنا چاہیئے تاکہ اگر شکست ہو جائے تو دشمنوں کے ہاتھ سے محفوظ رہیں[1]"۔

---

[1] حاضر العالم الاسلامی" جلد دوم حاشیہ امیر شکیب ارسلان صفحہ ۱۵۹-۱۶۰، نیز سنّوسی تحریک پر لکھی ۔۔دئی عربی میں کتابیں اور شیخ سنّوسی کے تعارف اور کارناموں پر تحقیقی مقالات ورسائل ملاحظہ ہوں۔

فرقۂ اثنا عشریہ (امامیہ) کا عقیدۂ امامت

فرقۂ اثنا عشریہ کا عقیدۂ امامت، اِس (امامت) کے اپنانے کے
نفسیاتی محرکات، قدیم ایران اور اس کے عقائد کا عکس،

فرقۂ اثنا عشریہ کا عقیدۂ امامت

گزشتہ صفحات سے یہ بات آفتاب کی طرح روشن ہوگئی کہ بزرگانِ اہلِ بیت، اسلام کے صاف ستھرے عقیدہ پر سختی سے کاربند تھے، یہ وہ عقیدہ تھا، جو انھیں اپنے نبی اور جدِّ امجد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ملا تھا، یعنی توحیدِ خالص اور ختم نبوت کا واضح اور بے میل عقیدہ، امت کے سوادِ اعظم اور اہلِ سنت کے اجماعی عقیدہ کے مطابق اُن کا اس پر ایمان تھا کہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے، دین تکمیل پا چکا، اور اسی دین سے دنیا کی سعادت اور آخرت کی نجات مربوط ہے، اور یہی وہ دین کامل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج میں تمھارے لئے تمھارا دین کمل
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ	تم پر اپنی نعمت تمام، اور تمھارے
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ	لئے اسلام کو بطور دین منتخب
(سورۃ المائدہ - ۳)	و پسند کر چکا۔

اس کے بعد نہ کوئی نبوت آئے گی، اور نہ جدید طریقہ پر شرایعت سازی کا کام ہوگا، دین میں نہ کمی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی اجازت، یہی وہ عقیدہ تھا جس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے لے کر وہ سب حضرات سختی سے قائم رہے، جن کے حالات تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، اور وہ کسی حیثیت سے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

سفیان مطرف سے اور وہ شعبی سے اور شعبی ابو جُحَیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آیا آپ کو قرآن کے علاوہ بھی کوئی آیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے براہ راست ملی ہے (جس کا علم دوسروں کو نہ ہو؟)[1] تو فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس نے تخم میں شگاف ڈالا، اور جس نے ذی روح کو پیدا کیا، میرے پاس کچھ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ اللہ نے وہ سمجھ دی ہے، جو قرآن فہمی کے لئے اللہ تعالے کسی کو بخشتا ہے، یا وہ جو میرے صحیفہ میں ہے" دریافت کیا آپ کے صحیفہ میں کیا ہے؟ جواب دیا "مسلمان کی دیت[2]، قیدیوں کی رہائی، اور یہ کہ کافر کے عوض مسلمان نہ قتل کیا جائے[3]"۔

اس عقیدۂ (امامت) کو اپنانے کے نفسیاتی محرکات

سطور بالا سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گیا کہ اہلِ بیت کرام، اُمّت کے اجماعی عقیدہ اور مسلک پر پوری شدّت سے قائم اور اس کے داعی تھے، وہ اپنے تئیں

---

[1] اس سوال کی ضرورت اس لئے پڑی کہ چند لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ سے بہت سی باتیں وہ کہی گئی تھیں جو بطور وصیت اور راز کے ان کے سینہ میں پنہاں تھیں۔

[2] مقتول مسلمان کی دیت (معاوضہ میں) کتنے اونٹ دیئے جائیں اور اس کے ورثہ کو کس طرح اس کا تاوان ادا کیا جائے [3] مسند علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) مسند الامام احمد بن حنبل۔

کتاب و سنّت کی پیروی کا پابند اور اُمّت محمدیہ کا ایک فرد باور کرتے تھے، جو صرف اپنے عمل و تقویٰ اور علم و اخلاق سے امتیاز و احترام کا مستحق ہو سکتا تھا (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ) لیکن بعد میں وہ مزاج اُبھر آیا جس کی تہ میں جاہلیت قدیمہ اور ادیانِ محرّفہ کی روح کام کر رہی تھی، اور جس میں ان تمدّنوں اور فلسفوں کا اثر تھا، جو عہدِ قدیم میں یونان، ایران اور ہندوستان اور چین میں پروان چڑھے اور نقطۂ عروج پر پہونچے، مزاج اور انداز فکر یہ تھا کہ حکمراں خاندان اور ان خاندانوں کے، جن کو عہدِ قدیم سے روحانی یا مذہبی قیادت حاصل رہی ہے، اور جنھوں نے سخت ریاضتوں اور بڑے مجاہدوں اور کسی درجہ میں عام سطح سے بلند ہو کر اپنی اخلاقی و روحانی حیثیت تسلیم کرائی ہے، افراد کو معصوم سمجھا جائے، اور ان کے اس حق اور اختیار کو آنکھ بند کر کے تسلیم کیا جائے کہ وہ مذہبی قوانین کو تبدیل کر سکتے، اور توڑ سکتے ہیں اور ان کو قانون سازی کا آزادانہ اور مکمّل اختیار ہے[1]۔

اس نظریہ کی قبولیت و اشاعت میں کچھ نفسیاتی خواہشات اور اندرونی ترغیبات بھی معاون ثابت ہوئی ہیں:۔

۱۔ اس کے ذریعہ انفرادی طور پر ذمہ داری اور جواب دہی کے جھگڑوں سے نجات ملتی ہے، اور ہر معاملہ میں ایک خاص طبقہ یا کسی مخصوص خاندان کے فرد یا افراد پر اعتماد کرنا کافی ہوتا ہے، جو اس خانوادے کی نمائندگی کرتے ہوں۔

۲۔ اعتماد، احترام اور مکمل انقیاد و اطاعت کسی مخصوص خاندان یا اس کے بعض افراد سے وابستہ ہو جاتی ہے، اور یہ کام ایک کامل و وسیع شریعت کے اتباع سے

---

[1] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA. P. 194, VOL. 9 (1985)

آسان معلوم ہوتا ہے جس میں قدم قدم پر پابندیاں اور احکام ہیں، علماء کے اجتہادات بھی ہیں، اور ایک وسیع فقہی ذخیرہ بھی ہے۔

۳۔ کسی ایک خاندان یا اس کے فرد واحد یا چند افراد کا استحصال آسان ہے، اور اس کو راضی رکھ کر سیادت وقیادت حاصل ہو سکتی ہے، انفرادی خواہشات نفس کو پورا کرنے کا بہتر موقع ملتا ہے، بہت سی مشکلات سے نجات مل جاتی ہے، اور معمولی سی کوشش سے ان کا تقرب حاصل کر کے برسوں کی جدوجہد اور طول طویل مسافت طے کرنے کے بعد جو مل سکتا ہے، وہ آسانی سے اور جلد مل جاتا ہے، کیونکہ عوام کے ذہن میں اس خانوادے کے معصوم ہونے کا عقیدہ راسخ ہوتا ہے، اور ہر زمانہ میں چالاک اور شاطر قسم کے سیاسی ذہن رکھنے والوں نے اپنی ترقی کے لئے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

اثنا عشری فرقہ میں اس عقیدہ (نسلی وموروثی تقدس ومنصب امامت) کی پرورش نے سیاسی، خاندانی اور ذاتی مقاصد کی (سہولت کے ساتھ تکمیل میں) مدد کی اس کو ایک مذہبی عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا گیا اور تقدس کے پردے ان پر پڑے رہے۔

اس فرقہ نے یہ باور کر لیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء اور ائمہؑ کا تعیّن اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، وہ پیغمبروں کی طرح معصوم ہیں، اور ان کی اطاعت سب مسلمانوں پر فرض ہے، ان کا درجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجہ کے مساوی ہے، اور دوسرے انبیائے کرام سے بڑھ کر ہے، خلقِ خدا پر اللہ کی حجت بغیر امام کے نافذ نہیں ہو سکتی، اور امام کو جب تک جانا نہ جائے حجتِ خداوندی تمام نہیں ہو سکتی، دنیا بغیر امام کے قائم نہیں رہ سکتی، امام کی معرفت ایمان کے لئے شرط ہے، اور امام کی اطاعت انبیاء کی اطاعت کی طرح ہے، ائمہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی امر حلال کو

حرام قرار دیں یا حرام اشیاء کو حلال کر دیں، کیونکہ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم ہیں، اور ائمۂ معصومین پر ایمان لانے والا جنتی ہے، خواہ وہ ظالم و فاسق اور فاجر ہو، ائمہ کا درجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مساوی اور تمام مخلوقات سے بلند ہے، ان ائمہ پر مخلوق کے اعمال رات اور دن دونوں وقت پیش کئے جاتے ہیں، اور فرشتے ائمہ کے حضور رات دن آیا کرتے ہیں، ان کو ہر شب جمعہ کو معراج حاصل ہوتی ہے، لیلۃ القدر میں ہر سال ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب نازل ہوتی ہے، موت و حیات ان کے دستِ قدرت میں ہے، اور وہ دنیا و آخرت کے مالک ہیں، جس کو چاہیں دیں اور جو چاہیں دیں۔[1]

"کتاب الکافی" میں یہ بھی مذکور ہے :-

"حسن بن عباس المعروفی نے امام علی رضا کو لکھا : میں آپ پر فدا ہوں بتایئے کہ رسول و نبی اور امام کے درمیان کیا فرق ہے؟ انھوں نے لکھا یا جواب دیا: رسول، نبی اور امام کے درمیان یہ فرق ہے کہ رسول وہ ہے جس کے پاس جبرئیل آتے ہیں وہ ان کو دیکھتا ہے، اور ان کی بات سنتا ہے، اور ان پر وہ وحی لاتے ہیں اور کبھی اُن کو خواب میں دیکھتا ہے، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا تھا، اور نبی بسا اوقات بات سنتا ہے اور کبھی دیکھ بھی لیتا ہے، اور امام وہ شخص ہے جو فرشتہ کی بات سنتا ہے مگر اس کو دیکھتا نہیں ہے۔"[2]

علّامہ ابن خلدون نے مؤرخانہ دیانتداری کے ساتھ علمی طور پر جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے :-

"شیعوں کے نزدیک "امامت" ان عوامی ضروریات میں سے نہیں ہے جس کی

---

[1] ماخوذ از کتاب اصول الکافی ص۱۰۳-۲۵۹، اور شرح اصول الکافی للکلینی (م ۳۲۸ھ) ج ۲ ص۲۲۹، [2] کتاب اصول الکافی ص۸۲ طبع ایران ۱۲۸۱ھ۔

ذمہ داری اُمّت کی بصیرت کے سپرد کی جاتی ہے، اور صاحبِ اختیار (امام) مسلمانوں کا اختیار کردہ شخص ہوتا ہے، بلکہ امامت ان کے یہاں دین کا ایک رکن اور اسلام کا ایک ستون ہے، کوئی پیغمبر نہ اس سے غفلت برت سکتا ہے، اور نہ اس کو قوم کے سپرد کر سکتا ہے، بلکہ پیغمبر کا فرض ہے کہ اُمت کے لئے امام متعیّن کردے اور وہ امام ہر قسم کے گناہ صغائر و کبائر سے معصوم ہوگا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی وہ شخص ہیں، جن کو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (ان نصوص کی روشنی میں جن کو وہ روایت کرتے ہیں، اور اپنے عقیدہ کے مطابق ڈھالتے ہیں) متعیّن کر دیا تھا"[1]

علاّمہ ابن خلدون کہتے ہیں :۔

" ان میں کچھ ایسے گروہ ہیں جن کو غلو پسند کہا جاتا ہے وہ لوگ ان ائمہ کی اُلوہیت ثابت کرنے کے لئے ایمان وعقل سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ ائمہ تھے تو بشر ہی مگر اُلوہیت کی صفات کے حامل تھے، یا خدا ان کے اندر لباسِ بشریت میں حلول کر گیا ہے، یہ "عقیدۂ حلول" دراصل نصرانیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں عقیدہ ہے، حضرت علیؓ نے اس طرح کا عقیدہ رکھنے والوں کو آگ میں جلا دیا تھا حضرت محمد بن الحنفیہ کو جب مختار بن عبید کے بارے میں اس طرح کے عقائد کی خبر ملی تو انھوں نے صاف الفاظ میں اس پر لعنت بھیجی اور اس سے اپنے بری ہونے کا اعلان کیا حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بھی اس طرح کی بات کرنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ص۱۵۵ طبع مصر۔ دار الفکر

انہی طبقوں میں وہ لوگ بھی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ امام کے اندر جو کمال ہے وہ دوسروں میں نہیں آسکتا، لہذا جب ایک امام فوت ہوگا تو یہ "کمال" دوسرے امام کے اندر منتقل ہو جائے گا، اسی کو تناسخ کہتے ہیں[1]"۔

یہ عقیدہ فرقۂ اثنا عشریہ میں نسلاً بعد نسلٍ تسلسل کے ساتھ قائم رہا اور اب تک یہی عقیدہ ہے، کیونکہ یہ بنیادی عقائد میں داخل ہے، اور یہی عقیدہ عصر حاضر میں امام خمینی تک پہونچا ہے، موصوف اپنی کتاب "الحکومۃ الإسلامیۃ" میں ولایتِ تکوینی کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں جس کا ہم بعینہٖ ترجمہ پیش کرتے ہیں:۔

"اماموں کو مقامِ محمود، درجۂ بلند اور وہ خلافتِ تکوینی حاصل ہے جس کی ولایت وسطوت کے تابع کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہے، ہمارے مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے کہ ہمارے ائمہ کا وہ مقام ہے جس کو کوئی مقرب فرشتہ یا نبی مُرسل بھی پہونچ نہیں سکتا، ہمارے یہاں جو روایات اور احادیث ہیں ان کی رُو سے رسول اعظم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وائمہ علیہم السلام اس عالم کے وجود سے پہلے انوار تھے، جو عرشِ خداوندی کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے، اللہ نے ان کو منزلت اور تقرّب کا وہ درجہ دیا ہے جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں[2]"۔

اس عقیدہ سے معاشرۂ انسانی اور مذہبی حلقہ پر کیا غلط اثرات مُرتّب ہوتے ہیں، اس کو غیر مسلم دانشوروں نے بھی محسوس کیا، اور ان کی نشان دہی کی ہے،

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ج ۲ ص ۵۹۰ تحقیق ڈاکٹر عبدالواحد وافی دار نہضۃ مصر للطبع والنشر، الفجالہ، القاہرہ۔

[2] "الحکومۃ الاسلامیۃ" ص ۵۲ (مطبوعہ مکتبۂ بزرگ اسلامیہ طہران۔ ایران)

پیٹرک ہوگس (PATRICK HUGES) کہتا ہے :۔

"شیعہ' اماموں کو اللہ کی صفات کا حامل بناتے ہیں"[۱]

اور ایوانو (IVANOW) لکھتا ہے :۔

"ہمیشہ کے لئے امامت کے تسلسل کا عقیدہ نبوت کو ایک ضمنی مقام عطا کرتا ہے"[۲]

قدیم ایران اور اس کے عقائد کا عکس

دراصل امامت کا نازک عقیدہ جس کے حدود و مسافات بڑے خاندانوں اور گھرانوں کو تقدس اور اُلوہیت کے حدود سے ملاتے ہیں' اُن پر قدیم ایران کے عقائد کی چھاپ ہے' قدیم ایران میں سیادت' دینی قیادت اور حکومت قبیلہ "میدیا" کو حاصل تھی' پھر یہ سربراہی قبیلہ "المغان" کو اس وقت حاصل ہوئی جب مذہب زردشت غالب آیا، اور ایران پر اس کا اثر قائم ہوا، اہلِ ایران کے یہاں ایک اونچی ذات مذہب کے داعیوں کی تھی جس کو کہنوت' (PRIESTLY CLASS) کہا جاتا تھا، ان کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ زمین پر ظلِ الٰہی ہیں' اور تمام لوگ اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان خداوندوں کی خدمت کریں' حکمراں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اسی قبیلہ کا فرد ہو، کیونکہ خدا ان کے اندر حلول کر گیا ہے' اور جسم کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے اور آتش کدہ کی سربراہی اور اس کی تنظیم صرف اسی قبیلہ کا حق ہے[۳]۔

---

۱ THOMAS PATRICK HUGES, DICTIONARY OF ISLAM, LONDON-1885, P. 574

۲ H. A. R. GIBB & J. H., KRAONER : SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM, LITT. 1953, P. 248

۳ ملاحظہ ہو "تاریخ الدیانۃ الزردشتیۃ" نیز ایرانِ قدیم کی تاریخ و مذاہب پر دوسری کتابیں۔

مسٹر ڈوزی (DOZY) لکھتے ہیں :۔

"اہلِ ایران بادشاہِ وقت کو خدا کا ہم پلّہ سمجھتے تھے اور بادشاہ کے اہلِ خاندان کو بھی اسی نظر سے دیکھا کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ امام کی اطاعت فرض ہے، اور اس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے[1]"۔

کسی ایک خاندان پر اس درجہ انحصار اور اس خاندان کی دینی روحانی اور سیاسی اجارہ داری نے قدیم مذاہب کے پیرووں کو (جن میں اصلاحی تحریکیں بھی اٹھیں) بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں مبتلا کر دیا، اور وہ خدا پرستی کے بجائے انسان پرستی اور خاندان پرستی کے شکار ہو گئے، اس کے نتیجہ میں انسانوں کی ذہنی صلاحیتیں، قوتِ تمیز اور فکر و نقد کی آزادی (جو فکری علمی، اخلاقی اصلاحات و انقلابات کا سرچشمہ ہے) تعطّل و جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔

بسا اوقات اس کے ذریعہ انسانی توانائیوں اور کسبِ معیشت کے ذرائع کا بُری طرح استحصال کیا گیا ہے، قرونِ وسطیٰ میں نوبت یہاں تک پہونچی کہ مغفرت کے پروانے (تذاکر الغفران) اور جنّت کے اجازت نامے بھی فروخت کئے جانے لگے[2]، اور اس اندھی عقیدتمندی کی وجہ سے کلیسا اور علم کے درمیان خونریز کشمکش اور جنگ بھی ہوئی[3]، اس صورتِ حال نے یورپ کو تفریقِ دین و سیاست کے نظریہ کے اختیار کرنے

---

[1] منقول از فجر الاسلام ص۲۷۷، [2] بیان کیا جاتا ہے کہ ایران و عراق کی جنگ میں امام خمینی نے بھی محاذ جنگ پر جانے والوں کو اس طرح کے پروانے دیئے ہیں۔

[3] اس خونریز کشمکش کی تفصیل کے لئے ڈراپر امریکی کی شہرۂ آفاق کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE, BY DRAPPER کا مطالعہ مفید ہوگا

اور بالآخر الحاد تک پہنچا دیا، نامذہبی (سکولر) حکومت سے قطع نظر یہ متعدد مسلم ممالک میں بھی (بطورِ علاج) اختیار کیا جا رہا ہے، جن کی ان ممالک میں نہ ضرورت تھی نہ جواز، اس سے ان حکومتوں اور ان دینی جماعتوں اور سادہ دل و دین دوست عوام کے درمیان جو ملک میں اسلامی احکام کا نفاذ چاہتے ہیں، ایک کشمکش پیدا ہوگئی ہے، اور ان ممالک کی قوتیں اور ان کے وسائل بے جگہ اور اصل حریف طاقتوں کو چھوڑ کر اندرونی وباہمی کشمکش میں ضائع ہو رہے ہیں۔

اس طرح کا مُطلق العنان اقتدار جو نبوّت کے متوازی امامت سے پیدا ہوتا ہے، اور جس کو اختیار ہوتا ہے کہ احکامِ شریعت خود تصنیف کرے اور نصوص قطعیہ سے ثابت احکام کو منسوخ کر سکے، اس کو بے چوں وچرا تسلیم کرنے کے نتائج یہاں تک دنیا کے سامنے آئے کہ ایسا دینی اقتدارِ مطلق، جس دینی رکن، جس شرعی حکم، اور جس اسلامی فریضہ کو چاہے جماعتی اور سیاسی مصلحت کی بنا پر مامور من اللہ اور معصوم امام مجتہد کے اجتہاد کی بنا پر کالعدم قرار دے سکتا ہے۔

اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ حال ہی میں "کیہان" (لندن) نے اپنے شمارہ ۸۲، مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ میں حجۃ الاسلام سیّد علی خامنائی کے نام امام خمینی کے پیغام کو بڑی سرخی میں شائع کیا ہے کہ:۔

"حکومت مساجد کو معطّل یا منہدم کر سکتی ہے، اور حکومت نماز روزہ پر مقدم ہے"۔

اس میں مزید کہا گیا ہے کہ:۔

"حکومت براہِ راست ولایت رسول اللہ کی شاخ اور دین کے بنیادی واوّلین احکام میں سے ہے، اس کو تمام فرعی احکام پر ترجیح حاصل ہے،

یہاں تک کہ نماز روزہ اور حج پر بھی وہ مقدّم ہے' والیِ حکومت کے لئے
ضرورت کے وقت مساجد کو معطّل کرنا بھی جائز ہے' اور اس کے لئے یہ بھی
روا ہے کہ کسی مسجد کو سرے سے منہدم کردے اور وہ اسلامی احکام جو اس وقت
اسلام کے مفاد کے مخالف (نظر آتے) ہوں' خواہ عبادات میں ہوں یا ان کے
علاوہ سب کو کالعدم کر سکتی ہے' اور اگر مملکتِ اسلامی کے مفاد کا تقاضا
ہو تو یہ حکومت حج کو بھی معطّل کر سکتی ہے' جو کہ اسلام کے اہم ترین فرائض میں
ایک فریضہ ہے' کیونکہ یہ حکومت بجائے خود ایک آزاد ولایتِ الٰہی ہے[1]"۔

اور یہ معلوم ہے کہ یہ عمل یعنی احکامِ شریعت میں آزادانہ تصرّف' کسی منصوص حکم شرعی کا منسوخ کرنا یا معطّل کر دینا اور وہ بھی ایک فرد کے اجتہاد یا سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر' دین کے لئے (جو ہمیشہ رہنے والا ہے' اور ہمیشہ کے لئے آیا ہے) ایک مستقل خطرہ ہے' اور یہ دین میں آزادانہ مداخلت' پوری مسلمان قوم اور مکمل اسلامی ملک کے لئے اسلام سے کنارہ کشی اور محرومی (یا اجتماعی عملی ارتداد) تک پہونچا سکتا ہے' اور اس حکومت کی کورانہ اطاعت پورے دین کو معطّل و بے اثر کر سکتی ہے' اور اس کو ایسے حالات سے دوچار کر سکتی ہے' جن سے نجات حاصل کرنا دشوار ہو جائے' اس کی ایک مثال ایران و عراق اور خلیجی ممالک کے درمیان وہ بے مقصد طویل جنگ ہے' جس نے دونوں محاذوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے' اور ان کو تباہی کے کنارے پہنچا کر ایک محاذ کے شدید نقصانات اور ملک کی تباہی اندرونی انتشار و بے چینی کے خطرہ کی بنا پر' اور کچھ بڑی طاقتوں کی مداخلت کی وجہ سے بڑی مشکل سے ماہ اگست ۱۹۸۸ء میں ختم ہوئی۔

---

[1] اخبار "کیہان" شمارہ ۱۸۲ مؤرخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ۔

یہ امامتِ مُطلقہ جو کورانہ اطاعت کی طالب ہے، ایک استبدادی حاکم (مُطلق العنان ڈکٹیٹر) کا رُول ادا کرتی ہے، جس سے روئے زمین پر فساد پھیل سکتا ہے، اور جس سے نسلِ انسانی، زراعت و تجارت، امن و امان سب خطرہ میں پڑ سکتے ہیں، مُطلق العِنان حکومتوں کے دور میں ایسے تجربات پہلے زمانوں میں بھی ہوئے ہیں، اور جب اس طرزِ استبداد میں دینی رنگ اور تقدیس کی آمیزش بھی ہو اور معصومیت کا عقیدہ بھی شامل ہو، اور اس کو مامور من اللہ، نبی کا قائم مقام گردانا جا رہا ہو تو پھر اس کی ہلاکت خیزی کہیں سے کہیں پہونچ سکتی ہے، اور وہ پورے ملک، یا پوری قوم یا کم سے کم ایک فرقہ کے لئے اجتماعی خودکشی و خودسوزی کے مرادف و مساوی ہو سکتی ہے، جس سے نجات پانا آسان نہیں۔

اس کے علاوہ (اس عقیدۂ تقدّس و عظمت کے نتیجہ میں) بے عمل، بیکار و کاہل انسانوں اور بے فکروں کی ایسی جماعتیں وجود میں آتی ہیں، جو قوم کی ثروت سے کھیلتی ہیں، اور قوم کی وہ دولت جو اس کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور پُر مشقّت محنتوں کا نتیجہ ہے، اس طبقہ کے عیش و عشرت میں ضائع ہوتی ہے، بے کاری بڑھتی ہے، دینی و علمی طبقوں میں کھنونتی، پاپائی یا امام معصوم و مُطاع کے بھیس میں قرونِ وسطیٰ کا بے رحم جاگیردارانہ نظام وجود میں آتا ہے، محنت و عرق ریزی، مشغولیت و قابلیت کے نتائج و فوائد سے صرف چند خاندان فائدہ اٹھاتے ہیں، اور عوام کے حقوق پامال ہوتے ہیں، اور وہ طبقہ سامنے آتا ہے، جو اپنی معیشت کے لئے اور اپنی اولاد کی پرورش کے لئے انگلی ہلانا بھی ضروری نہیں سمجھتا وہ اپنے پسینہ کا ایک قطرہ بہائے بغیر محنت کش طبقہ کی ثروت پر دادِ عیش دیتا ہے، اللہ تعالےٰ نے سچ فرمایا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۔	مومنو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ، لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور ان کو راہِ خدا سے روکتے ہیں۔

(سورۂ توبہ ۔ ۳۴)

اس وقت یہ حقیقت زیادہ روشن ہو کر سامنے آ گئی ہے' آیت اللہ الخمینی صاحب کی زندگی میں اہلِ ایران شیعہ اور ان کے ہمنواؤں نے ان کو جو "لباسِ تقدّس" پہنایا اور ان کی تقدیس و تعظیم میں جس جوش و غلو کا مظاہرہ کیا وہ شریعت کے مقرر کردہ حدود سے باہر کی چیز ہے' اور اس دینِ توحید کے مزاج کے خلاف ہے جو وضاحت سے اعلان کرتا ہے:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم	کسی آدمی کو شایانِ شان نہیں کہ خدا تو اس کو کتاب اور حکمت اور نبوّت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، بلکہ اس کو (یہ کہنا سزاوار ہے کہ اے اہل کتاب تم علمائے) ربّانی ہو جاؤ، کیونکہ تم کتابِ (خدا) پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو، اور اس کو یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بنا لو' بھلا جب تم

مُسْلِمُوْنَ ○ مسلمان ہو چکے تو کیا اسے زیبا ہے کہ
(سورۂ آل عمران۔ ۷۹۔ ۸۰) تم کو کافر ہونے کو کہے۔[1]

اخباروں اور بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں کی رپورٹ ہے کہ جب آیت اللہ خمینی صاحب نے ۳ ؍ جون ۱۹۸۹ء کو شہر تہران میں وفات پائی تو حکومت کے انتظامیہ نے ان کی نعش کو جنّتِ زہراء نامی مقبرۃ تک موٹر کے ذریعہ لے جانے کا انتظام کیا، لیکن لوگ بے تحاشہ نعش پر ٹوٹ پڑے اور یہ ناممکن ہو گیا کہ میّت کو موٹر کے ذریعہ قبرستان لے جایا جا سکے، لہذا ہیلی کاپٹر کے ذریعہ لاش مقبرۃ تک پہنچائی گئی، وہاں لوگوں کے مذہبی جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ لاکھوں کا مجمع یکبارگی لاش پر ٹوٹ پڑا اور کفن کی دھجی دھجی تبرّک بن گئی، یہاں تک کہ میّت برہنہ ہو گئی، بار بار کے اعلانات دھمکیوں اور فائرنگ کے باوجود بھی لوگ نہیں مانے، برہنہ لاش نیچے گر پڑی اور سرکاری ذمّہ داروں کو تدفین دوسرے وقت تک کے لئے ملتوی کرنا پڑی اور کئی گھنٹوں کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

تازہ خبر یہ ہے کہ حکومتِ ایران نے ان کا ایسا مقبرہ بنانے کا ارادہ کیا ہے جو دنیا کی تمام یادگاروں سے بڑھ کر ہو گا، اور اس کا نقشہ کعبہ مشرّفہ اور امام علی رضا کے مشہد کا ہو گا، ظاہر ہے اس پر کروڑہا کروڑ کی رقم خرچ ہو گی، کہا جاتا ہے کہ وہ تاج محل آگرہ جیسی دنیا کی حسین ترین عمارت ہو گی۔

یہ سب اس عقیدہ کا مظہر ہے، جس نے امامت کو اُلوہیت کا تقدّس دے رکھا ہے اور معصومیت و عظمت کا وہ خلعت پہنایا ہے جو انسان کے لئے روا نہیں ہے،

---

[1] ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری۔

ان کو بشریت و عبدیت کے درجہ سے اٹھا کر "ما فوق البشر" کی اس منزل و مقام پر پہنچا دیا ہے، جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

صحیح ترین روایات احادیث اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ اپنے لئے کسی امتیاز کو پسند نہیں فرماتے تھے، اور نہ آپؐ کو یہ پسند تھا کہ لوگ آپ کی مدح میں وہ غلو کریں، جو پچھلی اُمتوں کے افراد اپنے انبیاء کے حق میں روا رکھتے تھے، اور آپؐ کو عبدیت و رسالت کے مرتبہ سے بلند تر وجود تسلیم کریں۔

حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں :۔

"ہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے زیادہ کوئی بھی محبوب نہ تھا، مگر ہم آپؐ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ بات آپؐ کو پسند نہیں ہے[1]"۔

"کسی نے آپؐ کو "یا خیر البریۃ" (مخلوقات میں افضل ترین فرد) کہکر مخاطب کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے[2]"۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

---

[1] روایت ترمذی باب "ما جاء فی کراھیۃ قیام الرجل للرجل" امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں بھی روایت کیا ہے۔ ج ۳ ص ۱۳۲

[2] صحیح مسلم کتاب الفضائل (باب من فضل ابراھیم الخلیل صلے اللہ علیہ وسلم۔)

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم فإنما أنا عبدٌ فقولوا عبد اللہ ورسولہ۔[1]	تم لوگ میری مبالغہ آمیز تعریفیں نہ کیا کرو جس طرح نصاریٰ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی مدح خوانی مبالغہ کے ساتھ کیا کرتے تھے میں صرف ایک بندہ ہوں، میرے بارے میں اگر کہنا ہو تو اس طرح کہو کہ "اللہ کا بندہ اور اس کا پیغمبر"۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی ہر ممکن سعی فرمائی کہ اُمت اس انتہا پسند غلو و مبالغہ میں مبتلا نہ ہو جس میں سابقہ اُمتیں گرفتار ہوگئی تھیں، وہ اپنے انبیائے کرام کی اور دینی پیشواؤں کی تعظیم تقدیس کی حد تک کیا کرتی تھیں اور یہی تقدیس کا برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ روا رکھتی تھیں جو ان کی نظر میں خیر و صلاح میں ممتاز، علم و فضل میں یگانہ اور دعوت إلی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری وقت میں ارشاد فرمایا تھا:۔

قاتل اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔[2]	خدا یہود و نصاریٰ کو غارت کرے انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا

---

[1] صحیح بخاریؒ، کتاب الانبیاءؑ۔

[2] صحیح بخاری (باب دفن النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ۔)

حضرت عائشہؓ اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کی آخری ساعت آئی تو آپؐ نے اپنے چہرۂ مبارک پر ایک ہلکی چادر ڈال لی تھی مگر جب گھٹن محسوس ہوئی تو اس کو اٹھا دیا اور اسی حال میں فرمایا:-

لعنۃ اللہ علی الیھود والنصاریٰ	خدا یہود و نصاریٰ کو غارت کرے
اتخذوا قبور انبیائھم	انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو
مساجد (یحذّر ما صنعوا)[۱]	عبادت گاہ بنالیا ہے (آپ کا مقصد تھا کہ ان باتوں سے مسلمانوں کو روکیں جن میں امم سابقہ مبتلا ہو گئی تھیں)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ مرنے والوں پر نوحہ خوانی اور سینہ کوبی سے روکا کرتے تھے[۲]، اور آپ کا یہ عمل محض مسلمانوں کی تربیت کے لئے تھا تاکہ وہ عقیدۂ توحید میں ثابت قدم رہیں، اور عبادت صرف خدائے واحد کی ہو اور یہ عقیدہ عمل، قول اور حال سے مترشح ہو، آپؐ کی ان تعلیمات اور اس اندازِ تربیت و تعامل کا اثر اس وقت زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا جب آپ کی وفات ہوئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابۂ کرام کے لئے ساری مخلوقات میں سب سے زیادہ افضل اور محبوب تھے، آپ کی محبت ان کے دل و دماغ کے ریشہ ریشہ میں بسی ہوئی تھی،

---

[۱] صحیح بخاری، باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ۔ [۲] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز میں ہے کہ "النیاحۃ من امر الجاھلیۃ" (نوحہ خوانی، جاہلیت کی ایک رسم ہے۔)

اپنی جان و مال اور اولاد سے زیادہ ان کو آپؐ محبوب تھے، لیکن آپؐ کی وفات پر کسی نے بھی اس طرح کے غلو کا مظاہرہ نہیں کیا کہ تعظیم و محبت کو تقدیس کا درجہ دیتے، یہ بات کسی صحابۂ کرام کے بارے میں بھی ظاہر نہیں ہوئی جن میں سیدنا حضرت علی بن ابی طالب اور آپ کے دونوں صاحبزادگان حضرات حسنین رضی اللہ عنہما بھی تھے، لیکن اتنا احتیاط و طرزِ عمل صرف اس لئے تھا کہ اس عصر مبارک کے افراد عقیدۂ توحید میں پختہ تھے۔

اس کے برعکس ایرانی قوم جس کا ذہنی نشو و نما عقیدۂ امامت و معصومیت پر ہوا ہے اور جو اپنے رہنماؤں کے لئے تعظیم میں تقدیس کی حد تک غلو سے کام لیتی رہی ہے، یہ سب اس کے عقیدۂ امامت کا شاخسانہ ہے، اور ایران کی انتہا پسندانہ مبالغہ آرائی اور غلو کا نتیجہ ہے جو اس کو قدیم فارس کی زردشتی جاہلی عقائد سے میراث میں ملا ہے۔
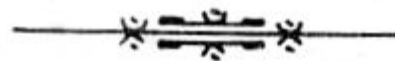
خلفائے اربعہ (۴)

(رضوان اللہ علیہم)

حیرت انگیز وحدتِ مزاج و وحدتِ منہاج

کتاب کا اختتام مُصنّف کے ایک قدیم مقالہ پر کیا جاتا ہے جو اس نے "خلیفۂ راشد امیر المؤمنین سیّدنا علی ابن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ" کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا، اور رسالہ "فاران" کراچی کے اپریل ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، سیّدنا علی (کرّم اللہ وجہہ) کی سیرت و سوانح کے سلسلہ میں اسلامی کتب خانہ اور تحقیق و تصنیف کی دنیا میں جو ایک محسوس کیا جانے والا خلا پایا جاتا ہے، اور اُس کو پُر کرنے کی جو ضرورت ہے، اُس کا ذکر کرنے کے بعد لکھا گیا تھا:

راقمِ سطور کے نزدیک خلافتِ راشدہ اور اس کے ارکانِ اربعہ کی یہ تعبیر صحیح نہیں کہ وہ چند مختلف المزاج، و مختلف الاغراض، متبائن الاسالیب اشخاص کے اتفاقی مجموعہ کا نام ہے، اور یہ چاروں حضرات چار مختلف سیاستوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں، بخت و اتفاق نے اُن کو ایک زنجیر (خلافت و قیادتِ اسلامی) میں جوڑ دیا ان میں سوائے ایمان و اخلاص اور صداقت اور حقّانیت کے کوئی مشترک عُنصر نہیں، جو لوگ زیادہ تاریخی بصیرت اور دقّتِ نظر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، وہ خلافتِ راشدہ کو دو حصوں اور خلفائے راشدین کو دو گروہوں پر تقسیم کرتے ہیں، خلافتِ راشدہ کے پہلے حصے یا دور کو

اسلام کی ترقی و پیش قدمی اور دوسرے دور کو اسلام کے تنزّل اور وقوف سے تعبیر کرتے ہیں، پہلے دور کا امام صدّیق اکبر اور فاروق اعظم (رضی اللہ عنہما) کو مانتے ہیں اور دوسرے دور کا امام عثمان غنی اور علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہما) کو کہتے ہیں، میرے نزدیک یہ تقسیم جسارت سے خالی نہیں، میرے نزدیک یہ چاروں حضرات فرداً فرداً خلافتِ نبوی کا مظہرِ اَتم اور مصداق کامل تھے، ذاتی فضائل و مناقب اور ان کی بنا پہ تفاوتِ درجات کو الگ کر کے خلافتِ راشدہ کا مزاج اور اس کی روح ان میں سے ہر ایک میں بدرجۂ اَتم پائی جاتی تھی، خلافتِ راشدہ کیا ہے؟ خلافتِ راشدہ نہ اسلامی مملکت کی وُسعت کا نام ہے، نہ کثرتِ فتوحات کا، نہ کامیابیوں کے تسلسل کا، اگر معیار یہی ہو تو پھر ولید بن عبدالملک اور ہارون الرشید کو سب سے بڑا خلیفۂ راشد ماننا پڑے گا، خلافتِ راشدہ نام ہے، نبی کے مزاج اور طرزِ زندگی میں نیابتِ کاملہ کا، نبوّت کا امتیازی مزاج کیا ہے؟ ایمان بالغیب کی قوّت، اطاعتِ الٰہی کا جذبۂ صادق و کامل، غیب پر شہود، احکام پر مصالح و فوائد کو قربان کرنا، دنیا پر آخرت اور غنا پر فقر و زُہد کو ترجیح دینا، اسبابِ دنیا سے کم سے کم متمتّع ہونا اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متمتّع کرنے کی کوشش کرنا، یہ وہ اجمال ہے جس کی تفصیل پوری سیرتِ محمّدی ہے اور جس کے مظاہر بدر و خندق کے معرکے، تبوک کا سفر، حُدیبیہ کی صُلح، مکّہ کی فتح اور ۲۳ برس کی وہ زاہدانہ زندگی ہے، جس کا اول شعبِ ابی طالب کی اسیری اور جس کا اخیر زندگی کی وہ آخری شب ہے جس میں گھر میں چراغ بھی نہ تھا، اور زرہِ نبوی تیس[۳۰] صاع جَو کے عوض میں ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔

اس معیار سے ان خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم وارضاہم) کی زندگی

اور دورِ خلافت، خلافتِ راشدہ کا مکمل نمونہ تھا، جس میں نبیؐ کے مزاج اور طرزِ زندگی کی پوری نمائندگی تھی، واقعۂ ارتداد میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بے نظیر صلابت و استقامت اور اس فتنۂ عالم آشوب میں مٹھی بھر جماعتِ صحابہ کے ساتھ پورے ملک عرب سے جنگ کرنے کا عزم اور فیصلہ، پھر عین اس نازک وقت میں جبکہ ایک ایک سپاہی جیش کا قائم مقام تھا، اور اسلام کا مرکزِ ثقل (مدینہ طیبہ) دشمنوں کے نرغہ میں تھا، جیشِ اسامہؓ کو شام کی جانب روانہ کر دینے اور منشاءِ نبوی کے تکمیل پر (حالات و تغیرات کا لحاظ کئے بغیر) اصرار، پھر مسلمانوں کی موت وحیات کی اسی فیصلہ کن گھڑی میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیوں (رومۃ الکبریٰ اور فارس اعظم) میں جنگ کا سلسلہ چھیڑ دینا، ایمان و اطاعت کا وہ واقعہ ہے جس کی نظیر صرف انبیاء اور اُن کے خلفائے اولوالعزم کی تاریخ میں مل سکتی ہے، اسی کے ساتھ زمانۂ خلافت و فتوحات میں ایسی زاہدانہ زندگی گزارنا جس میں بیت المال کے روزینہ سے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے اور بچوں کا منہ میٹھا کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی، اور پھر انتقال کے وقت اس پوری رقم کو جو زمانۂ خلافت میں (مسلمانوں کے فیصلے سے) بیت المال سے اپنی گزر اوقات کے لئے لی تھی، ذاتی زمین فروخت کر کے بیت المال کو واپس کر دینے اور اس پورے سامان کو جس کا خلافت کے دور میں اضافہ ہوا تھا، بیت المال میں منتقل کر دینے کی وصیت زُہد و ایثار کے ایسے واقعات ہیں جن کی نظیر شاید انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے علاوہ کہیں اور نہ مل سکے، اور جو اسی اصل کا "ظِلّ" ہے، جس کی خلافتِ اولیٰ کا شرف اُن کو حاصل تھا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا روم و شام کی جنگوں اور یرموکؓ قادسیہ کے

معرکوں میں افواج کی تعداد و اسلحہ کے بجائے اللہ کی فتح و نصرت اور اسلامی افواج کے اعمال و اخلاق اور تعلّق باللہ پر اعتماد، یرموک کے معرکہ کے موقع پر (جس سے سخت معرکہ تاریخ اسلام میں کم پیش آیا ہوگا) اسلام کے مظفّر و منصور قائد اور اسلامی افواج کے محبوب و معتمد سپہ سالار خالد بن الولیدؓ کو اسلامی افواج کی قیادتِ عُلیا سے معزول کر دینا، اور ابو عبیدہؓ جیسے نرم خُو و نرم مزاج کو قائد مقرر کرنا، عظیم ترین عُمّالِ حکومت کا بے لاگ احتساب، جبلہ بن الایہم جیسے سردارِ قوم اور بادشاہ پر ایک غریب فزاری کے مقابلہ و معاملہ میں قصاص جاری کرنا، ایسی ایمان و اطاعت کی مثالیں ہیں، جو نبوّت کا مزاج اور خلافتِ راشدہ کا تمغۂ امتیاز ہے، پھر اُن کا زُہد و احتیاط جس نے عام الرّمادہ (قحط عام) میں ان کو ہر ایسی غذا سے باز رکھا جو عام مسلمانوں اور ان کی وسیع مملکت کی عام آبادی کو میسّر نہیں تھی، یہاں تک کہ لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اس قحط نے طول کھینچا تو وہ بچ نہیں سکیں گے، اور ان کی زاہدانہ زندگی اور تقشّف جس نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اسی زاہدانہ زندگی کا پرتو ہے، جس کی اصل و ظِلّ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خلیفۂ (اوّل) کی نیابت اُن کے حصّہ میں آئی تھی۔

اسی طرح وہ ثبات و استقامت اور وہ عزم و یقین جس کا اظہار حضرت عثمانؓ نے بلوائیوں کی شورش اور ترکِ خلافت کے مقابلہ کے موقع پر کیا، اور بالآخر مظلومانہ شہادت پائی، پھر اسبابِ غنا کی فراوانی و موجودگی میں اپنی ذاتی زندگی میں اس زُہد و ایثار کا اظہار جو اُن کے تین نامور پیشروؤں کی میراث تھی، حکومت کے مہمانوں اور عام مسلمانوں کو امیرانہ اور پُر تکلف کھانا کھلانا اور خود گھر میں جا کر

زیتون کے تیل سے روٹی کھانا وہ صحیح خلافت ہے، جس کی خلعت رسول اللہؐ نے ان کو پہنائی اور جس کے اُتارنے سے انھوں نے صاف انکار کر دیا، خلافتِ نبوّت کا یہی مزاج اور زندگی کا یہی انداز اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی اور ابنِ عمّ رسولؐ کی زندگی میں پورے طور پر نمایاں و روشن ہے، اس طلائے خالص اور اس جوہرِ اصلی پر جمل اور صفّین کی جنگوں کا جو عارضی غبار پڑ گیا ہے، اس کو اگر آپ ہٹا دیں تو اس گوہرِ آبدار کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرے، اور خلافتِ نبوّت کے وہ تمام خصائص نظر آجائیں جو اس کے تین پیشروؤں اور زندگی کے رفیقوں میں مشترک ہیں، حکم اور اصول پر مصلحت و سیاست کو قربان کرنا، خلافت کے بقا و استحکام کے لئے ان تمام طریقوں اور تدبیروں کے اختیار کرنے سے انکار کر دینا جو اہلِ حکومت اختیار کرتے ہیں، لیکن خلافتِ نبوّت کے امین کے لئے ان کی گنجائش نہیں، عُمّالِ حکومت اور ارکینِ مملکت میں سے ایسے اصحاب کو اُن کے عہدوں سے سبکدوش کر دینے میں تامّل نہ کرنا جو اس کی نظر میں وَرع و تقویٰ کے اس بلند معیار پر نہیں جس پر رسولؐ اور اس کے خلفاء چھوڑ کر گئے ہیں، اور جو اس نظامِ خلافت کے شایانِ شان ہے، اصول و عقیدہ کی خاطر اور خلافت کو "منہاجِ نبوّت" پر باقی رکھنے کے لئے ان تمام ناخوشگوار فرائض کو انجام دینا جو اس کے لئے سوہانِ روح تھے، لیکن عقیدہ اور مومن کے یقین کا تقاضا اور وقت کا مقابلہ تھا، خلافت کی پوری مدّت کو ایک مسلسل مجاہدہ، ایک مسلسل کشمکش، ایک مسلسل سفر میں گزارنا لیکن نہ تھکنا نہ مایوس ہونا، نہ بددل ہونا، نہ شکایت کرنا، نہ راحت کی طلب، نہ محنت کا شکوہ، نہ دوستوں کا گلہ، نہ دشمنوں کی بدگوئی، مدح و ذم سے بے پروا، جان سے بے پروا، انجام سے بے پروا، نہ ماضی کا غم،

نہ مستقبل کا اندیشہ، فرض کا ایک احساسِ مسلسل اور سعی کا ایک سلسلۂ غیر منقطع، دریا کا سا صبر، سورج اور چاند کی سی پابندی، ہواؤں اور بادلوں کی سی فرض شناسی معلوم ہوتا ہے جس طرح ذوالفقار ان کے ہاتھ میں سرگرم و بے زبان ہے، اسی طرح وہ کسی اور ہستی کے دستِ قدرت میں سرگرمِ عمل اور شکوہ و شکایت سے ناآشنا ہیں، ایمان و اطاعت کا وہ مقام ہے جو "صدیقین" کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا پہچاننا اور ان نزاکتوں اور مشکلات سے واقف ہونا بڑے صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق کا کام ہے، اس لئے ان کی زندگی اور اُن کی عظیم شخصیت کا پہچاننا ایک بڑا امتحان ہے، اور اہلِ سنّت کا ایک امتیاز ہے، اس ایمان بالغیب اور اس جذبۂ اطاعت کا ظہور جس ماحول اور جس ناخوشگوار واقعات کی شکل میں ہوا، وہ اس ماحول اور ان واقعات سے بہت مختلف تھے، جن میں اُن کے پیشرو خلفاء کے ایمان بالغیب اور جذبۂ اطاعت کا اظہار ہوا تھا، اس لئے بہت سے مؤرّخین اور اہلِ قلم اور مدّعیانِ فکر و نظر بھی اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، وہ جس کو داخلی فتنے اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کہتے ہیں، ہم ان میں حضرت علیؓ کو نہ صرف معذور بلکہ ماجور پاتے ہیں، ہم اگرچہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ فریقِ مقابل (اہلِ شام) ایک اجتہادی غلطی کا مرتکب تھا، اس لئے اس کی تضلیل و تفسیق ہرگز درست نہیں لیکن ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں جو کچھ کیا وہ ایمان و اطاعت کے جذبہ، اور ادائے فرض کی روح کے ساتھ کیا اس لئے یہ عمل ان کے لئے تقرّب و رفعِ درجات کا باعث تھا۔

پھر اُن کی زاہدانہ زندگی خلافتِ نبوّت کا پرتوِ کامل اور خلافتِ صدّیقی وخلافتِ فاروقی کا نور تھی، یہ فقر و زُہد، تقشّف و قناعت کی ایسی زندگی تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے زُہّاد اس میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے، اور بالآخر اُن کے منتخب عُمّالِ حکومت اور اُن کے قریب ترین عزیز بلکہ حقیقی بھائی عقیل بن ابی طالب بھی اُن کا ساتھ نہ دے سکے۔

درحقیقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام میں جو ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرۃ پیدا کیا ہے، اس نے اُن کے ذہن و دل، سیرت واخلاق، زندگی اور کردار اور معیشت وسیاست کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا، عُسر و یُسر، کامیابی وناکامی، فقروفاقہ، اور امارت وحکومت میں اسی کا بے تکلف اظہار ہوتا تھا، اس ایمان کے سلسلۂ معجزات کی سب سے طاقتور اور سب سے نمایاں وممتاز کڑیاں خلفائے راشدین ہیں، وہ اسی معنیٰ میں خلفائے راشدین ہیں کہ نبوّت کا یہ مزاج اور نبیؐ کی یہ میراث ان کی طرف منتقل ہوئی اور انھوں نے اس مزاج ومنہاج میں نبیؐ کی کامل نیابت کی، تاہم یہ سمجھے کہ یہ بھی کسی بادشاہِ وقت یا حاکم شہر کی نیابت کا مسئلہ ہے اور سوال ان فوائد سے کسی شخص اور اس کے خاندان اور متعلّقین کے مُتمتّع ومنتفع ہونے کا ہے جو اس کی مسند پر بیٹھے گا، اور ساری کشمکش اسی بات کی تھی، حالانکہ سوال نبیؐ کے فرائض انجام دینے اور اس کی سی زُہد وتقشّف اور ایثار وقربانی کی زندگی گزارنے، خلقِ خدا کو زیادہ سے زیادہ دینے اور حظوظِ دنیا اور سامانِ معیشت میں سے کم سے کم لینے، زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور کم سے کم راحت وفراغت حاصل کرنے کا سوال تھا، اور اس میں کیا شبہ ہے کہ خلفائے راشدین

نے یکے بعد دیگرے اس حق کو ادا کرکے دکھایا، نبوت خلافتِ الٰہی ہے، اور خلافتِ راشدہ خلافتِ نبوی ہے، اخلاق و صفاتِ الٰہی میں بڑا درجہ "صمدیت" کا ہے، اور خدا کی شان "یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ" کی ہے، انسان اس مقام تک تو کیا پہنچ سکتا ہے، اس کی معراج یہی ہے کہ وہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فیض پہنچائے، اور ان سے کم سے کم فیض اٹھائے، جہاں تک "یُطْعِمُ" (دوسروں کو کھلانے کا) تعلق ہے، اس کا ہاتھ کشادہ، اس کی ہمت بلند اور جہاں تک "یُطْعَمُ" (دوسروں کا کھانے) کا تعلق ہے، اس کا ہاتھ کشیدہ اور اس کی نظر بلند رہے ؎

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفی

کہ حاتم دگران و گدائے خویشتن است

میرے نزدیک اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار و مراحل کی نمائندگی خلافتِ راشدہ کے اس مختصر سے دور میں (جو ۳۰ سال سے متجاوز نہیں) کردی گئی ہے، اور ہر آنے والے ناگزیر دور کے لئے اس میں رہنمائی کا سامان ہے، آغازِ کار اور اقبال و ترقی کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہیئے، اس کی رہنمائی ہم کو ابوبکر صدیقؓ کی حیاتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ سے حاصل ہوتی ہے، عروج و شباب اور امن و نظام کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہیئے، اس کی رہنمائی ہم کو فاروق اعظمؓ کے دورِ خلافت سے ملتی ہے، مخالفتوں، شورشوں اور فتنوں اور بے نظمی اور انتشار کے وقت کس ثبات و استقامت، کس پامردی اور دلیری اور کس ایمان و یقین کی ضرورت ہے، اس کا نمونہ ہم کو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی زندگی میں ملتا ہے، اگر اسلامی تاریخ کے

ذخیرہ میں صرف خلافتِ راشدہ کے ۲ دو باب (جو دراصل ایک ہی باب کی ۲ دو فصلیں ہیں) اور صرف خلافتِ صدّیقی اور خلافتِ فاروقی کا نمونہ ہوتو یہ رہنمائی ناتمام ہوتی، اور دورِ انتشار اور دورِ فِتَن کے لئے مسلمانوں کے پاس تقلید واتّباع کے لئے کوئی امام اور پیشوا نہ ہوتا، جس اُمّت کے لئے قیامت تک باقی رہنے اور تمام انسانی ادوار اور تاریخ کے نشیب وفراز سے گزرنا مقدّر تھا، اس کے لئے دونوں طرح کے نمونوں کی ضرورت تھی، اور خلافتِ راشدہ نے اپنے پورے اجزاء کے ساتھ اُن نمونوں کو فراہم اور اس رہنمائی کو مکمل کردیا، رضی اللہ تعالیٰ عن ابی بکر وعمر وعثمان وعلی وارضاھم واکرمھم وجزاھم عن الاسلام وعن ھٰذہ الأمۃ خیر الجزاء۔

INDEX

انڈکس

(اشاریہ)

"المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ"

AL-MURTAZA

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

الف

اقوام وطبقات

کتابیات

(ت)

(ن)

(و)

مقامات

منتفرقات

ادارے ومطابع :

غزوات و جنگیں اور فتوحات:

اہم واقعات وحوادث:

نظریات، عقائد وتحریکات:

معاشرہ و تہذیب و سوسائٹی:

دیگر متفرقات:

المراجع الأجنبية

BIBLIOGRAPHY
(ENGLISH)

1. Amir Ali, Syed, (I) *Spirit of Islam*, London, 1922;
(II) *A Short History of the Saracens*, London, 1955.
2. Arnold, T. W., *The Preaching of Islam*, London, 1935.
3. *Cambridge History of Iran*, Cambridge University Press, 1983.
4. Christensen, Arthur, *L'Iran Sous Les Sassanides*, Paris, 1936.
5. Draper, John William, *Conflict Between Religion & Science*, London, 1910.
6. *Encyclopaedia, Britannica* Xv Ed., 1985.
7. Gibb, H. A. R. & J. H. Kramer, *Shorter Encyclopaedia of Islam*, Leiden, 1953.
8. Hitti, Dr. Phillip, K., *History of the Arabs*, London, 1953.
9. Huges, Thomas Patrick, *Dictionary of Islam*, London, 1885.
10. Hunter, W. W., *The Indian Musulmans*, London, 1876.
11. *Jewish Encyclopedia*, 1916.
12. Mohiuddin, Ahmad, Syed *Saiyid Ahmad Shahid*, Lucknow, 1975.
13. Muir, Sir William, *Annals of the Early Caliphate*, London, 1882.
14. O'Mally, L. S. S., *Popular Hinduism, The Religion of the Masses*, Cambridge, 1935.
15. Vernon Mc Casland and others, *Religions of the World*, Newyork, 1969.
16. Vaidya, C. V., *History of Mediaeval Hindu India*, Poona, 1924.